ہندستانی

ہندستانی اکیڈمی کا تماہی رسالہ

سنہ ۱۹۳۶ء

ہندستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

سالانہ چندہ پانچ روپیہ

ہندستانی سنہ ۱۹۳۶ع

ایڈیٹر : اصغر حسین ' اصغر

مجلس مدیران

۱—ڈاکٹر تارا چند ' ایم - اے ' ڈی - فل - (صدر) -

۲—پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' ایم - اے ' پی ایچ - ڈی '
صدر شعبۂ عربی و فارسی ' الہ آباد یونیورسٹی -

۳—مولوی سید مسعود حسن رضوی ' ادیب ' ایم - اے '
صدر شعبۂ فارسی و اُردو ' لکھنؤ یونیورسٹی -

۴—منشی دیا نراین نگم ' بی - اے -

۵—مولوی اصغر حسین' اصغر (سکریٹری) -

فہرست مضامین

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۶ | جنوری سنہ ۱۹۳۶ع | حصہ ۱

خطبۂ صدارت[۱]

(از سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا)

حضرات!

میں ہندوستانی اکیڈمی کے اراکین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی اور شعبۂ اردو کے اجلاس کی صدارت کی عزت مجھے بخشی - پہلے سال بھی آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا - مگر میں شریک جلسہ نہ ہو سکا - اور مجھے اپنی محرومی کا افسوس رہا - اس لئے اس مرتبہ باوجودے کہ بعض موانع در پیش تھے - میں نے حاضر ہونا ضروری سمجھا - اور مجھے نہایت مسرت ہے کہ میں ایک ایسی تحریک میں حصہ لے رہا ہوں جس سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے - میرے خیال میں ہندوستانی زبان گذشتہ زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی بہترین یادگار اور اُن کے بڑوں کا بہترین ترکہ ہے - یہ زبان ہماری سب سے بڑی میراث ہے - اور اس کا خزانۂ ادب ہماری مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے - آپ نے اچھا کیا کہ اس میراث پر ملکیت کا لیبل لگاتے

[۱] ---گذشتہ کانفرنس کے موقع پر شعبۂ اردو کی جانب سے سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا نے یہ خطبۂ صدارت پڑھا تھا - اس کے بعد ایک مدت تک کانفرنس ملتوی رہی - اب جنوری سنہ ۳۶ء میں کہ از سر نو کانفرنس منعقد ہوئی' یہ مناسب معلوم ہوا کہ جہاں اور خطبہاے صدارت شایع ہو رہے ہیں یہ خطبہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے - [اڈیٹر]

وقت لفظ " ہندستانی " کو لفظ " اردو " پر ترجیح دی - کیونکہ اصل حالات سے نا واقفیت کے سبب اس "میراث کے بعض حصہ دار اگر خزانے کے کسی صندوق پر لفظ " ہندی " لکھا ہوا دیکھتے تو اسے ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مال ہمارا نہیں - اور بعض لفظ " اردو " صندوق کے باہر دیکھ کر اس سے پرے بھاگتے تھے - یہ سمجھ کر کہ یہ مال بدیسی ہے - حالانکہ دونوں قسم کے صندوقوں میں ایک ہی ملک کا مال تھا - جب کبھی یہ صندوق کھلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ بکس میں کچھ مال خالص ہندستانی ہے اور کچھ ایسا ہے جسے کسی زمانے میں عرب اور ایران کے سوداگر اس ملک میں لائے تھے - مگر ہمارے ملک نے اسے خرید کر اپنا بنا لیا تھا - اور پھر اسی نمونے کا مال اپنے یہاں سیکڑوں برس تیار ہوتا رہا - اسی طرح ہندی والے بکس میں بھی دونوں قسم کی چیزیں ملتی تھیں - البتہ اس میں پرانا اور ٹھیٹ ہندستانی مال زیادہ ہوتا تھا - ایک چیز دونوں قسم کے بکسوں میں موجود تھی - یعنی انگریزی مال - یہ مال تھا تو بدیسی - لیکن کہیں کہیں اس پر کاری گری سے دیسی مہر لگا دی گئی تھی اور کہیں مہر لگانے کی بھی تکلیف نہیں کی گئی تھی - مگر ہوشیاری سے وہ مال ملکی مال میں ملا دیا تھا - اہل ملک کے دلوں میں اپنی اس میراث کے متعلق جو جدائگی کا میلان پیدا ہو گیا تھا - اس میں یہ عجیب مزے کی بات تھی کہ نئے بدیسی مال سے جو دونوں قسم کے بکسوں میں مل گیا تھا کوئی نہیں گھبراتا تھا - اور جب ضرورت ہوتی جس بکس سے وہ مال مل جاتا لے لیا جاتا تھا مگر اپنے پہلے مال کی اصلیت کی پہچان نہیں رہی تھی - اس مغائرت نے رفتہ رفتہ ہندی اردو کے جھگڑے کی صورت اختیار کی - اور میراث کے حصہ داروں میں خوب لڑائی رہی

میراث کے بانٹنے پر نہیں - جیسا کہ بھائیوں میں اکثر جھگڑا ہو جاتا ہے - بلکہ میراث کے لینے پر - اردو والے ' ہندی والوں کو کہتے تھے کہ ہمارا بکس آپ ہی کا ہے - آپ اسے بھی کام میں لائیں - تو ہندی والے کہتے تھے کہ ہمارا بکس وہ الگ دھرا ہے - ہمیں تمہارے بکس سے سروکار نہیں - اُدھر اُردو والوں کو جب کبھی ہندی والے کہتے یہ مال اصل ہندی ہے تم بھی مادر ہند کی اولاد ہو - اگر ضرورت ہو تو اسے برتو - تو وہ کہتے کہ یہ دقیانوسی مال ہے- اب فیشن بدل گیا - ہم تمہارے بکس میں سے کچھ نہ لیں گے - جب یہ نا گوار جھگڑا اٹھا تو میں نو عمر تھا - مجھے اُس زمانے میں آپ کے صوبے میں آنے کا اتفاق ہوا - معلوم نہیں کیوں مجھے ہندستان کے اس حصے سے جسے صوبہ جات متحدہ کہتے ہیں بچپن سے ایک خاص اُنس رہا ہے - شاید اس لیے کہ یہ ہماری پرانی ہندستانی تہذیب کا مرکز ہے - یا اس لیے کہ یہ وہ سر زمین ہے جسے ہماری ہندستانی زبان کی پاک اور صاف ندی آج تک سیراب کر رہی ہے - مجھے اس جھگڑے کو دیکھ کر بہت عبرت ہوئی - مغائرت کو دور کرنے کا ایک علاج تو یہ سمجھ میں آیا کہ جیسے اس زبان کی نشو و نما میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر کام کیا اسی طرح پھر دونوں کو اس کام میں لگانا چاہیے - اُس وقت یہ حالت تھی کہ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اردو اچھی طرح بولنا اور لکھنا انھی کا حصہ ہے اس تنگ خیالی نے اُن ہندو مصنفین اور مولفین کو بھی اردو کی طرف سے بے دل اور بے پروا کردیا تھا ' جنھوں نے اپنی عمریں اس کی خدمت میں صرف کی تھیں - میں نے اُس زمانے میں اردو کا ماہوار رسالہ مخزن جاری کیا اور اسی میں ہندو اور مسلمان یاران نکتہ داں کو صلاے علم دی کہ آؤ مل کر اردو کی خدمت کریں - خدا کی مہربانی سے دونو نے دل سے توجہ

کی - آپ کی مجلس کے ایک معزز رکن منشی دیا نرائن صاحب نگم - بی - اے ایڈیٹر زمانہ اُن دوستوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اس اہم مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا - انھوں نے ہندستانی زبان کی نمایاں خدمت کی اور اب تک کر رہے ہیں - اسی ضمن میں یہ کوشش کی گئی کہ انگریزی پڑھے ہوئے اور یونیورسٹی کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جو کسی دیسی زبان میں کتابیں یا مضامین لکھنا یا ان کو پڑھنا اپنے درجے سے گری ہوئی بات سمجھتے تھے اپنی زبان کی طرف مائل ہوں - اس کوشش میں بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی - چنانچہ اب ان بیشمار رسالوں میں جو اردو اور ہندی میں شائع ہوتے ہیں اچھے اچھے انگریزی داں اپنی نئی معلومات سے زبان کو مالا مال کر رہے ہیں اور اس میں جدید محاورات اور نئے اسلوب بیان داخل کر رہے ہیں - صوبہ جات متحدہ میں زمانہ کے علاوہ بہت سے رسالے ایسے نکلے جن میں ہندو مسلمان اہل قلم نے مل کر ہندستانی زبان کو فروغ دیا - اسی حصہ ملک کے ان رسالوں میں جو اب موجود نہیں - ادیب خاص طور پر قابل ذکر ہے - اور جو اس وقت مصروف خدمت ہیں ان میں رسالہ چاند خصوصیت سے یاد کئے جانے کا مستحق ہے - دونو قوموں کے اہل قلم کو ایک مشترک پلیٹ فارم پر لانے کے سلسلے میں ایک اور تجویز میرے خیال میں آئی تھی جس کا اعلان میں نے آج سے بائیس تئیس برس پہلے سنہ ۱۹۰۸ع میں کیا تھا - وہ یہ تھی کہ ایک جماعت ہندو مسلمان اہل علم کی قائم ہو جس کا نام میں نے " اردو سبھا " تجویز کیا تھا جس کے مقاصد میں وہ مقاصد بھی شامل تھے جو آپ کی اکیڈمی کے پیش نظر ہیں - اُس تجویز میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ سبھا ہندستان میں ہماری زبان کا معیار بلند کرنے اور

اس کے علم ادب کی ترقی کے لئے وہی کام کرے گی جو فرانس کی مشہور اکیڈمی اپنے ملک کے لیے کر رہی ہے -! اس مجوزہ نام میں " سبھا " کا لفظ زیادہ تر اسی رعایت سے رکھا گیا تھا کہ نام میں بھی فارسی اور ہندی دونو ماخذ کے الفاظ موجود ہیں افسوس کہ وہ تجویز اُس وقت عملی جامہ نہ پہن سکی اور صرف صفحۂ کاغذ پر رہ گئی - اب بھی اُس قسم کی ایک جماعت کی جو ملک کے ہر حصہ کے ماہران ہندستانی کی نمائندہ ہو ضرورت ہے -

اس وقت تو سیاسی تحریکیں بہت جاذب توجہ ہیں مگر جب فضا موافق ہو جائے تو امید ہے کہ ملک اس تجویز کو عملی شکل دینے کی ضرورت محسوس کرے گا - کیونکہ زبان کا ایک ہونا متحدہ قومیت کی بنیاد ہے - آپ کی اکیڈمی سب سے پہلی جماعت ہے جس نے اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے ' جس کا احساس ملک میں اتنی مدت پہلے سے موجود تھا - جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ اکیڈمی سنہ ۱۹۲۷ ع میں صوبہ جات متحدہ کی لیجسلیٹو کونسل کی تحریک پر گورنمنٹ کی سر پرستی سے قائم ہوئی - اس کے نام زد شدہ اراکین میں اردو اور ہندی کے بڑے بلند پایہ علما اور اہل قلم شامل ہیں - جن میں سے اکثر ایسے صاحبان ہیں جنہوں نے اپنی زبان کی بیش بہا خدمات کی ہیں - آپ کو ابتدائے کار میں گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل ہونے سے بڑی مدد ملی ہے - روپئے کے بغیر کوئی کام چل نہیں سکتا - اور گورنمنٹ کے عطائے نے آپ کو روپئے اکٹھے کرنے کی فکر سے آزاد کر دیا ' آپ کو پہلے پچیس ہزار روپیہ سالانہ ملا اور اس کے بعد پچاس ہزار روپیہ سے زائد ہو گیا - گو اس زمانے میں جب گورنمنٹ بھی باقی اہل ہند کی طرح افلاس کی شاکی ہے - یہ کہنا برمحل نہیں کہ اُس

امداد میں جو اکیڈمی کو گورنمنٹ سے ملتی ہے اضافہ کیا جائے مگر پھر بھی میرا فرض ہے کہ میں آپ حضرات کو اور آپ کے ذریعے گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ اور خصوصاً آپ کے بیدار مغز گورنر ہز اکسلنسی سر میلکم هیلی کو جن کی علم دوستی اور هنر پروری مشہور زمانہ ہے - توجہ دلاؤں کہ یہ کام نہایت فیاضانہ امداد کا مستحق ہے - آج نہیں کل سہی - جب روپیہ میسر ہو اس کو بیش قرار مدد دے کر هندستانی زبان کے مستقبل کو روشن سے روشن تر بنا دینا چاهئیے - جس حاکم کے سر اس احسان کا سہرا ہوگا - وہ تاریخ میں هندستان کا ایک بڑا محسن اور هماری متحدہ قومیت کا اصلی معاون سمجھا جائے گا -

جب اردو هندی کا جھگڑا اٹھا تو زیادہ لڑائی اس پر تھی کہ رسم خط کیا ہو - یہ سب مانتے تھے کہ صوبہ جات متحدہ میں زبان عملاً ایک ہے - مگر رسم خط دو ہیں ایک اردو ایک هندی - دونوں مروج تھے - فیصلہ یہ ہوا کہ دونو رہیں - جسے جو پسند ہو سیکھے - سرکاری عدالتوں میں کاغذات دونو حروف میں لکھے جائیں - تاکہ اردو والا بھی انہیں پڑھ سکے اور هندی والا بھی - ملازمتوں کے طلبگار بھی دونو حروف سے آشنا ہوں - گویا هندوستانی زبان ایک ندی ہے جس کی دو شاخیں ہیں جو اس وقت سے ساتھ ساتھ بہہ رہی ہیں - تیسری ایک چھوٹی سی شاخ انگریزی زبان کی ہے جو بظاہر تو ساتھ چلتی نظر نہیں آتی مگر اسکا پانی روز افزوں مقدار میں دونوں شاخوں میں مل رہا ہے - یہ ایک علمی تربینی اسی طرح رواں ہے - جس طرح ایک جغرافی تربینی شہر الہ آباد کے قریب بہتی ہے - خدا بھلا کرے آپ کے سابق گورنر

ولیم میورس اور انکے وزرا کا اور خاص کر رائے راجیشور بلی صاحب کا
جو انکے عہد میں وزیر تعلیم تھے - کہ انہوں نے اس اکیڈمی کے ذریعہ
ان تینوں شاخوں کے باھمی ملاپ اور انکے ذریعے ملکی زبان کے سیرابی
کی صورت پیدا کردی ھے - جیسا کہ میرے معزز دوست انریبل سر ڈاکٹر
محمد سلیمان صاحب نے سنہ ۱۹۳۱ع کے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا
تھا - رسم خط کا معاملہ ایسا نہیں جسکی بظاہر زبان کی ترقی رکی رھے -
سر دست هر کسی کو آزادی ھے کہ جو حروف چاھے استعمال کرے - آگے
چل کر ممکن ھے کوئی متفقہ قرار داد ھو سکے ' جو اس پر مبنی ھو کہ
کون سے حروف عملی طور پر زیادہ کار آمد ھیں - یا جیسا کہ ڈاکٹر سر
محمد سلیمان نے خطبۂ مذکورہ بالا میں کہا تھا کہ ممکن ھے کہ کوئی
اور حروف جو دیگر مہذب اقوام دنیا کے ساتھ باھمی کارو بار اور تعلقات
کے لئے معینہ ھوں - مشترکہ طور پر پسند کر لئے جائیں -

زبان کی ترقی کی کوشش جن اصولوں پر ھندوستانی اکیڈمی
نے شروع کی ھے وہ صحیح ھیں - البتہ ضرورت اس امر کی ھے کہ رفتہ
رفتہ یہ جماعت ایک نیم سرکاری جماعت ھونے کے بجائے ھندستانی
زبان کے لکھنے پڑھنے والوں کی قائم مقام بن جائے - گورنمنٹ سے جو
مالی امداد ملے حاصل کرتی رھے - اور خود بھی مزید ترقی کے لئے اهل
ملک سے امداد حاصل کرے اور خود ایک صوبہ کی انجمن ھونے کے بجائے
سارے ملک کی طرف سے ھندستانی زبان کی ترقی کی کفیل ھو -
اگر اس قسم کی توسیع ممکن ھے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیوں
نہ ھو - تو یہ ایکڈمی هر لحاظ سے اصلاح زبان کی مرکزی جماعت
بننے کی مستحق ھے - لیکن اگر یہ نہ ھو سکے تو سارے ملک کے لئے
اسی قسم کی ایک جماعت مگر اس سے بڑی جماعت بنانی ھوگی جس

میں اسکے ارکان بھی شامل ہیں اور دیگر اہل قلم بھی - اس صورت میں بھی یہ اکیڈمی بجائے خود ضروری ہوگی اور اس مفید کام کے جاری کرنے کی اولیت کا سہرا اسی کے سر رہے گا - اور اسی نمونے کی جماعتیں ہر صوبے میں قائم کرنی ہوں گی -

اس اکیڈمی کی خوش قسمتی ہے کہ اسکی صدارت ہمارے واجب تعظیم دوست سر تیج بہادر سپرو جیسے باکمال ادیب کو دی گئی ہے - اور ڈاکٹر تارا چند صاحب جیسے قابل اور سر گرم حامئی زبان اس کے سکریٹری ہیں - سر تیج بہادر کئی صفات کے جامع ہیں - اور کامیابی کے بیشمار درجے طے کر چکے ہیں - مگر اس جماعت کی کامیابی کے لئے جن اوصاف کی ضرورت تھی وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں - یعنی صحیح ادبی مذاق اور مہارت فن کے ساتھ وسعت خیال اور صاف جوئی - اردو ہندی کو سمو کر ہندستانی بنانے کے لئے ایسا ہی شخص درکار تھا - ہمارے دوسرے کرم فرما آنریبل شاہ سر محمد سلیمان صاحب جن کے عہدۂ چیف جسٹسی پر سرفراز ہونے کی خبر کا ہندوستان کے ہر ایک طبقے میں خوشی سے خیر مقدم کیا گیا ہے - اس اکیڈمی سے نہایت گہری دلچسپی رکھتے ہیں - وہ بھی اسی خوبی میں ممتاز ہیں کہ وہ ہندو مسلمانوں میں باہم یگانگت اور ہندی اردو میں موافقت پیدا کرنے اور قایم رکھنے کے خواہاں ہیں - دیگر علما اور ادیب جو آپ کی ادارت سے یا کونسل سے تعلق رکھتے ہیں سب اس مقصد کی اہمیت سے آگاہ ہیں - اور اسی لئے اس اکیڈمی نے چار پانچ سال کے قلیل عرصے میں یہ دکھا دیا ہے کہ ہماری زبان کس قدر جلد ترقی کرسکتی ہے - جو مضامین اکیڈمی کے جلسوں میں پڑھے گئے ہیں ان میں سے بعض اکیڈمی کے سہ ماہی رسالہ میں شائع

ہوئے ہیں - اُن مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کیا ہندو کیا مسلمان اس خیال کو سامنے رکھکر لکھ رہے ہیں کہ دونوں قومیں انہیں پڑھیں گی اور ان کا رنگ ایسا رہے کہ کسی تحریر سے کسی کا دل نہ دکھے - بلکہ ان کے پڑھنے سے یہ ذہن نشین ہو کہ باہمی محبت بام ترقی پر پہنچنے کا زینہ ہے -

آپ کے رسالے کا ذکر آگیا - اس کا نام بھی آپ نے ہندستانی رکھا ہے جو بالکل موزوں ہے - میں رسالہ کے اڈیٹر صاحب کو اور انکے ساتھیوں کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں - اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ ملک میں لٹریچر کا صحیح مذاق پھیلانے کا باعث ہوگا اور ملک کی ادبیات میں مفید اضافہ کرے گا - یہ رسالہ تین مہینے میں ایک دفعہ چھپتا ہے - اسکی ہر ایک اشاعت میں یہ بحث میں نے دیکھی کہ اس کے سر ورق پر جو لفظ " تماہی " لکھا ہوتا ہے - یہ درست ہے یا نہیں مجھے پہلے تو اس پر تعجب ہوا کہ لفظ سہ ماہی میں کیا برائی تھی کہ اس کی ضرورت پڑی کہ اس کی جگہ تماہی لکھا جائے ' پھر اس پر تعجب ہوا کہ اگر ذمہ دار اصحاب نے کسی مصلحت سے بجائے سہ ماہی کے تماہی لکھنا پسند کیا یا تماہی کو زیادہ خوبصورت سمجھا تو اس سے زبان میں کیا خرابی آ چلی تھی کہ اس پر لے دے شروع ہوئی - جس کے جواب میں اڈیٹر صاحب کو " تہائی " اور " ترامہ " کے الفاظ پیش کرنے پڑے اور یہ بتانا پڑا کہ اردو ہندی دونوں رسالوں پر ایک ہی نام لکھنا مناسب سمجھا گیا - اس لئے تماہی پسند کیا گیا - میں نے اس اختلاف کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ میں بھی اس بحث میں شریک ہو جاؤں اور اپنی رائے ایک طرف یا دوسری طرف دوں - بلکہ میں نے اس لفظ کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے جس سے ایک

مفید سبق حاصل ہوتا ہے - جو خیال رسالے کے سر ورق پر لفظ تماہی لکھنے کا محرک ہوا میری دانست میں وہی خیال تھا جس نے مجھ کو انجمن اردو کی جگہہ اردو سبھا کی ترکیب پسند کرنے کی طرف مائل کیا تھا اور اسی لحاظ سے میں اس خیال کی قدر کر سکتا ہوں - لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ فارسی اور ہندی الفاظ کو باہم جوڑ کر کوئی خوبصورت لفظ بنتا ہو یا کسی مشکل لفظ کی جگہہ آسان لفظ ملتا ہو تو میں ایسے جوڑ کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تائید کروں گا - لیکن مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ جس چیز کے لئے اچھا بھلا سہل لفظ موجود ہو اور سب اسے آسانی سے سمجھتے ہوں اس کی جگہہ بھی تکلف سے ایک ہندی جوڑ ڈھونڈھا جائے -

میں اس بارے میں ارباب فن کے سامنے یہ اصول پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس دور اصلاحات میں جب زبان اور ادب اردو کی صلاح کی طرف لوگوں کی توجہ ہو اور ہندستانی اکیڈیمی یا انجمن ترقی اردو یا اور ایسی جماعتیں لفظی اصلاحات پر غور کریں تو ان دوامور کو ملحوظ رکھیں -

اول یہ کہ کہیں بھی ہندی لفظ کی جگہہ فارسی عربی لفظ یا فارسی عربی کی جگہہ ہندی لفظ اس شوق سے نہ داخل کریں کہ یہ ایک گروہ کو اچھا معلوم ہوگا یا دوسرے گروہ کو - بلکہ مذاق سلیم سے کام لے کر جو لفظ معانی کے لحاظ سے اسی خاص مفہوم کو بہتر ادا کرے جس کا ادا کرنا مقصود ہے اس کو پسند کیا جائے - البتہ بلحاظ آواز کسی لفظ کا کانوں پر جو اثر پڑتا ہو اسے نظر انداز نہ کریں -

دوم یہ کہ جو لفظ کثرت رواج سے عام فہم
ہو گیا ہو - اور جسے لوگ بے تکلف گفتگو میں
برتتے ہوں - اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ عربی فارسی
یا سنسکرت سے نہ گھسیٹا جائے -

جو کام آپ کی اکیڈیمی نے اپنے ذمے لیا ہے اس کی تکمیل کے لئے ایک عمدہ کتب خانے کی ضرورت تھی جس میں اردو اور ہندی کی موجودہ کتابوں کا پورا ذخیرہ ہو - مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ آپ نے اپنے لائحۂ عمل میں کتب خانے کو جگہ دی ہے اور ہر سال کتابوں کی تعداد بڑھانے کے لئے ایک رقم آپ اپنے تخمینہ میں مہیا کرتے ہیں - امید ہے کہ آپ جلد اس ضرورت کو پورا کر سکیں گے - کام کے اس حصے کا اہتمام جن اراکین کے سپرد ہے - ان کی اجازت سے ایک چھوٹا سا مشورہ اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں - مجھے معلوم نہیں کہ اب تک جو کتابیں جمع کی گئی ہیں اُن میں اُن موقت رسالوں کی جلدیں شامل ہیں یا نہیں جو ہندستانی زبان میں گذشتہ تیس چالیس سال میں جاری ہوئے - اُن میں سے بہت سے موجود ہیں اور بعض تھوڑے دن چلے اور بیٹھ گئے - میری رائے میں اُن سب رسالوں کو محفوظ رکھنا مفید ہو گا - اُن رسالوں میں جو چار دن اپنی بہار جانفزا دکھلا گئے - اور اُن میں بھی جو غنچوں کی طرح بن نکلے مرجھا گئے - بہت سے ادبی پھول اور کلیاں سدا بہار تھیں - اور اُن سے آج بھی کئی گلدستۂ ادب مرتب ہوسکتے ہیں - بشرطیکہ ہم انہیں کھو نہ بیٹھیں - ہماری زبان کی ترقی کا یہ دور جس سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں - وقتی اور ہنگامی ادبیات کا دور ہے - اُن میں سب چیزیں مستقل قدر و قیمت کی نہیں ہوتیں - مگر چیزیں

اس کثرت اور فراوانی سے شایع ہو رہی ہیں کہ کلچرل ادب کا دامن بھرنے کے لئے اُن کے چیدہ چیدہ حصے بھی کافی ہیں - اگر آپ کا کتب خانہ اس کا التزام کرے کہ ہر رسالہ جو اس صدی کے شروع سے اب تک شایع ہوا ہے - اسکے سب پرچے تلاش کرکے جمع کرلے تو نہ صرف تاریخ زبان ہندستانی کے آئندہ مورخ کے لئے کارآمد مواد موجود ہوجائے گا - بلکہ بہت سے ادبی جواہر جو اس احتیاط کے بغیر دنیا سے ناپید ہو جاتے آنے والے شائقین زبان کو دولت ادب سے مالا مال کریں گے - رسالوں کا مکمل مجموعہ بہم پہونچانے کے علاوہ اس کتب خانے کو یہ بھی لازم ہے کہ دوسرے صوبوں میں اور خصوصاً عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے دارالترجمہ میں جو کتابیں شایع ہو رہی ہیں اُن کو اپنے یہاں موجود رکھے - میرا خیال ہے کہ یہ کام اس وقت بھی ہو رہا ہے - مگر میںنے ضروری سمجھا کہ میں اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلاؤں -

کل جب میں یہاں پہونچا تو آپ کے سکریٹری صاحب نے پہلی بات جو مجھسے کی یہ تھی کہ جو پروگرام ہندستانی اکیڈمی نے اپنے سامنے رکھا ہے اسکی بابت میں اپنی رائے ظاہر کروں اور اگر کوئی بات اس میں بڑھانے کی ہو تو پیش کروں اُن کے ساتھ اس وقت جناب سید محمد ضامن علی ایم - اے - اور مولوی اصغر حسین صاحب اصغر تھے - ان کی بھی یہی فرمایش تھی - اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ آپ کی اکیڈیمی کے اِن سرگرم کارکنوں کو کس قدر شغف اس کام سے ہے - میںنے اُن سے کہا کہ میں بہ حیثیت مجموعی آپ کے پروگرام کو ایسا پاتا ہوں جس میں زبان کی ترقی کے ہر پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے - مگر جس کسی تجویز کے متعلق کوئی بات قابل گزارش ہو گی وہ میں عرض کردوں گا - اور اسی خیال سے جو چند باتیں میںنے کہی ہیں کہلی

ضروری سمجھیں ورنہ اُن میں کوئی بات نئی نہیں - سب سے بڑا کام جو آپ نے اپنے ذمے لیا ہے وہ اردو اور ہندی زبان میں عمدہ اور مفید تصنیفات اور تالیفات کا مہیا کرنا ہے - ترجموں کے متعلق آپ کی اس تجویز سے مجھے اتفاق ہے کہ یورپ کے اُن نئے علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے ہماری زبان میں کئے جائیں جنہوں نے یورپ کو اس زمانے میں اوج ترقی پر پہونچا دیا ہے - سائنس اور اقتصادیات کی مستند کتابوں کے نہ صرف ترجمے درکار ہیں بلکہ عام فہم خلاصے زیادہ مفید ہوں گے - اسکے بعد انہیں مضامین پر مستقل طبعزاد تصانیف کی نوبت آئے گی - خصوصاً اقتصادی علوم میں - ہمارے یہاں ان کا چرچا شروع تو ہوا ہے - اور اکثر کالجوں میں بہت سے طلبہ یہ مضمون پڑھتے بھی ہیں اور استاد پڑھاتے بھی ہیں - مگر نقص یہ ہے کہ جو کتابیں انگلستان میں لکھی گئی ہیں انہیں وہاں کے اقتصادی حالات سے مناسبت ہے اور ہمارے یہاں کے پڑھنے والے وہاں کے اصول اقتصاد سے تو اچھے واقف ہوتے ہیں لیکن اگر اُن سے پوچھا جائے کہ ہندستان کے خاص حالات پر اُن اصولوں کے مطابق رائے قایم کرکے بتائے تو رہ قاصر رہتے ہیں - ہمیں ایسے ماہران فن کی ضرورت ہے جو اقتصادی اصول سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ایسی طبعزاد کتابیں لکھیں جو یہاں کے اقتصادی معاملات پر روشنی ڈال سکیں اور یہاں کے لوگوں کی عملی رہبری کرسکیں -

انگریزی علم ادب سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور اپنے لٹریچر کی ترقی کا ذریعہ بنا سکتے ہیں - مگر افسوس کہ ہم نے اب تک اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا - چند مشہور کتابوں کے ترجموں کو چھوڑ کر بہت سے ترجمے انگریزی ادب کی ایسی کتابوں اور فسانوں کے ہیں جنہیں انگلستان میں کوئی پوچھتا ہی نہیں - افسوس ہے کہ ہمارے بھائیوں

نے محنت بھی کی اور روپیہ بھی لگایا تو ایسی چیزیں شایع کرنے پر جن سے بجائے فائدے کی امید کے نقصان کا اندیشہ ہے - آپ اگر ادبی کتابوں کے ترجمے کرائیں تو ایسے مصنفوں کی کتابیں انتخاب کیجئے جنہیں صاحب طرز کہہ سکتے ہیں - جنہوں نے انداز بیان میں کسی طرز جدید کی بنا ڈالی ہے یا جن کی تحریر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے - بعض کتابیں تو ایسی ہیں جن کے پورے ترجمے ہونے چاہئیں - مگر زیادہ تر یہ مفید ہوگا کہ آپ کی جماعت ایک سب کمیٹی قائم کرے جو مشہور مصنفین انگریزی کی بہترین کتابوں سے ایسے ٹکڑے چھانٹ لے جو ادبی خوبیوں سے پر ہیں - جن کو پڑھ کر خالص اردو یا ہندی داں حضرات اپنے خیالات کو انگریزی کے سانچے میں ڈھال کر اُن میں نئی آب و تاب پیدا کر سکیں جو اس زمانے کے مذاق کے مطابق ہو اور ادب اردو کے مذاق صحیح کے بھی خلاف نہ ہو -

مستقل تصانیف خاص مضامین پر جس کا اعلان اکیڈیمی کی جانب سے حاصل ہوتا ہے لکھوائی جاتی ہیں اور جو اچھی ہیں ان پر انعام دیا جاتا ہے - عمدہ کتابوں کے لکھنے کی تشویق کا یہ اچھا طریق ہے - مگر اسکے ساتھ ہی یہ بھی ہونا چاہئے کہ ایک انعام ہر سال کسی ایسی کتاب پر بھی دیا جائے جو مشترکہ مضامین کے علاوہ کسی اور مفید موضوع پر ہو تاکہ جو لوگ اپنے طور پر اور محض شوق علم سے کتابیں لکھیں- خواہ اُن کا موضوع اُن مضامین سے الگ ہو جن پر آپ نے کتابیں طلب کی ہیں - وہ بھی اس مقابلے میں شریک ہو سکیں اور اگر اُن کی کتاب قابل انعام قرار پائے تو وہ انعام پا سکیں - جو چیز شوق سے لکھی جائے وہ فرمایشی تصنیف یا تالیف سے زیادہ پر اثر ہوتی ہے - اور ایسی کتابوں کی حوصلہ افزائی اچھے لٹریچر کی ترقی کی محرک

ہوگی - اور مصنف اپنی ذاتی خصوصیتوں اور اوصاف کا اظہار اس قسم کی کتابوں میں آزادی سے کرسکیں گے - زبان کو عام فہم اور سلیس بنانے کے وسائل پر بھی آپ کی جماعت غور کر رہی ہے - یہ نہایت اہم مقصد ہے - ہمارے اخبارات اور رسالے اس مقصد کی تکمیل میں بہت مدد دے سکتے ہیں - مگر تا حال انہوں نے اِدھر توجہ نہیں کی بلکہ دانستہ یا نادانستہ مشکل الفاظ کے داخل کرنے کا کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے - آج کل کئی اخباروں میں ایسی تراکیب اور ایسے پوچیدہ جملے اور مشکل الفاظ ہوتے ہیں کہ اگر کوئی پرانا زبانداں جو انگریزی زمانے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے دوسرے جہاں سے واپس آجائے تو وہ اُن کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکے - اس میلان کو روکنا چاہئے -

انگریزی الفاظ کے جا و بیجا استعمال کی کثرت بھی ایک حل طلب مسئلہ بن گئی ہے - کچھ لفظ تو ایسے ہیں کہ ہماری زبان کا جزو بن گئے ہیں اُن کا تو کچھ جھگڑا نہیں - جیسے ریل - ٹکٹ وغیرہ - کچھ ایسے ہیں جن کی شکل بدل کر انہیں ہم نے دیسی بنا لیا ہے - جیسے جرنیل - کرنیل - لالٹین - ان کو بھی ہر شخص روا رکھتا ہے - کچھ ایسے ہیں جن کے لئے ویسا آسان اور عام فہم لفظ ہندستانی میں نہیں ہے - اسلئے ان کا رواج ہو گیا ہے - ان کا بھی استعمال جائز ہے - مثلاً اخبار نویس کسی مضمون پر نوٹ لکھتا ہے - اسکی جگہ بعض دوست لفظ "شذرہ" لکھنا پسند کرتے ہیں ـ حالانکہ "نوٹ" کا مفہوم لوگ اب خوب جان گئے ہیں - ایک اور انگریزی لفظ ہے جس کا ترجمہ آج کل عام طور پر مستعمل ہے - وہ لفظ "پروٹسٹ" ہے - اکثر اخبار نویس اس کا ترجمہ "صدائے احتجاج" کرتے ہیں- بارہا یہ خبر چھپتی ہے کہ کسی جماعت

نے کسی قانون سے اپنی ناراضگی ظاہر کی - یا کسی تجویز سے مخالفت کے باعث "پروٹسٹ" کے طور پر اُٹھ کر چلے گئے - یہ لفظ گو خالص انگریزی لفظ ہے - اور ابھی ہندستانی میں داخل نہیں ہوا - لیکن میرا بس چلے تو میں بجائے صدائے احتجاج کے "پروٹسٹ" ہی کو زیادہ رواج دوں - کیونکہ بہت لوگوں کے کان اس سے آشنا ہوچکے ہیں اور وہ اس کا مطلب سمجھ گئے ہیں - ممکن ہے اس خاص لفظ کے متعلق بعض حضرات کی رائے کچھ اور ہو - مگر جس میلان کو میں واضح کرنا چاہتا ہوں اس کے ظاہر کرنے کو یہ مثال اچھی ہے - البتہ ایسے انگریزی الفاظ کو چھوڑ کر جن کو کثرت استعمال نے ہماری زبان میں داخل ہونے کا حق دے دیا ہے - انگریزی الفاظ کا موقع بے موقع اور بے تحاشا استعمال جو کئی لوگ کرتے ہیں وہ زبان کے حق میں بہت مضر ہے - اور اس سے بچنا چاہئے -

اس ضمن میں علمی اصطلاحات کا سوال بھی قابل غور ہے - مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس اکیڈیمی کے اراکین زیادہ تر اس طرف مائل ہیں کہ جو علمی اصطلاحیں دوسرے ملکوں میں مروج ہیں - ان کا ترجمہ کرنے کے بجائے وہی اختیار کرلی جائیں - مجھے اس رائے سے اتفاق ہے - اس میں آسانی بھی ہے اور فائدہ بھی - فائدہ یہ ہے کہ ایک مرکز والوں نے کچھ ترجمہ کیا اور دوسرے والوں نے کچھ - تو اس سے ناحق انتشار پیدا ہوگا اور ہم ایک دوسرے کی علمی اصطلاحوں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہیں گے - لیکن موجودہ علمی اصطلاحیں اختیار کرلینے سے آپس میں تبادلۂ خیالات و معلومات میں سہولت ہوگی اور جو شخص کسی دیسی زبان کے ذریعے کوئی علم حاصل کرکے ہندستان سے باہر بھی تلاش علم کے لئے جائے گا - اسے وہاں کی اصطلاحات اجنبی نہ معلوم ہوں گی -

جو اصلاحات آپ نے شروع کی ھیں اُن میں ٹائپ کے حروف کا اختیار کرنا ایک مفید اصلاح ہے - مجھے معلوم ہے کہ بہت سے اردو داں حضرات جن کی نگاہیں نستعلیق خط کے خوبصورت حروف کی عادی ھیں - اردو ٹائپ سے گھبراتے ھیں - مگر آپ نے اپنے رسالے اور اپنی کتابوں کے لئے اس کو پسند کر لیا ہے - کچھ دن لوگ اس سے گھبرائیں گے - مگر رفتہ رفتہ عادی ہو جائیں گے - میں خود نستعلیق خط کو نہایت پسند کرتا تھا - اور میں نہیں چاہتا کہ خوشنویسی کا فن یا پتھر کے ذریعے چھپائی ہمارے ملک سے مفقود ہو جائے - میرے خیال میں اگر کتابوں کی خوبصورتی کے لئے اسے قایم رکھا جائے تو بہت مناسب اور مفید ہوگا - مگر جو چیزیں جلد چھپنے کی یا معین وقتوں پر چھپنے کی ہیں - اور جہاں یہ مطلوب ہو کہ آج ایک لمبی تقریر کی جائے اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں وہ شایع ہوسکے وہاں ٹائپ کے حروف کے بغیر کام نہیں چلتا اور کوئی زبان ترقی یافتہ زبان نہیں بن سکتی جب تک اس میں ایسے حروف مہیا نہ ہوں - مجھے پتھر پر جمائی ہوئی کاپیوں اور ٹائپ کے جوڑے ہوئے حروف کے متعلق گلستان کی وہ مشہور کہانی یاد آتی ہے - جس میں ایک امیر کے بیٹے اور ایک غریب کے لڑکے کا مباحثہ درج ہے - لکھا ہے کہ امیر زادہ نے شوخی سے کہا کہ میرے باپ کی قبر پر سنگ مرمر کا تعویذ ہے اور تمہارے باپ کی قبر محض ایک گڈھا ہے- جس پر مٹی کا ایک ڈھیر ہے - غریب کے لڑکے نے جواب دیا کہ " تا پدرت از زیر سنگ گراں بہ جنبد پدرم بہ بہشت رسیدہ باشد " جتنے میں تیرا باپ بھاری پتھر کے بوجھ سے دبا ہوا قبر سے نکلنے کا ارادہ کرے اتنے میں میرا باپ بہشت میں پہنچ گیا ہوگا -

اس اکیڈمی کے جو بڑے بڑے مقاصد ھیں اُن پر ایک سرسری تبصرہ میں نے کیا ہے - وقت کی کمی کا لحاظ رکھتے ہوئے میں زیادہ تفصیلی

بحث اِن امور پر نہیں کر سکتا - اس لئے میں آپ کو اُس کامیابی پر جو چار پانچ سال کے قلیل عرصے میں حاصل ہوئی مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ جماعت ہماری ملکی زبان کی بنیاد کو مستحکم کرنے اور اس کو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ بنانے میں روز افزوں کامیابی حاصل کرے - اور یہ دونو قومیں مل کر سرگرمی سے اپنے مشترکہ لٹریچر کو دنیا کی بہترین زبانوں کے بہترین ادبیات کے درجے تک پہنچادیں -

---

میرے کتاب خانے کے پرانے چھپے ہوئے اردو دیوان

(از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب‌الرحمان خانصاحب شروانی)

(۱۲) کلیات نظیر اکبرآبادی

شیخ ولی محمد نام - روضۂ تاج گنج کے قریب مکان تھا - لڑکے پڑھاتے تھے - حلم و خلق و انکسار میں بے نظیر روزگار تھے - تذکرۂ گلشن بیخار کی تالیف سے کچھ مدت پہلے انتقال کیا - مشہور اشعار کے لحاظ سے جو سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں شعرا میں شمار ہونے کے لایق نہیں مگر انتخابی کلام کے لحاظ سے قطع نظر کی گئی - (خلاصہ تذکرۂ گلشن بیخار نواب مصطفی خان شیفتہ مرحوم) تذکرہ گلشن بیخار اول مرتبہ خود نواب صاحب تذکرہ نگار کی تصحیح سے سنہ ۱۲۵۲ھ میں طبع ہوا تھا - قاموس‌المشاہیر میں سنہ وفات سنہ ۱۸۳۰ھ لکھا ہے - یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ اودہ نے بلایا مگر انہوں نے آگرہ نہیں چھوڑا -

زیر نظر کلیات کا نسخہ مطبع الہی واقع اکبرآباد کا چھپا ہوا ہے - سنہ ۱۲۸۲ھ میں کمون تولہ میں محمد وزیر خان کے اہتمام سے چھپا - چوتھے دیوان پر مچھو خان کے اہتمام سے چھپنا لکھا ہے - خوشخط جلی قلم - سارا دیوان نقش و نگار سے مزین - کاغذ باریک صاف بے عیب - چار جلدیں ہیں - اول چاروں جلدوں کی فہرست ہے - دو دیوان یعنی دیوان اول و دوم مروجہ اصول شاعری کے مطابق ہیں - ان میں غزلیات ' رباعیات ' قطعات ' مخمسات سب کچھ ہے ' زبان صاف ہے ' حجم ۱۴۲ صفحہ - استعمال الفاظ میں وسعت ہے - مضامین ملتذب بھی ہیں - جنہوں نے نواب شیفتہ سے خراج تحسین حاصل کر ہی لیا - ملاحظہ ہو :—

سبھوں کو ہے ہمیں خونناب دل پلانا تھا
فلک ہمیں پہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا

ہمنے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

داغ مرنے کا وہی محروم جانے جس کو آہ
موت آ پہنچی شتاب اور یار آیا دیر کر

سر چشمۂ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ
حضرت خضر کہیں سے جاکر شراب لاؤ

عشق پھر رنگ وہ لایا ہے کہ جی جانے ہے
دل کا یہ رنگ بنایا ہے کہ جی جانے ہے

میں دست و گریباں ہوں دم باز پسیں سے
ہمدم اوسے لاتا ہے تو لا جلد کہیں سے

کچھ نہ دیکھا ہمنے جز بیداد تیرے ہاتھ سے
اے مرے بیداد گر فریاد تیرے ساتھ سے

تیسرے دیوان کا عنوان ہے "کنھیا کا جنم" حجم ۸۸ صفحے - جس میں سے ۷۵ صفحے پر اوتاروں کی لیلا کی کتاب ہے اس میں گرو نانک شاہ اور گرو گلبی بخش کی تعریف بھی ہے - باقی صفحات میں قصہ لیلیٰ مجنوں ہے - لیلا کی زبان قدرتاً بھاشا سے بھری ہوئی ہے -

چوتھے دیوان میں مختلف عنوانوں پر پوری پوری نظمیں ہیں - مثلاً - عشق اللہ - عبرت دنیا - نعت - آدمی نامہ - خمسۂ وحدت - تربوز کی تعریف - ہرن کا بچہ - بسنت کی تعریف ، علیٰ ہذا القیاس - حجم ۱۵۱ (اس نسخے میں ایک صفحہ کم ہے) دیوان چہارم میں زبان و بیان کی پوری وسعت ہے - شاعری کی مسلمہ پابندیاں زبان و محاورہ

میں نہیں - اس سے زبان و بیان کی وسعت کا سبق حاصل کیا جاسکتا ہے - اوتاروں کے لیلا سے اُن تعلقات پر روشنی پڑتی ہے جو اُس زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملائے ہوئے تھے - دوسری نظموں سے اس زمانے کی زندگی کے بہت سے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں - چاروں دیوانوں کا حجم ۱۳۸۱ صفحات کا ہے -

(۳) دیوان غنچۂ آرزو

دیوان مہر وزیر علی صبا لکھنوی - ان کے شاگرد مرزا آغا حسن آغا کی فرمایش سے مطبع محمدی (لکھنؤ) میں باہتمام محمد یعقوب انصاری سنہ ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوا - کاتب دیوان چھیت رام شاگرد منشی مهدو لال زار - صفحہ کلاں - ۱۹ سطر فی صفحہ - خوش خط جلی - نقاشی سے مزین - صحیح - کاغذ باریک صاف بے عیب کھرے سے اب تک محفوظ - صفحات ۲۰۰ - صرف غزلیات ہیں - آخر میں تین رباعیاں ہوں - چار قطعات تاریخ - مرزا حاتم علی مہر کی کتاب پنجۂ مہر کی تاریخ ہے -

ع پنجۂ مہر ید بیضا گشت (سنہ ۱۲۵۸ھ)

دیوان کے خاتمے میں وفات صبا کی تاریخیں ہیں - خواجہ عزیز الدین عزیز کی تاریخ سننے کے لایق ہے -

دوش فریاد بگوشم آمد و گفتم چہ سبب
ناگہاں بلبل دل نوحہ کناں کرد ندا
ہست از مرگ صبا این کہ جدا گشتہ عزیز
از چمن سبزہ ' گل از شبنم و از باغ صبا

تخرجہ کی لطافت قابل داد ہے - وفات صبا سنہ ۱۲۷۱ھ میں ہے -

قطعات تاریخ وفات کے بعد طبع دیوان کی تاریخیں ہیں - منشی امیراللہ تسلیم کی تاریخ ہے - ع رقم کردم کلام اوستادے نکتہ پردازے -

مہر وزیر علی صبا لکھنوی خواجہ آتش کے شاگرد ھیں - فارسی کی اچھی - عربی کی بقدر ضرورت استعداد تھی - "صحت و صفائی محاورہ اور لطف سخن میں ان کا کلام ھمعصروں کی نسبت سے بہت بہتر ھے" گھوڑے سے گر کر جان دی (خلاصہ تذکرہ گل رعنا) بعض منتخب اشعار از تذکرہ مذکور :—

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ھمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اللہ رے اُن کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے
کیونکر کوئی جئیگا جب یوں عتاب ہوگا

کہتے تھے دل نہ دیں گے کسی کو تمام عمر
مجبور ھوگئے مگر اک دلستاں سے ہم

کوچہ عشق کی راھیں کوئی ھم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

(۱۴) ریاض البحر | نام تاریخی (۱۲۷۲ھ) - مطبوعہ مطبع مصطفائی واقع محلہ محمود نگر لکھنؤ سنہ ۱۲۸۵ھ میں باھتمام محمد عبدالواحد خاں خلف محمد مصطفیٰ خاں چھپا - تاریخ طبع دیوان از مرزا حاتم علی مہر ع - کہوں بحر مواج فکر سخن ھے -

یہ امداد علی لکھنوی - بحر تخلص کا دیوان ھے - بحر شیخ ناسخ کے شاگرد ھیں - "صحت الفاظ تحقیق لغت اور فن عروض میں مشہور - رشک کے بعد ناسخ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے" - ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے رھتے - لوگ دور دور سے تحقیق الفاظ کو آتے اور اسی بوسیدہ بورئے پر بیٹھنا فخر سمجھتے تھے - پیلستھ برس عسرت و

تنگ دستی میں بسر کئے - یہاں تک کہ مشہور قدر دان علم و فن نواب کلب علی خاں بہادر والی رامپور نے تعریف سنی - بلا بھیجا - عزت افزائی کے ساتھ تنخواہ مقرر کردی - عرصے تک رہے - بالاخر لکھنؤ یاد آیا - ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی تو مقطع میں جدائي کا ذکر دردناک انداز سے کیا - نواب صاحب کو رحم آیا - زاد راہ دیکر رخصت کردیا - مزاج کی وارفتگی نے دیوان کی ترتیب کا موقع ندیا - ان کے دوستوں کو جو کچھ غزلیں ہاتھ لگیں ردیف وار جمع کیں اور جو ردیف خالی تھي اس میں غزلیں لکھوا کر شامل کیں یہ دیوان چھپ گیا - (گل رعنا)

پیش نظر دیوان عمدہ خوشخط نقاشي کے ساتھ طبع ہوا ہے - کاغذ باریک مضبوط ہے - شکستگی اور کرم خوردگی سے بالکل محفوظ ہے - ایسا کہ آج کل کے دیدہ زیب بیجان کاغذ پر چھپی ہوئي کتابیں اس پر رشک کریں - حجم ۲۹۲ صفحات - متن اور حاشیے دونوں پر کلام ہے - اس طرح فی صفحہ ۳۴ سطر ہیں کل اشعار تقریباً ۹۵۰۰ - صرف غزلیات ہیں- آخر میں چند رباعیاں ہیں جو پر معنی ہیں - خاتمہ منشی امیراللہ تسلیم کا لکھا ہوا ہے - اردو زبان میں ہے - خاتمے کے بعد طبع دیوان کی تاریخیں ہیں - اول خود بحر کی ہے جس کا مطلع ہے - جامع اس دفتر کے ہیں سید محمد خاں رند- اس جلیل‌القدر کا یہ بحر پر احسان ہے - مادہ تاریخ ہے - ع - شعر ہیں نایاب در کان گہر دیوان ہے -

نور شاگرد برق کی لاجواب تاریخ ہے - ع بحر کا دیوان عکس چشمۂ خورشید ہے - حروف منقوطہ سے تاریخ نکالی ہے - (کلام کا نمونہ)

نہ تو وہ پھول نہ کلیاں نہ وہ سبزي نہ بہار
رت کے پھرتے هی چمن زار کا تختہ الٹا

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں
کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

بسمل ہجر سے پوچھے کوئی مرنے کی خوشی
جان آتی ہے بدن میں کہ قضا آتی ہے

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں
مجھکو اس پھول سے خوشبوے وفا آتی ہے

رباعیات کا نمونہ— (گل رعنا)

غیبت نہ کبھی حاضر و غایب کرنا
ہے جرم بیاں حال فاجر کرنا
ہے سنگ محک کو رو سیاہی حاصل
ہرگز نہ کسی کا عیب ظاہر کرنا

کیا عرض کریں جو رنج سہتے ہیں ہم
ہوتے ہیں عرق عرق جو کہتے ہیں ہم
ہے فکر یہی کٹے گی کیونکر اوقات
پہروں خاموش بیٹھے رہتے ہیں ہم

پہونچاے کمال گو فلک پر مجھکو
رتبہ نہ ہو ذرے کی برابر مجھکو
ہے میری نمود تیس کے چاند کی شکل
دیکھے گا نہ کوئی آنکھ اُٹھاکر مجھکو

اے رب کریم جب مرا دم ٹوٹے
قزاق اجل متاع ہستی لوٹے
امید یہ ہے تیری عنایت سے مجھے
پنجے سے نہ پنجتن کا دامن چھوٹے

دو نسخے ہیں - ایک مطبع اعلی پریس میرٹھ کا چھپا ہوا ، یہ

(۱۵) دیوان شاہ نصیرالدین۔ نصیر دہلوی

" انتخاب کلیات شاہ نصیر " کے نام سے سنہ ۱۲۹۴ھ میں باہتمام حافظ محمد، اکبر - اکبر تخلص چھپا تھا - چھوٹا سا مجموعہ ہے - کل صفحات ۱۰۸ - فی صفحہ ۱۵ سطر - کل اشعار کم و بیش ڈیڑہ ہزار ہیں - اول دیباچہ ہے - جو خود مہتمم مطبع نے لکھا ہے - باوجود بقامت کہتر ہونے کے بقیمت بہتر ہے - علاوہ غزلوں کے قصاید و رباعیات بھی ہیں - اُس میں لکھا ہے کہ " بس یہ بات نہایت افسوس کے قابل ہے کہ شاہ ممدوح کا کلام ہنوز طبع نہ ہوا " - مرزا محمد حسن بیگ سرشتہ دار کلکٹری ضلع میرٹھ ساکن سورق ضلع ایٹہ نے ایما کیا کہ انتخابِ کلام نصیر چھاپا جائے - چنانچہ میں نے حسب ایما ایک نسخۂ قلمی سے جو میرے کتاب خانے میں موجود تھا انتخاب کرکے انطباع اس کا شروع کر دیا - اسی اثنا میں سید شاہ بہاؤالدین صاحب تخلص بشیر نبیرۂ شاہ نصیر صاحب مرحوم سے.....ملاقات ہوئی اور اُن کی عنایت و مہربانی سے ایک صحیح نسخۂ کلیات شاہ نصیر صاحب کا ملا اور معلوم ہوا کہ علاوہ اس کے اور دیوان بھی شاہ صاحب کی تصنیفات سے ہیں - ان تمام دواوین و قصاید کے دیکھنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ از روے ضخامت کے تصنیفات شاہ صاحب کی میر تقی صاحب کے کلیات سے کسی طرح کم نہیں ہے - اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو اُس سے بھی کسی قدر زیادہ نکلیں گے - پھر کیف اس وقت

لگ جو کلام دستیاب ہوا اُس کا یہ نہایت مختصر انتخاب طبع کیا جاتا ہے" - دیباچہ کے آخر میں شاہ نصیر کی وفات کی تاریخیں ہیں - ایک شاہ نجم‌الدین شاہ نصیر کے بیٹے کی ایک شاہ بشیر اُن کے پوتے کی - ایک خود مہتمم مطبع کی - شاہ نجم‌الدین نے حروف ملفوظ سے تاریخ نکالی ہے - " خسرو ارباب سخن " - دیباچہ کے خاتمے پر وفات نصیر کی تاریخیں ہیں- بشیر اُن کے پوتے نے تاریخ کہی-ع پیشوائے شاعران ہند مرد - (١٢٥٤ھ)

اس ١٠٨ صفحے کے مجموعے میں دو حصے ہیں - ایک اس دیوان کا انتخاب جو خود مہتمم کے پاس تھا یہ ٨۴ پر ختم ہوتا ہے - دوسرا اُس دیوان کا انتخاب جو شاہ بہاؤ الدین نبیرہ شاہ نصیر نے مہتمم کو عنایت کیا -

اس مجموعے میں غزلیات ہیں - حصہ دویم کے آخر میں پانچ رباعیاں ہیں - چار قصیدے - دو اکبر شاہ ثانی کی مدح میں - ایک راجہ چندو لال دیوان حیدرآباد کی تعریف میں - چوتھا " تہنیت تولد پسر مظفر جنگ وزیر اعظم شاہ زمن " میں سنہ ١٢٢١ھ میں لکھا - مدح اکبر شاہ کا دوسرا قصیدہ مخمس کی شکل میں ہے بتقریب نوروز عید - پہلے بند کی ٹیپ ہے -

عید قرباں و بسنت آئے ہیں باہم دونو
ہوں مبارک تجھے اے مہر اعظم دونو

یہ اگلے اتحاد کا رنگ ہے -

حصہ دویم کے خاتمے پر طبع دیوان کی تاریخیں ہیں - شاہ بشیر موصوف نے تاریخ لکھی - طلسم دفتر عشاق ' (١٢٩۴ھ) مولوی عبدالحکیم - حکیم - نے لکھی - ع

کلام سخن سلیم شیوا بیان '

دوسرا دیوان حیدرآباد دکن کا چھپا ہوا ہے - " چمنستان سخن "
(۱۳۱۲ھ)
تاریخی نام زیب عنوان ہے - مطبع نظامی میں سنہ ۱۳۱۲ھ میں چھپا -
دکن میں جو سلسلۂ تلامذۂ نصیر کا تھا اُس میں ایک میرالشعراء
امیر احمد علی خاں شہید تھے - ان کے پوتے حکیم میر قادر علی رعد
تخلص کے کتاب خانے میں ایک دیوان تھا اُس کی نقل یہ دیوان ہے -
تصحیح خود رعد نے کی - متن اور حاشیہ دونو میں اشعار چھپے ہیں -
ضخامت ۱۶۷ صفحات - شمار اشعار ۷۷۷۹ - اس طرح پہلے دیوان کے
مقابلے میں پانچ گنے سے زیادہ کلام ہے - صرف غزلیات ہیں - آخر دیوان
میں وفات شاہ نصیر کی تاریخیں ہیں - جو بعینہٖ وہی ہیں جو دیوان
مسبوق الذکر میں ہیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسخۂ اہل مطبع
کے پیش نظر تھا - تعجب ہے کہ قصاید و رباعیات اس سے نقل کرکے شامل
دیوان ہذا نہیں کی گئیں- تاریخہاے وفات کے بعد طبع دیوان کی تاریخوں
کا سلسلہ ہے جو طویل ہے - مرزا داغ دہلوی کی تاریخ ہے - کلام شاہ نصیر
(۱۳۱۲ھ)
اوستاد اہل ہند - یادش بخیر آب حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
آزاد مرحوم کا خیال یہ تھا کہ دیوان شاہ نصیر مرتب ہی نہیں ہوا -
چنانچہ لکھا ہے " یہاں ان کی اولاد میں زمانے کی گردش نے کسی کو سر
نہ اٹھانے دیا جو کل کلام کو تہذیب اور ترتیب کرتا - شاگردوں کے پاس
بہت سی متفرق غزلیں ہیں مگر کسی نے سب کو جمع نہیں کیا - ان کے
دیوان کی سب کو تلاش ہے " - آگے لکھتے ہیں - " تحسین کے بیٹے
سید عبدالرحمن نے ایک مجموعہ جمع کیا وہ نواب رام پور نے معقول رقم
دے کر منگا لیا غزلیں اکثر ملتی ہیں مگر قصیدے نہیں ملتے " -

ہم نے جو واقعات اوپر لکھے ہیں وہ ان بیانات کے خلاف ہیں -
شاہ صاحب کے پوتے شاہ بشیر نے ایک مصحح نسخہ کلیات نصیر کا مہتمم

مطبع اعلیٰ پریس کو عنایت کیا تھا - اس کے علاوہ اور دیوان بھی تھے - ایک غلطی کی اصلاح مناسب ہوگی - مہرتھ کے مطبوعہ نسخہ میں مدفن نصیر کا پتا " قاضی موسیٰ کی درگاہ " لکھا ہے - آب‌حیات میں آزاد نے قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ " لکھا ہے- صحیح "موسیٰ قادری کی درگاہ " ہے -

کلام—شاہ نصیر دہلوی کی طرز کلام خاص ہے جس کو مضمون آفرینی کہتے ہیں اور وہ بھی ایسی کہ اُس کو صرف وہی نباہ گئے ہیں - ان کی مضمون آفرینی کا مفہوم الفاظ کے جوڑ توڑ سے مضمون پیدا کرنا ہے - ادا بندی اور درد دل سے کمتر لگاؤ ہے - استادانہ قوت سے سنگ لاخ زمینوں کو شگفتہ کرتے قوافی کا حق ادا کرتے - لکھنؤ میں خواجہ وزیر نے مضمون آفرینی کی ہے مگر دوسرے انداز سے - آج اس کی پرسش بزم ادب میں نہیں - شاہ نصیر کے یہاں سادہ مضامین بھی ہیں اور وہ دلکش ہیں - نمونہ ملاحظہ طلب :—

جب کہ حق آپ کو شہ رگ سے بھی فرمائے قریب
پھر وہ اندھا ہے یہاں جو نہ اوسے پائے قریب
دوربیں پہنچے ہے چشم دل آگاہ کو کب
یار سو کوس پہ گر ہو تو نظر آئے قریب

جلوہ اے چشم نہ کہہ دل میں نہاں کس کا ہے
میں غفلت ہے جو کہئے یہ مکاں کس کا ہے
پوچھتا کیا ہے تو رندان خرابات سے شو ہم
بے نشان کون ہے اور نام و نشاں کس کا ہے
آگ لگ جائے تجھے عشق کہ یوں ہم تو جلیں
اور نہ پوچھے وہ کہ یہ سوختہ جاں کس کا ہے

جام پر جام میں اس واسطے پیتا ہوں آج
دور کل دیکھئے اے بادہ کشاں کا ہے
ایک دن تونے نہ پوچھا کبھی اے خانہ خراب
پس دیوار یہ اب شور و فغاں کس کا ہے
یار تو طرز پہ مرتے ہیں سب ہی آج نصیر
پر یہ انداز سخن کہئے یہاں کس کا ہے

مطبع کا نام معلوم نہ ہوسکا - اول آخر ناقص ہے - اگرچہ ہر حصہ کے بعد خاتمہ ہے تاہم مطبع کا نام نہیں - ایک حصے کے خاتمے سے یہ البتہ واضح ہوا کہ سنہ ۱۲۷۱ھ کا

(۱۶) کلیات سودا -

مطبوعہ ہے - تقطیع بڑی ہے - متن اور حاشیہ دونوں پر اشعار ہیں - فی صفحہ ۴۲ شعر - اول اور آخر سے ناقص ہے - ابتداءً وہ فارسی رسالہ ہے جو مرزا فاخر مکیں کے رد میں مسمی بہ تنبیہ الغافلین لکھا تھا - یہ رسالہ ۵۰ صفحہ کا ہے - پیش نظر نسخے میں اس کے صرف دس صفحے آخر کے آئے ہیں -

اس رسالے کے بعد کلیات شروع ہوتا ہے- اول فارسی دیباچہ ہے جو ایک صاحب اصلح الدین نامی کا لکھا ہوا ہے - مدح طرازی کے سوا دیباچہ دوسرے مضامین سے بالکل عاری ہے - دیباچہ کے بعد قصاید ہیں - نعت و منقبت کے بعد مدحیہ قصاید ہیں - اول شاہ عالم بادشاہ دہلی کی مدح میں - اس کے بعد عمادالملک غازی الدین خاں فیروز جنگ کی مدح میں - اس کے بعد شجاع الدولہ - آصف الدولہ بہادر - اس کے بعد امرا کی مدح میں متعدد قصاید ہیں جن میں سے ایک مہربان خاں کی مدح میں ہے- اس قصیدے میں " نصائح فن شاعری و طعن بر شاعری " بھی ہے -

مدح کے بعد ہجو کی باری ہے جس میں مرزا کو یدطولیٰ حاصل تھا - قصاید صفحہ ۵۱ سے شروع ہوکر صفحہ ۱۱۷ پر ختم ہوتے ہیں کل

صفحات قصاید ۹۷ - قصاید کے بعد ۲۲ چھوٹی بڑی مثنویاں ہیں - تعداد صفحات ۵۷ - مثنویوں کے بعد دیوان غزلیات فارسی ہے - صفحات ۱۳ - غزلیات فارسی ختم ہونے پر آغاز غزلیات ریختہ - صفحات ۱۱۱ - غزلیات کے بعد مطلعات پھر رباعیاں - رباعیات کے بعد قطعات - قطعات کے بعد مسدس - پھر ایک مسدس و اسوخت - مسدس کے بعد مخمس جو چالیس ہیں - یہ سلسلہ صفحہ ۳۶۸ پر ختم ہوتا ہے - اس کے بعد دیوان مرثیہ ہے - شروع میں دیباچہ فارسی دوسرے کے قلم سے ہے - دیباچہ کے بعد ایک نظم سبیل ہدایت ہے جس میں میر تقی میر کے ایک سلام و مرثیہ پر اعتراض اور اصلاح ہے - سلام و مرثیہ کی شرح منظوم کے درمیان میں تھوڑی سی نثر بھی سودا کے قلم کی ہے - سبیل ہدایت کے بعد سلام اور مراثی شروع ہوتے ہیں - مرثیے مسدس بھی ہیں - مخمس بھی - مربع بھی - مثلث بھی - مرثیوں کا سلسلہ صفحہ ۳۶۹ سے صفحہ ۴۷۴ تک ہے - کل صفحات ۱۰۵ - نسخہ ہذا چونکہ آخر سے ناقص ہے نہیں معلوم کس قدر صفحے کم ہیں - لہذا یہ اندازہ دشوار ہے کہ دیوان مرثیہ کا پورا حجم کس قدر ہے -

دیوان کے سرسری مطالعے سے فحاشی پر حیرت ہوئی - مرزا کے دامن کمال پر فحش گوئی کا گلدہ دھبا ہے جیسے کسی شگفتہ چمن میں غلاظت کا انبار ہو -

(۷) دیوان ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ - لکھنوی - مطبوعہ منشی نولکشور - تعجب ہے کہ مطبع والوں نے سنہ طبع نہ اول لکھا ہے نہ آخر میں - نسخہ پرانا معلوم ہوتا ہے - صرف غزلیات ہیں - ۱۳۸ - فی صفحہ متن و حاشئے پر ۳۴ شعر - مجموعہ اشعار کم و بیش ۴۶۹۲ - خوشخط جلی قلم ہے - کاغذ صاف بے عیب ہے -

مطبوعہ " مطبع محمدی در چوک قدیم بیت السلطنت لکھنؤ

(۱۸) بہار سخن

متصل چبوترہ کوتوالی - باہتمام ولی محمد " - خاتمے میں ہے " تاریخ بائیسویں ربیع الثانی ۱۲۹۳ ہجری میں یہ مجموعہ باہتمام مولوی عبداللہ صاحب پسر حاجی ولی محمد صاحب مطبع محمدیہ میں کہ بیچ محلہ جھوائی تولے کے واقع ہے چھپا " - سر لوح لکھا ہوا ہے " حال سرکار ولیعہ بیگم صاحبہ " - بہار سخن میں تین شاعروں کا ہم ردیف کلام ہے - ناسخ - آتش اور آباد - ہر صفحہ میں تین کالم ہیں - اول میں ناسخ کی غزل ہے - دوسرے میں آتش کی - تیسرے میں آباد کی - درمیان درمیان میں بحر عروض بھی کلام کی جلی قلم سے لکھی ہے - بہت خوشخط نسخہ ہے جو اس زمانے کا مطبوعات کا طرہ امتیاز تھا - کاغذ سپید کھرا سرامپوری دبیز - اب تک اسکی رونق تازہ ہے - حالانکہ چھپے ہوئے ۹۱ برس ہوگئے - آباد نے خود صحیح کرکے یہ نسخہ چھپوایا تھا - صفحات ۲۵۹ -

آباد کا نام مہدی حسین خان ہے - لکھنوی ہیں - شاگرد ناسخ - نواب فرخ آباد کے قریبی رشتہدار - انکے دو دیوان تھے - ایک مثنوی - تپش و اسوخت - ایک دیوان کا نام نگارستان عشق تھا - جو ۱۲۹۲ھ میں چھپا تھا - (خمخانہ جاوید) استاد کے شاگرد رشید ہیں اس سے انداز کلام سمجھ لو -

نمونہ - مطلع اول - ناسخ -

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

آتش -

لبھاتا ہے نہایت دلکو سبزہ خط جاناں کا
گھسیٹیگا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا

آباد -

ہمیشہ تذکرہ ہے مصحف رخسار جاناںکا
کتاب عشق نے حافظ کیا ہے مجھکو قرآںکا

مقطع آخر انتخاب - ناسخ -

غنچہ و گل نظر آتے ہیں بہم اے ناسخ
ہاتھ میں شیشہ اگر وہ گل تر لیتا ہے

آتش -

عزت نالۂ و فریاد نکھو اے آتش
آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

آباد -

رشک آتا ہے دل صاف کو اپنے آباد
آئینہ ہاتھ میں جسدم وہ قمر لیتا ہے

آتش کا سوز و گداز صاف عیاں ہے -

(آپ ابھی یہ راے قایم نکریں کہ دوا دہن کے ذکر میں کسی حکمت

(۱۹) نتایج الذہن و فیضان الفکر -

کی کتاب کا ذکر ہونے لگا) یہ معتمد الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی خاں بہادر قبول جنگ متخلص بہ قبول کا دیوان ہے - جو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے حکم سے مطبع سلطانی میں طبع ہوا - قبول مہتمم کتابخانہ مذکور تھے - پہلے نام سے سال تصنیف نکلتا ہے جو ۱۲۵۰ھ ہیں - دوسرے سے سال طبع جو ۱۲۷۲ھ ہے - واجد علی شاہ کا پورا القاب دیوان میں "ابوالمنصور ناصرالدین سکندر جاہ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ اختر نگر" ہے - خط کی شان قابل دید ہے - خصوصاً لوح کے جلی قلم کی - کاغذ سپید باریک ہے جو بانس کا کہلاتا تھا - ایسا یہ مذہب

ہے کہ معلوم ہوتا ہے اپنی مطبع سے نکلا ہے - ۵۳۲ صفحے ہیں - اخیر سے ناتمام ہے - سطر فی صفحہ ۱۲ - صفحہ کلاں - طرز کلام ٹھیٹ واجد علی شاہی - غزلیات ہیں - آخر میں معمے ہیں - معموں کے بعد رباعیات - متفرقات ہیں اور بادشاہ کی مدح و مبارکباد ہیں - بہت سی رباعیاں عتبات عالیات کی زیارت کی طلب رخصت میں ہیں - باقی متفرق - ایک رباعی مدحیہ سن لو - رباعی :—

دنیا کے مزے ظل الٰہی سے ملیں
سو مرتبے اک نگاہ شاہی سے ملیں
دریائے سراب پر جو ہو بارش فیض
در ہمکو وہاں ریگ ماہی سے ملیں

رباعیوں کے بعد تاریخیں ہیں جو صفحے ۴۹۱ سے ۵۳۲ تک برابر چلی گئی ہیں - درمیان سے آٹھ صفحے غایب ہیں - زمانہ انکا ۱۲۴۹ھ سے ۱۲۷۰ھ تک ہے - اخیر تاریخ خواجہ وزیر کی رحلت کی ہے - تاریخیں عموماً فارسی زبان میں ہیں جس سے قبول کی قدرت فارسی پر عیاں ہے - تاریخ کے مادے بھی خوب خوب نکالے ہیں - تاریخوں کے عنوانوں سے اس زمانے کے معاشرت کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے - چند مادہائے تاریخ ملاحظہ ہوں - ایک سبیل کی تاریخ - دل چویا این امر خیر آہنگ بست - گفت گویا سلسبیل ثانی ست (۱۲۵۰ ھ) - کیتکی خواص کی تاریخ وفات - ع بجنان او چوگل شگفتہ رسید (۱۲۵۱ھ) - خلوت توپخانہ کی تاریخ - ع بن جائیں سب حسود نشانہ تفنگ کے (۱۲۵۲ھ) - ایک تعمیہ ملاحظہ ہو - امجد علی شاہ کے حکم سے سائبان قصر ولیعہد کے لئے تیار ہوا - تاریخ ہوئی.........گفت معمار خرد تاز یبش- کہ ز تمہید و تناظر پاک ست - چوں ولیعہد بران داخل

هست (۱۲۵) هشکوۃ فلک الافلاک ست (۱۲۵۵) واجد علی شاہ نے مہر شمس الدین فقیر دہلوی کی کتاب عروض کا ترجمہ اردو میں کیا۔ حکم اختر نام رکھا۔ تاریخ ہوئی ع ملبوس دادہ نوشہ الدس فقیر را (۱۲۶۹ھ)۔

سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا دیوان۔ تقطیع بہت بڑی

۴۰— دیوان اختر | ۱۵ $\frac{1}{2}$ انچ × ۱۰ $\frac{1}{2}$ انچ۔ حاشیہ بسوط و عریض۔ خط جلی۔ سطر فی صفحہ ۸۔ کل صفحات ۲۸۸

شان یہ ہے کہ تاالتل پہچ محض سادہ ہے۔ اول کے دو صفحے ملقش و گلکار ہیں۔ پہلے صفحے پر واجد علی شاہ کے دربار کی تصویر ہے۔ بادشاہ تخت پر ہیں۔ آغاز شباب ہے۔ درباری کمر بستہ کھڑے ہیں۔ بعض انگریزی لباس میں ہیں۔ سامنے ناچ ہو رہا ہے۔ تصویر کے اوپر اور نیچے سرخ روشنائی سے عبارت چھپی ہوئی ہے " شروعہ مبارک مصنف دیوان هذا سلطان الخ " ہر صفحہ پر نقاشی کا باریک زنجیرہ ہے۔ ہر غزل کے آغاز میں بڑا گلدستہ ہے جسکے اوپر تاج و چتر شاہی ہے۔ اندر غزل کی بحر ہے۔ تخلص ہر غزل میں شلنجرفی قلم سے لکھا گیا ہے۔

مطلع دیوان ہے۔

تری الفت میں ہر سلطانکو رتبہ ہے گدائیکا
سوا تیرے کسے زیبندہ ہے دعویٰ خدائیکا

حسن مطلع ہے۔

لگی ہو چوٹ جسکو عشق کی باتوںمیں اچھی ہو
زباں نے خامہ پیدا کیا ہے مومیائیکا

ایک شعر اور۔

نہ مثل مہر تاباں ہے نہ شعلہ سے مطابق ہے
نیا انداز ہے محبوب کی رنگ طلائی کا

خاتمہ صرف اسقدر ہے - باہتمام شیخ مدد علی خانہ زاد قدیم امین الدین تحریر نمود - سنہ طبع ندارد - واجد علی شاہ کی زندگی عیش و غم دونو کا مرقع تھی - زمانہ ولیعہدی میں کنگ ایڈورڈ ہفتم نے جو سفر ہندوستان کا کیا تھا اوسمیں لندن ٹائمز کا کارسپانڈنٹ ہم رکاب شاہی تھا - مٹیا برج میں بادشاہ کا حسن خلق دیکھکر اوسنے یہ ریمارک کیا ہے کہ واجد علی شاہ کی ذات میں ایک پرائیوٹ جنٹلمین کے سارے اوصاف جمع تھے - دماغ شاہی نہ تھا -

(۲۱) نشید خسروانی	نواب کلب علی خاں والی رامپور کا دیوان - معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اختر سامنے رکھکر طباعت میں اوسکی نقل اتاری گئی ہے - تقطیع ' حاشیہ ' گلدستے '

خط کی شان وغیرہ بالکل ملتی جلتی ہے - فرق ہے تو تھوڑا - گلدستے چتر اور تاج سے خالی ہیں - بجاے اونکے کلغی ہے - صفحے کی پیشانی پر بڑے دائرے میں دائیں بائیں دو دو بھرتیں اور تلواریں ہیں - بیچ میں لفظ ' اللہ ' اوپر ہے نیچے لفظ ' محمد ' - نشید خسروانی (۱۲۹۱ھ) تاریخی نام ہے - مطبع تاج المطابع رامپور میں ۱۲۹۳ھ میں حسب الحکم نواب صاحب ممدوح چھپا ہے - خوشخط جلی قلم ہے صفحات ۲۸۶ - سطر فی صفحہ ۹ - اول غزلیات ہیں - غزلیات کے بعد ایک سہرا مفردات ' قصیدہ درنعت ' خمسہ بر غزل عاشق اصفہانی ' رباعیات ' مستزاد ' دیوان کے خاتمے پر طبع دیوان کی تاریخیں ہیں - جو نواب خلد آشیاں کی قدردانی و ہنر پروری کی بہار دکھاتی ہیں - تاریخ لکھنے والوں میں امیر لکھنوی ' بحر لکھنوی ' منشی منیر ' مرزا داغ دہلوی ' تسلیم

سہسوانی - تسلیم لکھنوی - امیر لکھنوی - قلق رامپوری بھی ھیں - اور یہ سب کے سب حاضر دربار تھے - ایک تاریخ والے کشن کمار و نار کی ھے - خاتمہ مولوی نجم الغنی قلق رامپوری نے لکھا ھے -

مطلع دیوان ھے -

اللہ رے ذوق مدحت پروردگار کا
عالم زباں میں ھے دل بیقرار کا

حسن مطلع -

زائر ھیں روضۂ شہ رفرف سوار کا
قبلہ ھیں اسلئے میں صغار و کبار کا

بعض اور اشعار -

دل وحشی کو یہ لذت ملی ھے خاک اڑانے میں
مزا جنت میں بھی اوسکو نہ بھولیگا بیاباں کا

شکوۂ درد سر اتنا تجھے نواب ھے کیوں
ھاتھہ ٹوٹے ھیں ترے یا نہیں پتھر پیدا

تم بھلا آؤ تو بن ٹھن کے پئے قتل کبھی
دیکھو کیسا مجھے آتا ھے فدا ھو جانا

واعظو ! دو مجھے مبارک باد
دل لگا ایک نامسلماں سے

واعظ اولجھے تو اور کسی مے پرست سے
سر مست ھوں میں نشۂ روز الست سے

لاکھوں تڑپ کے مرگئے یاں اور ابھی وھاں
ناوک نہیں ھوا ھے رھا اونکی شست سے

جوش وحشت کی ترقی ہے یہی تو دیکھنا
کیا بلا لائیگی آبادی یہ ویرانی مری

(۱۲۸۷ھ) مرزا حاتم علی بیگ مہر اکبر آبادی کا دیوان - نام تاریخی

(۲۲) الماس درخشاں | ہے - ۱۸۹۵ع میں مطبع الٰہی میں باہتمام محمد یعقوب خاں بمقام آگرہ چھپا - زمانہ حال سے اس

دیوان کی سرحد اصلی ہے - لہذا کاغذ اسقدر بودا ہے کہ ہاتھ لگاتے ڈر معلوم ہوتا ہے - پھٹتا نہیں ٹوٹتا ہے - خط بھی اچھا نہیں - اسی مطبع میں اس دیوان سے بعکس ۳۲ برس پہلے دیوان نظیر اکبرآبادی چھپا تھا اُسکے کاغذ کے دم خم اب تک کم نہیں خط دیدہ فریب ہے - مہر ناسخ لکھنوی کے شاگرد ہیں - اُستاد کا رنگ کلام میں صاف عیاں ہے - وفات سنہ ۱۲۹۶ھ مطابق سنہ ۱۸۷۹ع - دیوان ضخیم ہے - پانچ سو (۵۰۰) سے زیادہ صفحے ہیں - فی صفحہ سطر ۱۹ - اشعار قریباً دس ہزار (۱۰۰۰۰) - اول غزلیات - غزلوں کے بعد اشعار متفرق جو دواوین تلف شدہ کے بعد یاد آگئے یا ردیوں میں ملے - مخمسات ' مسدس ' مثلث ' رباعیات ' سراپا ' زائچہ منظوم "حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ لکھنو" - زائچہ کے ان اشعار پر عبرت آنسو بہاتی ہے -

ہمیشہ حشمت و دولت کی ہوگی افزایش
نہوگا فکر و تردد کبھی کوئی زنہار
مدام سلطنت شاہ کو ہے استحکام
نہ پایا راج نے اندر کے بھی یہ استقرار
ہوا تھا بطن سکندر جو مشتری کا محل
تو سارے روے زمیں پر کیا تھا اوسلے حصار

بجائے ناف یہاں بھی وہی ستارہ ہے

نہ ہرنے کا ظلِ اللہ کو کبھی آزاد

آخر میں قطعات تاریخ ہیں - قحط کی تاریخ - ع اک غضب ہے کھئے تاریخ مسیحی قحط کی (۱۸۳۸ع) - میر وزیر علی صبا لکھنوی کی وفات کی تاریخ - ع دور صبا گلشن جنت میں ہے (۱۲۷۱ھ) اِسکے بعد ترتیب دیوان کی تاریخیں ہیں - اِن تاریخوں کے بعد وفات مہر کی -

مرزا حاتم علی مہر کے فرزند آغا سخاوت علی تھے - نواب فدا حسین خاں رئیس فتح گڈھ نے وفات مہر کي کیا خوب تاریخ کہی ، " نام حاتم ماند باقی از سخاوت دایما " ایک تاریخ اور سن لو - اوس زمانے کی یاد تازہ کرو - اور آج کی حالت پر اشک حسرت بہاؤ - " تاریخ انتقال جناب منشی هزاری لال رشکی" -

ھاے اے منشی هزاری لال رشکی ھاے ھاے

دوست تجھسا ، تجھسا یار با وفا جاتا رھا

شعر خوانی نکتہ دانی اوٹھہ گئی دنیا سے آج

شاعري کیا ، لطف هر اک بات کا جاتا رھا

ملکے دو دیوانے اکٹھا بیٹھتے تھے کوئی دم

واے قسمت آج وہ بھی سلسلہ جاتا رھا

ھو گیا اندھیر کیا اے شمع بزم دوستاں

مہر تو ہے تو کہاں اے مہ لقا جاتا رھا

تیري صورت پھرتي ہے آنکھونمیں اے مرزا ملک

کیوں نہ رواں اشک خوں رنگیں ادا جاتا رھا

ھاے رے تیری جوانی ھاے تیرا علم و فضل

نام نامي رہ گیا سب مت گیا جاتا رھا

حسب فرمائش نواب مرزا احمد سعید خاں طالب دہلوی

(۲۳) مشاعرۂ دہلی راقم سنہ ۱۲۹۷ھ | اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع فیروز پور (خاندان لوہارو کے چشم و چراغ تہذیب دہلي کي اخیر جھلک)

مطبع صادرالانوار بہاولپور میں چھپا - یہ مشاعرہ جب ہوا کہ دارالخلافت میں شمع ادب بجھہ چکی تھي - اِسلئے کسي اُستاد کی غزل اسمیں نہیں - ایک بات دیکھنے کی ہے - ایک لوہارو کے خاندان کے اتنے فرد اِس بزم ادب میں جلوہ فرما ہیں - یہ یاد رکھو کہ یہ خاندان امارت ہے - قائم رہے دائم رہے -

(۱) مرزا بہاءالدین خاں باطل (۲) مرزا شجاع‌الدین احمد خاں تاباں (۳) مرزا سراج‌الدین احمد خاں سائل (۴) مرزا مختارالدین احمد خاں مائل - یہ چاروں لخت جگر نواب شہاب‌الدین خاں ثاقب کے ' جو فرزند تھے نواب ضیاءالدین خاں نیر درخشاں تخلص کے اور جنہوں نے باپ کو جوان مرگی کا داغ دیا تھا - اوس زمانے کا ادب انکے ذکر سے معمور ہے -

(۵) مرزا امیرالدین احمد خاں صاحب فرخ خلف نواب علاؤالدین خاں مرحوم علائی تخلص والی لوہارو - پدر و فرزند دونوں - (۶) نواب مرزا سعیدالدین احمد خاں طالب فرزند نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر -

نمونۂ کلام :—

بہاؤالدین خاں باطل -

جنوں کے ہاتھ سے مجبور یہی گر کشمکش ہوگی
ندیکھیگا کوئی اک تار بھی میرے گریباں کا
مزہ آجاے گونہ زخم دل کا جب یہاں آئیں
نشاں ملجاے اونکو یا خدا گھر میں نمکداں کا

پریشانی سے میری پھر کیا عالم پریشاں ہے
بہت دشوار ہے ترتیب پانا بزم جاناں کا
وہ ہمدم رشک جنت کے وہ اک داروغۂ جنت
کہاں رتبہ ہے غیرونکا کہاں پایہ ہے رضواں کا

مرزا شجاع‌الدین خاں تاباں -

اگر وہ منہ اوٹھاکر دیکھتا سوے فلک ہمدم
مقابل شرم سے ہوتا نہ چہرہ ماہ تاباں کا
ہوے ہیں دل کے ہاتھوں دوستو کیسے پریشاں ہم
کہ ہم اک کھیل سمجھے تھے اولجھنا زلف پیچانکا
مگر دیوانگی سے رنگ اچھا پڑگیا میرا
رہا کھٹکا نہ دامن کا نہ خطرہ ہے گریباں کا

مرزا سراج‌الدین خاں سائل -

طبیعت جب اُلجھتی ہے ہزاروں خدشے آتے ہیں
عجب سودا ہے تیرے خال و رخ اور زلف پیچانکا
کہوں کس منہ سے اوسکے لعل لب کا حال روشن ہے
کہ مثل شمع چہرہ زرد ہے لعل بدخشاں کا
عیاں ہونے کے ڈر سے تھی خموشی پر خموشی نے
بیاں سب کردیا چرچا ہے گھر گھر راز پنہاں کا
پڑھایا ہے کسی اُستاد نے اچھے طریقے سے
سمجھتا حرف مہمل ہے وہ اپنا عہد و پیماں کا
نہ نکلی کوئی حسرت کوے جاناں میں بجز اِسکے
کہ ٹوٹا یا فلک ہمسر ہوا یا جور درباں کا

ہزاروں دل ہیں یوں سائل مسلسل زلف مشکیں میں
کہ ہوتا ہے گماں ہر تار پر زنجیر زنداں کا

مرزا ممتازالدین احمد خاں مائل -

الٰہی خیر ہو دلکی بھلا ہو دین و ایماں کا
کہ پھر ہے آج ہمسے سامنا اُس آفت جاں کا
میں فرط خامشی سے مطمع انظار عالم ہوں
نہو ظاہر خدایا راز میرے درد پنہاں کا
رہو خاموش اے مائل تڑپ جائیگی سب محفل
اگر کچھہ تذکرہ آیا تمہارے درد ہجراں کا

نواب مرزا امیرالدین احمد خاں صاحب فرخ والی لوہارو -

نفس سوزاں ہو بارے کسقدر اس سوختہ جاں کا
کہ ہو ہر داغ دل جس کا مقابل مہر تاباں کا
ادا انداز سے کی شب کو رسم رو نما ہم نے
ادھر آنا تھا اونکا بس اودھر جانا تھا ایماں کا
خرابی گھر کی اور وحشت در و دیوار کی اپنی
بتاتی ہے کہ ہے نقشہ یہی دشت و بیاباں کا

مرزا سعیدالدین احمد خاں طالب -

پھنسا جو اوسکے پھندے میں وہ بھولا آشیانہ کو
عجب دلکش نشیمن دام ہے اوس زلف پیچاں کا
جگر پہلو دل و سینہ میں ہے اک کشمکش پیدا
ہدف ہے کونسا کہدو تمہارے تیر مژگاں کا
جنوں اور فصل گل، ہاتھ اب کوئی بیکار رہتے ہیں
رفو ہونا بہت مشکل ہے چاک جیب و داماں کا

۱۳/ ۶۲

زمانے کی حیا سے ہو گیا ہمراہ قاتل بھی
اٹھا جسدم جنازہ طالب مہجور ہجراں کا

ق

کسی نے اس سے یوں پوچھا کہ کسکے ساتھ جاتے ہو
تو بولا ہے جنازہ ایک بیچارے مسلماں کا

کلام بالا سے صاف عیاں ہے کہ غالب کا فیض موج زن ہے -

نواب امین‌الدولہ سیف‌الملک سید آغا علی خاں بہادر فیروز جنگ

۲۳ـــدیوان مہر لکھنوی

متخلص بمہر کا دیوان اول - مہر نواب معتمدالدولہ آغا میر کے خلف اکبر تھے - کانپور میں مقیم - لکھنؤ کی مفارقت میں بیتاب - سلطان عالم واجد علی شاہ کے معاصر و مداح تھے - آغا میر غازی‌الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ سے جلا وطن ہو کر کانپور میں آباد ہوگئے تھے - اوسی سلسلے میں مہر بھی وہاں رہے - آغا میر کی وفات سنہ ۱۸۳۲ع مطابق ۱۲۴۷ھ میں ہوئی (قاموس المشاہیر) مہر کا سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا - ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ع میں زندہ تھے - دیوان ۴۰۱ صفحات کا ہے - خوبی طبع اور خطاطی میں اس زمانے کی طباعت کا اعلیٰ نمونہ ہے - سیرامپوری سپید کاغذ پر جلی قلم سے - فی صفحہ ۱۳ سطریں لکھی ہوئی ہیں - اس سے زیادہ خوشخط مطبوعہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری - غور سے دیکھنے پر بھی قلمی کا دھوکا ہوتا ہے - ایک خصوصیت یہ ہے کہ مطبع کا نام نہیں - نہ اول نہ آخر - گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ خود نواب امین‌الدولہ نے اپنے یہاں طبع کرایا - لوح کتاب دو صفحوں پر ہے - دونوں نقش اور گلکاری سے معمور پر نور - پہلی لوح میں بجائے نام کتاب منحرف سطروں میں تاریخ طبع خود مہر کی کہی ہوئی درج ہے - مادہ تاریخ - ع

دیوان اول مہر مطبوع شد بتزئین (۱۲۶۴ھ)
عنوان میں نام و خطاب مہر ہے -

نیچے کی سطروں میں بجائے نام و مطبع ' آغا میر کا خطاب و نام ہے - اسکے بعد " در ۱۲۶۳ھ حلیۂ طبع پوشید " ہے - دوسری لوح میں متن میں صرف دیوان مہر لکھا ہے - باقی صفحہ گلکار و منقش ہے - شروع میں ۲۰ صفحوں میں قصاید ہیں - بعض منقبت میں - بعض مدح واجد علی شاہ میں - اسکے بعد غزلیات ہیں - اور کوئی صنف کلام نہیں - فارسی کی غزلیں بہت سی اردو غزلوں میں ملی جلی ہیں - مہر بہت پر گو شاعر ہیں - پچیس پچیس شعر کی ایک ایک غزل ہے - کلام اول سے آخر تک بے کیف اور سوز و گداز سے خالی ہے - اور یہ شاید عہد واجد علی شاہی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے - لکھنؤ کی مفارقت میں بہت غزلیں لکھی ہیں - ردیف واو میں لکھنؤ کی ردیف متعدد قافیوں کے ساتھ باندھی ہے - ایک جدت یہ ہے کہ غزل کے مقطعوں میں تاریخ لکھتے جاتے ہیں مثلاً - ایک غزل کا مقطع ہے :—

طرح کی طبع منور کی ہے تاریخ بھی
اک جلا پاتی ہے اے مہر مہرے نام سے صبح
۱۲۵۰ھ

ایضاً - ایضاً -

فرقت لکھنؤ کی ہے تاریخ
مہر سچ ہے ہوں مبتلائے فراق
۱۲۴۸ھ

ایضاً - ایضاً -

مہر کی تاریخ سیر گلگ و بزم عیش ہے
جام مے مطرب شب مہ دلبر و دریاے گلگ
۱۲۴۹ھ

' گلگ ' کی ردیف کی متعدد غزلیں ہیں -

ایضاً - ایضاً -

خواب وصل یار کی یہ عیسوی تاریخ ہے
مہر مہ پیکر وہ میرا شب کو آیا خواب میں
سنہ ۱۸۳۳ع

کانپور کے قیام سے بیزار ہیں لکھنؤ کے لئے بیقرار -

کانپور میں ہم ترستے ہیں ستم ہے قہر ہے
ملک ہندستان کا ہے لکھنؤ سا شہر ہے
کانپور سے کہیں بلائے وطن
جان لے میری یا جلائے وطن

واجد علی شاہ کی نگاہ لطف کے برابر امید وار رہے - قصیدوں میں اور غزلوں میں جا بجا یہ تمنا ظاہر کی ہے - ایک قصیدے کی دعا ہے :—

یہ دعا جلد ہو مقبول مجیب‌الدعوات
مہر کی یاد کرے بادشہ عرش وقار

بعض نئے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں - مثلاً لالٹین -

نہیں برسات میں دل پر داغ
لالٹین اے سحاب روشن ہے

آخر میں مہر علی اوسط رشک کی تاریخ طبع ہے - مادہ تاریخ ہے - ع

زہے کلام بلیغ و زہے زبان زیبا

۱۲۶۳ھ

تاریخ کے بعد کاتب نے اپنا نام لکھا ہے - کتبہ جعفر علی عفی عنہ -

نوٹ—آیندہ کسی صحبت میں انشاءاللہ قلمی دواوین اُردو کا جائزہ لیا جائیگا یار باقی صحبت باقی -

---

شاہ تجلی اور انکا کلام

(از عبدالقادر سروری - ایم ۰ اے)

شاہ تجلی ' جن کا اصلی نام تجلی علی ھے اور عام طور پر تجلی شاہ یا شاہ تجلی ' مشہور ھیں - سودا اور میر کے معاصر اور آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے دربار کے مورخ تھے - شاہ صاحب بڑے با خدا بزرگ ' صوفی اور نیک سیرت عالم تھے - اکثر تذکرہ نویس جو ان کا حال لکھتے ھیں ' انکی سیرت اور باطنی اوصاف کی بڑی تعریف کرتے ھیں -

شمالی ھند کے تذکرہ نویس شاہ تجلی کو اردو شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے - حیدرآباد میں وہ شاعر اور مورخ مشہور ھیں - لیکن درحقیقت ان کو محض شاعر یا مورخ کہنا ' ان کی مختلف‌النوع قابلیتوں کا صحیح اظہار نہیں ھے - عہد آصفی کے علماء کے مقابلے میں شاہ تجلی چند خاص حیثیتوں کے مالک ھیں - اس میں شک نہیں کہ وہ ایک سلجھدہ مورخ اور شاعر ھیں ' لیکن انکی قابلیت کا اھم ترین رخ یہ ھے کہ وہ اچھے مصور بھی تھے - شاعر اور مورخ ھماری قوم نے بہت پیدا کئے ' لیکن اچھے مصور ھر جگہ کم ھی پیدا ھوتے ھیں - یہی خصوصیت شاہ تجلی کی اھمیت میں اضافہ کر رھی ھے -

مصوری کے علاوہ ' اس سے ایک ملحق فن ' یعنی خوش نویسی میں بھی شاہ صاحب کو خاص مہارت تھی - چنانچہ غلام حسین خاں جوھر مولف " تجلیات مہ لقا " (جو " ماہ نامہ " کے نام سے بھی مشہور ھے) نے شاہ صاحب کا ذکر اپنے عہد کے خوشنویسوں اور مصوروں میں کیا ھے -

عہد گذشتہ کے اکثر صوفی منش بزرگوں کی طرح شاہ تجلی کو کبھی کبھی زر گری، آہنگری یا نجاری کے کام کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب جس کام کو ہاتھ لگاتے، اس میں پوری دلچسپی لیتے تھے - اسی لئے صاحب "گلزار آصفیہ" نے شاہ صاحب کا حال لکھتے ہوئے ان خصوصیات کا ذکر ضروری سمجھا - بہر حال یہ چیز بذات خود غیراہم ہے کہ شاہ تجلی کو آہنگری یا نجاری میں کس قدر مہارت تھی؟ ہمارے پاس اسکی اہمیت صرف اسقدر ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی فطرت اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے - شاہ تجلی، فطرتاً آزاد طبیعت اور صوفی منش انسان واقع ہوے تھے -

شعرائے اردو کے تذکرہ نویسوں میں شاہ تجلی کا ذکر، سب سے پہلے میر قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرہ "مجموعہ نغز" (سنہ ۱۲۲۱ھ) میں کیا ہے - [۱] وہ لکھتے ہیں :—

'شـــاہ تجلی علی، وے مـــردے بـــود درویش نہاد در حیدرآباد [بسیار نیک خصلت] خوش (منش نہایت) پاک طینت - پاکیزہ روش - ایں دو شعر از وے است -

دامن کا کس کے عکس پڑا ہے کہ آج تک
پھیلا رہے ہیں ســرو لب جوئبار هـــاتھ
غنچے کی طرح خون جگر پھویں غم میں ہم
پوہنچا [وے] یوں حنائرے پانک نگار "ہاتھ" [۲]

---

[۱]—مرتبہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی مطبوعہ سنہ ۱۹۳۳ ع - سلسلۂ نشریات کلیۂ پنجاب -

[۲]—یہ دونو شعر دفتر دیوانی کے ایک مخطوطہ میں موجود ہیں اس میں قافیہ "ہاتھ" کے بجائے "دست" ہے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ یوں ہے :—
"کھولا ہے سرو نے بلا لب جوئبار دست"

قاسم کو غالباً اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے - اسکا بھی علم نہیں کہ ان کا ماخذ کیا تھا - اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد ' جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے ' شاعر کے حالات اور اسکی شاعرانہ قابلیت کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا ' لیکن اس سے شاہ صاحب کی سیرت کا پتہ چل سکتا ہے - قاسم بعض دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح تحسین و ستایش کے عادی نہیں ہیں ' لیکن شاہ تجلی کی تعریف میں وہ بہت فراخدلی سے کام لیتے ہیں -

حکیم قدرت‌الله خاں قاسم کے بعد عبدالغفور خاں نساخ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور دوسرے اکثر تذکرہ نگاروں نے بھی اپنے تذکروں میں تجلی کا حال درج کیا ہے - لیکن قاسم نے ان کے متعلق جس قدر لکھا تھا اس میں بعد کے تذکرہ نگار کچھ اضافہ نہ کرسکے - بلکہ ایک طرح پر اس میں کمی کردی - مثلاً یہ کہ قاسم نے جو دو شعر نمونے کے نقل کئے تھے بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے ان میں سے صرف آخری شعر نقل کیا ہے -

اردو شعرا کے تذکروں میں تجلی کا حال اگر کہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ملتا ہے تو وہ " محبوب‌الزمن تذکرہ شعرائے دکن " مصنفۂ عبدالجبار خاں ملکا پوری ہے - اس تذکرہ نگار کو شاہ تجلی کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل کرنے کے وسائل تھے جن سے اس نے فائدہ اٹھایا -

خود شاہ تجلی کی درویشانہ طبیعت نے انہیں حتی‌الامکان نام و نمود کی خواہش سے دور رکھا - ورنہ یہ ممکن تھا کہ جہاں انہوں نے نواب میر نظام علی خاں کے عہد کی ایک مفصل تاریخ لکھی ہے ' اسی کے ضمن میں یا علحدہ اپنے حالات یا علمی ذوق کے متعلق بھی بہت

کچھ لکھ سکتے تھے - فی الوقت تجلی کی زندگی کے حالات سے ، صرف چند واقعات ملتے ھیں جو انہوں نے اپنی تاریخ " تزک آصفیہ " کے ضمن میں برسبیل تذکرہ لکھ دئے ھیں - یہی دراصل ان کی زندگی کے حالات کا سب سے بڑا ماخذ ھے -

اس عہد کی تاریخوں میں سے صرف " تجلیات مہ لقا " (سنہ ۱۲۲۸ھ) میں شاہ تجلی کا ذکر خوش نویس اور مصور کی حیثیت سے کیا گیا ھے - اور فارسی نظم و نثر میں ان کی معلومات کی تعریف کی گئی ھے - اس کے بعد " گلزار آصفیہ " (سنہ ۱۲۵۸ھ) میں کسی قدر تفصیل سے حالات درج کئے گئے ھیں -

شاہ تجلی کی ولادت کا ٹھیک سنہ معلوم نہیں - لیکن " تزک آصفیہ " کی ایک عبارت سے پتہ چلتا ھے کہ وہ تقریباً اسی سال پیدا ہوئے جس سال آصف جاہ اول نواب میر قمرالدین خاں بہادر کا انتقال ہوا - صلابت جنگ کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی ان کے معتمد علیہ مسمی رام داس پنڈت کی تحریک پر ، بالا جی پیشوا اور صلابت جنگ میں پونا کے قریب جو معرکہ ہوا تھا اس کے ضمن میں شاہ تجلی نے لکھا ھے کہ اس وقت میری عمر تیرہ سال کی تھی اور میں اپنے ماموں کے ساتھ اس معرکہ میں موجود تھا - ان کی عبارت حسب ذیل ھے :—

" بحسب اتفاق فقیر نیز بعمر سیزدہ سالگی بہمراہ خال خود کہ برفاقت خواجہ محمد اشرف خاں بہادر نبیرہ نواب مبارز خاں عمادالملک بہادر حاضر بود ، ایں همہ جنگ و پیکار بچشم خود دیدہ......" (ص ۹۳)

یہ جنگ سنہ ۶۵–۱۱۶۴ھ میں ہوئی تھی - اس لحاظ سے شاہ صاحب کی پیدایش کا سنہ ۱۱۵۱ھ یا سنہ ۱۱۵۲ھ مقرر ہوتا ھے -

اس واقعہ کے بعد تاریخ مذکور میں اکثر جگہ ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب میر نظام علی خاں بہادر کے عہد میں جتنی جنگیں ہوئیں ان میں سے اکثر میں شاہ صاحب موجود تھے - کئی لڑائیوں کی تاریخیں بھی کہہ کر حضور میں پڑھی گئی تھیں - بزم آرائیوں کے موقع پر وہ عموماً بندگان عالی کے ساتھ رہے -

رگھو ناتھ راؤ نے نارائن راؤ پیشوا کو قتل کرکے جب پونا کی حکومت پر خود قبضہ کر لیا تو اس کے دل میں حیدرآباد سے لڑائی کرنے کی سمائی - ایک لاکھ کے قریب فوج تیار کرکے وہ روانہ ہوا - اس خبر کے مشہور ہونے سے خاص و عام میں بے چینی سی پھیل گئی - شاہ صاحب اپنی فوجوں کی فتح و نصرت کے لئے ترک غذا کرکے وظائف اور ادعیہ میں مشغول رہے ' اس کا ذکر تاریخ کے صفحہ ۲۲۲ پر کیا ہے -

محمد علی والا جاہ کے خلاف جو فوج خود آصف جاہ ثانی کی ہمرکابی میں روانہ ہوئی تھی ' اس کے حال میں لکھا ہے کہ موضع کدری کوتہ سے گذرتے ہوئے ایک ایسی قبر نظر آئی جس پر دو تعویذ بنے ہوئے تھے - اہل موضع سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ابراہیم عادل شاہ کے عہد کے مشہور دلدادگان الفت " چندر بدن اور مہیار " کی قبر ہے [۱] -

سنہ ۱۲۰۴ھ میں پانگل پر فوج کشی ہوئی تھی اس میں نواب نظام علی خاں کے ساتھ شاہ صاحب بھی موجود تھے -

مذکورہ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ تجلی کا نشو و نما ابتدائے سن شعور سے درباری حلقوں میں ہوا - ان کی ابتدائی تربیت غالباً ان کے ماموں کے سایہ عاطفت میں ہوئی- ان کی علمی قابلیت کا اندازہ خود ان کی تاریخ سے

---

[۱]— " تزک آصفیہ " صفحہ ۱۵۲ -

ہوسکتا ہے، جو نہایت رواں اور دلچسپ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ اور ایک در عبارتیں جو خاص موقعوں پر لکھی گئی ہیں ان کی علمیت کا اچھا ثبوت ہیں - دیباچہ تصوف اور سلوک کے اعلیٰ نکات اور کیفیات سے مملو ہے - عبارتوں میں سے ایک عبارت سیف الملک مالی مهارکی شادی کی تقریب پر لکھی گئی ہے - دوسری آصف جاہ ثانی کی سالگرہ (سنہ ۱۲۰۳ھ) کے موقع پر - یہ عبارتیں معنی آفرینی اور خیال بندی میں فارسی کی مشہور عبارتوں کی ٹکر کی ہیں -

خوش نویسی میں شاہ تجلی، شاہ معین الدین تجلی کے شاگرد تھے - موخرالذکر کے کمال فن کا ذکر صاحب "گلزار آصفیہ" مصنف "تجلیات مہ لقا" اور بعض دوسرے تذکرہ نگاروں نے نہایت احترام سے کیا ہے - شاہ تجلی غالباً استاد کی شہرت کو تو نہ پہنچ سکے - لیکن اپنے زمانہ کے اچھے خوشنویسوں میں شمار ہوتے تھے - ان کے قطعات امرا اور دوسرے لوگ خواہش سے خریدتے تھے -

افسوس ہے شاہ تجلی کی مصوری کے نمونے باوجود تلاش کے راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوسکے - ان سے دکن کی مصوری کے دبستان پر بہت کچھ روشنی پڑنے کی توقع ہے - تجلی نے کئی تصویریں بنائی تھیں - سنہ ۱۱۹۱ھ کے جشن نو روز کی تقریب میں آصف جاہ ثانی نے ' اُن سے اپنی تصویر بنانے کی فرمایش کی تھی - جس کی تعمیل میں شاہ صاحب نے تصویر کھینچی، جو "گلزار آصفیہ" کے مصنف کے بیان کے مطابق حضرت آصف جاہ ثانی کے قد کے برابر تھی اور بیش قیمت جواہرات سے مزین - خود تجلی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے -

"دریں سال (سنہ ۱۱۹۱ھ) مبارک فال، فقیر، مولف ایں آصف نامہ را حکم عالی نفاذ پیوست کہ شبیہ مبارک

خود ' به کلک ندرت سلک تحریر کاد بتوسط شمس الدولہ بہادر ' با ایں ہمہ جشن فریدونی.' با محبوبان طناز و محفل ناز از نزاکت پرداز برنگ مصوران فرنگ در صدوقچہ رنگا رنگ کشیدہ : بنظر اقدس گذرانیدہ مورد عنایت و تحسین گردید " (ص ۲۶۰) -

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ تجلی نے فرنگی یعنے مغربی مصوروں کے نمونوں کا بھی مطالعہ کیا تھا - اور اس کا اثر بھی ان پر پڑا تھا - چنانچہ مذکورہ بالا تصویر میں مغربی اثر کی بھی آمیزش تھی -

تصویر کے صلہ میں شاہ تجلی کو سرکاری خزانہ سے پانچ ہزار روپیہ عطا کئےگئے- اس تصویر کی کامیابی نے تجلی کی قدر و منزلت دربار اور امرا میں بہت بڑھا دی تھی - چنانچہ اُن کی لڑکی کی شادی میں حضرت غفران مآب خود بدولت تشریف فرما ہوئے تھے - اور نقد اور جواہرات کی صورت میں پچاس ہزار کا سلوک فرمایا -

اس سلوک مسلوک کا ذکر مصنف " گلزار آصفیہ " اور دوسرے مصنفین نے " تزک آصفیہ " کی کامیابی کے طور پر کیا ہے - حالانکہ " تزک آصفیہ " اس فیاضانہ عطیہ کے نو دس سال بعد لکھی گئی -

شاہ تجلی کی اولاد کے متعلق صرف اس قدر معلومات بہم پہنچے ہیں کہ ان کے ایک فرزند، محمد مرزا نامی تھے جو مرزا تخلص کرتے تھے - اور حضرت ناصرالدولہ بہادر کے عہد میں صدارت کے عہدہ پر مامور تھے [۱] - ایک لڑکی تھی جس کا ذکر خود شاہ تجلی نے " تزک آصفیہ " میں کیا ہے - اسی لڑکی کی شادی کی تقریب میں نواب میر نظام علی خاں بہادر تشریف فرما ہوئے تھے - یہ لڑکی سنہ ۱۱۹۸ھ میں میر مرتضی سے بیاہی

---

[۱] —" گلزار آصفیہ " صفحہ ۳۸۳ -

گئی تھی - شادی کے دوسرے سال میر مرتضیٰ چار صدی منصب اور خانی کے خطاب سے سرفراز ہوئے -

شاہ صاحب کی زندگی کا نصف آخر ' ان کے عروج کا زمانہ تھا - دربار کے امرا ان کی بڑی عزت کرتے تھے - ارسطو جاہ ' شمس الامرا ' سردارالملک گھانسی میاں' راجہ رگھوتم راؤ اور دوسرے اعیان دولت اور خود رئیس وقت شاہ صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے - سردارالملک گھانسی میاں کو شاہ صاحب سے خاص انس تھا - انہیں کے ساتھ اکثر شاہ صاحب رہا کرتے تھے - فطرتاً وہ ظریف طبع واقع ہوئے تھے - اس لئے لوگ ان کی صحبتوں میں مسرت سے شریک ہوتے تھے - مذکورہ بالا امرا اور خود بلندگان عالی انہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے -

شاہ صاحب نے " تزک آصفیہ " کی ترتیب سنہ ۱۲۰۷ھ سے شروع کی - سنہ ۱۲۰۸ھ میں اس کو ختم کر دیا - مکمل ہونے کے بعد ارسطو جاہ اعظم الامرا نے اس کو حضرت غفران ماب کے ملاحظہ میں پیش کیا - آپ نے اسے بہت پسند فرمایا - اس کی ترتیب کے صلہ میں شاہ تجلی کو کافی روپیہ ملا - ارسطو جاہ نے امرا اور اراکین دربار سے پچاس ہزار کی رقم جمع کرکے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کی - اس کے تھوڑے عرصہ بعد راجہ رگھوتم راؤ پیشکار نے " تزک آصفیہ " کو نفیس نستعلیق خط میں با تصویر لکھوایا - شاہی محفلوں اور لڑائیوں کے اس میں کئی مرقعے تھے - اس کے نسخہ کی طلائی جدولوں کی تیاری اور تصاویر کی رنگ آمیزی کے لئے راجہ موصوف نے اپنی ذات سے تین ہزار روپیہ صرف کیا تھا - یہ نسخہ مکمل ہونے کے بعد حضوری کتب خانے میں داخل کیا گیا - " گلزار آصفیہ" کے مصنف بیان کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کی ترتیب کے وقت سنہ (۱۲۵۸ھ) وہ سرکاری کتب خانہ میں موجود تھا -

یہ عجیب بات ہے کہ اللہ لچھمی ناراین شفیق اورنگ‌آبادی نے بھی اپنی تاریخ " مآثر آصفی " اسی زمانے میں لکھی جس زمانہ میں شاہ تجلی " تزک آصفیہ " لکھ رہے تھے ' دونوں تاریخیں ایک ہی سال یعنی سنہ ۱۲۰۸ھ میں ختم ہوئیں ' لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی دوسرے کا ذکر نہیں کیا -

" تزک آصفیہ " نواب میر نظام علی خاں کے عہد کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے - اس میں شک نہیں کہ " مآثر آصفی " بھی ٹھیک اسی عہد کی تاریخ ہے ' لیکن " مآثر " کے مقابلہ میں اس تاریخ کی اہمیت زیادہ ہے - اس میں واقعات عنوانوں کے تحت زیادہ تفصیل کے ساتھ اور زیادہ نفیس پیرایہ میں لکھے گئے - اس زمانہ کے معاشرتی حالات کے متعلق اس میں جگہ جگہ اشارے ملتے ہیں - سالگرہ کے جشن یا دوسری تقریبوں کے حالات مصنف نے چشم دید لکھے ہیں - دربار کے شعرا اور علما کا ذکر کہیں کہیں آ جاتا ہے - بہ حیثیت مجموعی " تزک آصفیہ " زیادہ دلچسپ ہے -

یہ تاریخ میر احمد علی موسوی کے اہتمام سے سنہ ۱۳۲۰ھ میں ' مطبع آصفی حیدرآباد دکن میں چھپی تھی ' لیکن اب عام طور پر بازار میں نہیں ملتی -

شاہ تجلی کا انتقال ' " ماہ نامہ ' کی ایک تحریر کے بموجب جو ان کے حالات میں ' حاشیہ پر سرخی سے لکھی ہوئی ہے ' سنہ ۱۲۱۵ھ میں ہوا - اسی سنہ میں فارسی اور اردو شعرا کے وہ تمام افکار جو سنہ ۱۱۹۴ھ سے لیکر اس سنہ تک مختلف شعرا نے ارسطو جاہ کی مدح یا ان کی دوسری تقریبوں کے سلسلہ میں لکھ کر پیش کئے تھے ' اسمعیل یار جنگ کے استصواب سے ایک جا جمع کئے گئے - اور شاہ تجلی نے فارسی

میں اس کا مقدمہ لکھا - اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دفتر دیوانی و مال سرکار عالی کے کتب خانے میں موجود ہے -

شاہ تجلی فارسی کے نہ صرف اچھے انشا پرداز تھے ' بلکہ شعر و سخن سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی - فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں وہ شعر کہتے تھے - ان کے فارسی اشعار " تزک آصفیہ " میں جا بجا ملتے ہیں - ان اشعار کے علاوہ کئی قصیدے ' قطعے' ترکیب بند وغیرہ دفتر دیوانی کے نسخہ میں ملتے ہیں - یہ ارسطو جاہ سے متعلق ہیں - قطعات عموماً مختصر ہیں - بعض جو کسی قدر طویل ہیں اور جن میں بہاریہ منظر پیش کئے گئے ہیں ' دلچسپ ہیں - ذیل میں نمونے کے طور پر ان کے دو قطعے درج کئے جاتے ہیں :—

۱—آمد بہار سطح جہاں لالہ زار شد
از عکس گل چو مہر ہوا زرنگار شد
گلہا نگ عندلیب بصد جوش سر کشید
رنگین شگوفہ جلوہ گر از شاخسار شد
گل می کند ز بلبل تصویر جوش شوق
از بوے غنچہ باد صبا مشکبار شد
از انبساط اعظم امرا عروس فتح
پیوستہ چوں بتان دکن ہمکنار شد
ہم بزم گثر تست تجلی و حسن و عشق
رویش عیاں چو گشت جلوش آشکار شد

۲— بزمے مرتب شد، الملة للہ — عیش و طرب افزا
این بہجت تو ذالک قد جاء من اللہ — اے اعظم امرا

فر مود بمن پیر خرد گشت دریں سال | فی احسن تقویم
بسم‌الله ایں ماہ قدم سلمہ‌الله | از سورۂ اقرأ

ارسطو جاہ کے فرزند سیف‌الملک مالی میاں کے انتقال پر ایک طویل اور پر درد مرثیہ بھی لکھا ہے - اس کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسطو جاہ کے ساتھ شاہ صاحب کو کس قدر لگاؤ تھا -

صنعت نگاری میں بھی شاہ تجلی کی طبیعت خوب رواں تھی - ایک قصیدہ لکھا ہے " حق ترا ایں ہمہ عنایت کرد " - اس میں یہ التزام کیا ہے کہ اس کے ہر مصرعہ سے سنہ ۱۲۰۴ھ نکلتا ہے - قصیدوں کی تشبیبیں عموماً بہاریہ لکھتے ہیں - ان کے پڑھنے سے تغزل کا لطف آتا ہے - قصیدوں کے درمیان کہیں کہیں غزلیں بھی آجاتی ہیں -

شاہ تجلی اردو میں بھی اچھے شعر کہتے تھے - چنانچہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر اردو کے شاعر کی حیثیت سے کیا ہے - اس فن میں انہیں استادی کا درجہ بھی حاصل ہوا - دکن کے بعض مشہور شاعر ' جو اپنے زمانے کے استاد سمجھے گئے ہیں ' شاہ تجلی کے شاگرد رہ چکے ہیں - ان میں سے دو ' یعنی محمد داؤد ہنر اور شیر محمد خاں ایمان کا ذکر خود شاہ صاحب نے اپنی تاریخ میں برسبیل تذکرہ کیا ہے - ایمان کے متعلق سری رنگ پٹن کی فتح کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :— " شیر محمد خاں ایمان کہ گل سر سبد تلامذۂ ایں مولف است ایں قطعہ تاریخ بنظر عالی منظر بگذرا نید " (ص ۴۲۱) -

راقم‌السطور کو تلاش کے با وجود ان کی غزلوں کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوسکا -

جو دیوان عام طور پر شاہ تجلی علی کا مشہور ہو گیا ہے ' وہ در اصل میر حسن عرف میر حاجی تجلی کا ہے - یہ میر تقی میر کے

خواہر زادہ اور شاگرد، محمد حسین کلیم کے فرزند اور مصحفی کے معاصر تھے۔ ان کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی میں (نمبر ۱۰۴) پر بعنوان "دواوین اردو" موجود ہے - لیکن کتب خانہ کی مطبوعہ سرکاری فہرستوں میں یہ دیوان شاہ تجلی کے نام سے منسوب ہے - جناب سراج الدین صاحب طالب نے رسالہ "تحفہ" (حیدرآباد دکن) بابت سنہ ۱۹۲۱ع میں شاہ تجلی کے متعلق جو بسیط مضمون تحریر کیا تھا، اس میں بھی دیوان صاحب موصوف کے پیش نظر تھا - اور اسی سے شاہ تجلی کی شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں -

کتب خانہ آصفیہ کا محولہ دیوان، میر تقی میر کی شاعری کا پرتو معلوم ہوتا ہے - غزلوں میں جابجا ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ شاعر دہلی کا رہنے والا ہے - مثال کے طور پر ذیل کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں :—

قطعہ

دلی کے بانکے لڑکوں سے دیوے خدا پناہ
اگ چلتا تھا میں ان سے بہت اب حذر کیا
تک دیکھنے پہ سیف گھسیٹی کل ایک نے
نا چار عاجزی سے یہ سہلہ سپر کیا
کہنے لگا کہ جا بے چلا جا کہ خیر تھی
میں نے خدا سے ڈر کے ابھی در گذر کیا

دل دیا جس کو دل آزار ستمگر نکلا
ساری دلی پھرے دلخواہ نہ دلبر نکلا

کہا شہر دل کا حال کہوں گر یہی ہے ظلم
دلی کی طرح دیکھو وہ بھی ہوا خراب

طوالت کے خوف سے انہیں اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے - غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف میں بھی اسی طرح کے اشارے موجود ہیں - " در مرثیہ استاد " کے عنوان سے ایک ترکیب بند لکھا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے والد ہی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے - چنانچہ اسکا آخری شعر ہے :—

"کہ سینہ چاک ہے چوں خامہ اور دل ہے دونیم
برنگ طور جلے ہے جگر بغیر کلیم "

اصل دیوان کے اختتام کے بعد لکھنؤ کے امام باڑہ کی تعریف میں ایک مخمس ہے ' جس میں نواب آصف‌الدولہ کے مصرعہ "سجدہ اگر ادھر ہے تو اودھر سلام ہے " کی تضمین کی گئی ہے -

ان شواہد کے علاوہ ایک اور بڑا خارجی ثبوت یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے میر حاجی کلام کے ذکر میں جو شعر نمونے کے نقل کئے ہیں وہ سب اس دیوان میں موجود ہیں - اور شاہ تجلی کے جو اشعار تذکروں میں پیش کئے گئے ہیں ' وہ اس دیوان میں موجود نہیں ہیں -

مذکورہ بالا شہادتوں سے یہ قطعاً ثابت ہے کہ کتب خانہ آصفیہ کا دیوان شاہ تجلی علی مصنف " تزک آصفیہ " کا نہیں ہے - صرف ایک امر ثبوت طلب ہے - کتب خانہ آصفیہ کے دیوان کے حاشیہ پر بھی جابجا غزلیں لکھی ہوئی ہیں - جو بعد کا اضافہ ہیں - اس کا امکان ہے کہ حاشیہ کی غزلیں تجلی علی کی ہوں - جب دیوان ہی شاہ تجلی کا تصور کیا گیا تھا تو اس کے حاشیہ پر ان کی غزلوں کا درج ہو جانا کوئی بعید از قیاس چیز نہیں ہے - لیکن اسکا تصفیہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا

جب تک شاہ تجلی کی غزلوں کا کوئی مجموعہ نہ دستیاب ہو جائے - یا میر حاجی تجلی کے دیوان کا کوئی اور نسخہ فراہم نہ ہو جائے - اس وقت میر حاجی کے دیوان کا صرف یہی ایک نسخہ مل سکا ہے - اس مضمون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات آئندہ اس پر مزید روشنی ڈال سکتے ہیں -

شاہ تجلی کے چند اردو قصیدے ' قطعے اور مسمط ' دفتر دیوانی کے مخطوطے میں موجود ہیں - یہ درحقیقت انکی مدحیہ شاعری کا نمونہ ہیں - مدحیہ شاعری میں ہمارے پاس عظمت اور شکوہ کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے - تاہم تجلی کا طرز بیان سلیس اور سادہ ہے - اس میں شک نہیں کہ فارسی قصیدہ نگاروں کے اثر کے تحت وہ مبالغوں سے بھی کام لیتے ہیں ' لیکن عام طور پر وہ سچے جذبات کا اظہار کرتے ہیں ' کیونکہ مدح انہوں نے یا تو بلدگان عالی کی لکھی یا ارسطو جاہ کی - ان دونوں کی ذات سے شاہ صاحب کو محبت تھی - ان کے قصائد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے محسنوں کے احسانات کا اعتراف کر رہے ہیں - قصاید اور طویل نظموں میں ' تجلی عموماً بہار کی تشبیبیں باندھتے ہیں - ذیل میں ان کی تشبیب اور مدح کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں - جس سے ان کی اردو شاعری کی نوعیت کا اندازہ ہو سکیگا -

(۱) ہولی اور نوروز کیا توأم مل آئے اب کے سال
جوش سے روئیدگی کے اٹھ گئے ہے اعتدال
بھول عادت نامیہ اپنی نکالی اور چال
سبزہ خوابیدہ طوطی سا اڑے ہے کھول بال
بلبل تصویر سے پرواز کا ہے احتمال
عکس آئینہ عجب نیں ہے کرے جو قیل وقال

رنگ گل سے ہے حباب موج فانوس خیال
دیکھئے کیا ہو دوانوں کا یہ موسم میں مآل
موج گل دام پری شد مژدہ اے مجنوں وشاں
می برد سہل جنوں بنیاد زہد زاہداں
بسکہ شبنم سے برستے ہیں گلستاں میں گہر
کھول کر دامن کو اپنے گل کھڑے ہیں منتظر
شعلہ گل پر گرے پروانہ ہر دم جھوم کر
شمع جلتی ہے اسی حیرت سے تا وقت سحر
ہو گیا نظارہ غرق رنگ گلشن تا کمر
ڈوب جاویگا کہیں گلچیں، قدم آہستہ دھر
عطر مجموعہ چنبیلی موتیا شیشوں میں بھر
واسطے نواب ارسطو جاہ کے لے آئیں گھر
شد معطر یکقلم کاشانۂ کے منظری
غنچہ مینا گر شد و گلگشت وقف ساغری

(۲) ہیں اب کے ایک سال میں پیدا بہار دو
اک گل پہ جھوم جھوم گرے ہے ہزار دو
گل کوئی، شمع کوئی سمجھ بلبل و پتنگ
قرباں ہیں صبح و شام بصد اضطرار دو
موج نسیم آئینۂ آبشار سے
صیقل سا صاف کر دیا رنگ غبار دو
یہاں تک نمو کا زور ہے نکلے زمیں کو چیر
یک بیج سے گلوں کے ہرے شاخسار دو

ٹک کھول زلف مکھڑے پہ اے رشک مہرو ماہ
دیکھوں میں ایک صفحہ پہ لیل و نہار دو
ایسی غزل کی طرح کروں اور لیوں میں
ہر بیت کے صلہ میں در شاہوار دو

....

....

دینے کو نذر دست ' شتابی اے باغباں
گلدستہ باندھ لیکے رگ گل سے تار دو
گھر گھر میں جلکی سالگرہ کا ہے انبساط
بیٹھے ہیں آج جشن میں مل شہر یار دو
اک ہے مہ کیانی و دوم رئیس ملک
فرق شہنشہی کے ہیں در ' افتخار دو
جلکی گرہ کے دینے برس گانٹھ کے ہزار
لاوے ہے مہر خط شعاعی کے تار دو
دریا سے لیکے کاں تلک خشک و تر کے بیچ
بذل و عطا سے ان کے ہیں یہ شرمسار دو
خوان فلک میں صبح و مساسیم وزر کو بھر
خورشید و ماہ آتے ہیں بہر نثار دو
دہشت سے جن کی تیغ دو دم کے مخالفین
ہو جاویں چار ٹکرے جو ہیں کوہ وار دو

....

....

ہوتے ہی صبح میں جو گیا سیر باغ کو
دیکھوں کھلے ہیں وہاں چمن لالہ زار دو
خوش قد ' مثال سرو چمن جوئبار پر
بیٹھے ہیں رشک باغ ارم طرح دار دو
تھا بہروری کا آب رواں کا سا زمزمہ
بجتے تھے ایک سر میں رباب و ستار دو
تاریخ جشن سالگرہ با دعائیہ
گاتے تھے بیٹھ مصرعہ یہ آب دار دو
جب تک ہیں نیرین فلک حق کے فضل سے
دائم رہیں یہ سالگرہ بے شمار دو
شاہا ترے کرم سے ادا ہو گیا یہ فرض
باقی ہیں تحت اس سے جو ہیں قرضدار دو
امید ہے تجلی مداح کو ترے
اتریں شتاب سر سے جو رہ گئے ہیں بار دو

دفتر دیوانی و مال کے هندستانی مخطوطات

(از سید نصیرالدین هاشمي ، حیدرآباد دکن)

دفتر دیوانی و مال سرکار آصفیه (حیدرآباد) کاهسٹاریکل رکارڈ
س هے -

یہاں نه صرف سرکار آصفیه کے قدیم دفتری کاغذات محفوظ هیں ،
که شاه جہاں ، اور عالمگیر کے عہد حکومت کے کاغذات بھی پائے جاتے
ں - هندوستان کے کسی دوسرے رکارڈ آفس میں مغلیه عهد کا ایسا
خیرہ موجود نہیں هے - یه دفاتر یہاں اولاً منتشر حالت میں مختلف
محاب کے تحت تھے ، اب ان کے بڑے حصه کو ایک جگه منظم کر دیا
یا هے - سلطنت آصفیه کے کاغذات کی ابتدا سنه ۱۱۳۱ھ سے پائی جاتی
ہ ، اور تقریباً دو صدی تک کے کاغذات یہاں موجود هیں -

اس دفتر کے متعلق ایک کتب خانه قائم هے ، جس میں عربی ،
ارسی ، هندستانی اور انگریزی زبان کی کتابیں فراهم کی گئی هیں ،
ن میں مطبوعه اور قلمی دونوں شامل هیں - اس وقت تک جتنی قلمی
کتابیں جمع هوچکی هیں اُن میں ۳۹۴ عربی فارسی هیں اور ۲۴
هندستانی - یہاں انهیں ۲۴ هندستانی مخطوطات کي فهرست پیش کی
جاتي هے - فهرست کي ترتیب بجائے فن کے زمانه تصنیف کے لحاظ سے
قائم کی گئی هے -

(۱) نورس

ورق (۳۶) سطر (۷) خط نسخ نهایت عمده ، جدول طلائی -
قلم -

مصنف : ابراهیم عادل شاہ المتخلص بہ ابراھیم - تاریخ تصنیف درمیان سنہ ۱۰۰۵ھ و سنہ ۱۰۲۲ھ تاریخ کتابت : درج نہیں ہے - کاتب عبداللطیف جو خوش نویسی میں سلطان کا استاد تھا -

سلطان ابراھیم عادل شاہ ' بیجا پور کے عادل شاہی خاندان کا چھٹا حکمران تھا - جو سنہ ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا ' اور ۴۹ سال کی طویل حکمرانی کے بعد سنہ ۱۰۳۷ھ میں انتقال کیا ' بیجا پور میں مدفون ہے -

سلطان ابراھیم علوم و فنون کی سرپرستی کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہے - اُس کے علمی ذوق و شوق کے باعث بڑے بڑے علما اور شعرا اُس کے زمانے میں بیجاپور میں جمع ہوگئے تھے' سلطان خود بھی ذی علم اور زبردست شاعر تھا - فارسی ' ھندی اور ھندستانی زبانوں میں شعر کہتا تھا -

موسیقی سے بھی اُس کو دلی رغبت تھی - اُس زمانے کے مشہور گویے بیجا پور میں جمع تھے ' زیر بحث مخطوطہ بھی اسی موسیقی کی یادگار ہے ' اس میں ھندی زبان میں بعض راگنیوں کے عنوانات کے تحت نظمیں لکھی ھیں -

اب تک خیال یہ تھا کہ " نورس " فن موسیقی کی کتاب ہے اور اُس میں راگ راگنیوں کی تفصیل و تشریح درج ہوگی - مگر اس نسخے کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اُس میں ھندی راگ راگنیوں کے اقسام یا اُن کے قواعد و ضوابط درج نہیں ھیں ' بلکہ بعض راگوں کے عنوانات کے تحت ھندی نظمیں لکھی گئی ھیں [۱] -

---

[۱] — اس کے لئے ہم سراج الدین طالب صاحب کے ممنون ہیں -

سلطان کو لفظ " نورس " سے بڑا اُنس تھا - چنانچہ سنہ ۱۰۰۵ھ میں نورس کے نام سے اس نے ایک قلعہ بھی تعمیر کیا - سنہ ۱۰۱۳ھ میں ایک شہر نورس پور کے نام سے آباد کیا - شاہی مہر پر " نورس " کندہ تھا - سکے پر نورس مضروب ہوتا تھا ' درباری شاعر عبدالقادر کو "نورسی" تخلص عطا ہوا تھا - ہر سال ایک جشن نورس کے نام سے کیاجاتا تھا - اسی مناسبت سے سلطان نے اپنی تصنیف کا نام بھی نورس رکھا -

دفتر دیوانی کا زیر بحث مخطوطہ شاہی کتب خانے کا اصل نسخہ ہے - اس پر سلطان کے دستخط ہیں اور شاہی مہر بھی ثبت ہے ' سنہ ۱۰۲۲ھ میں یہ مخطوطہ بیجاپور کے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوا ہے -

کتاب کی ابتدا یوں ہوئی ہے :—

دوھرا

نورس سور جگ جوں سر و کلی
یوست سرسنی ماتا ابراھیم‌پرساد بھکتی دونی

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:—

شمامی عنبر بتیاں پھرائے   شربت کھول امرت پلائے
بادل دمامے بجلیاں بجاوے   باجی خالو شتابی آنے پاوے

سہلا نورس کلیاں بدھاوے
ابراھیم گـر کلی کا وے

آخر میں " کمترین شاگرد عبداللطیف " لکھا ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کاتب نسخہ عبداللطیف سلطان کا استاد تھا - کیوں کہ اس زمانے کے آداب شاہی کے لحاظ سے استاد اپنے کو "شاگرد " لکھتے تھے' اور نام کے ساتھ " استاد " کا لکھنا سوے ادب میں داخل تھا -

نورس کے نسخے حسب ذیل مقامات پر موجود ھیں ' لہٰذا یہ کتاب ھنوز طبع نہیں ھوئی ھے :

(۱) عجائب خانہ حیدرآباد دکن (اس پر راقم کا ایک مضمون رسالہ معارف میں شائع ھو چکا ھے) -

(۲) کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر -

(۳) کتب خانہ آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج -

دفتر دیوانی کا زیر بحث مخطوطہ شاھی کتب خانے کا نسخہ ھونے کے باعث خاص طور سے قابل قدر ھے -

(۲) تحفہ دکھنی

ورق (۵۵) سطر (۱۵) خط نسخ معمولی - نظم -

مصنف : " راضی " - تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۳۵ ھ

سنہ کتابت درج نہیں ھے - نام کاتب درج نہیں ھے -

" راضی " کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ھیں ' یہ معلوم نہیں اُس کا نام کیا تھا ؟ کب پیدا ھوا ؟ اور کب اس نے وفات پائی ؟ البتہ کتاب کی تصنیف کے سنہ سے معلوم ھوتا ھے کہ " راضی " عبداللہ قطب شاہ (سنہ ۱۰۳۵ ھ تا سنہ ۱۰۸۳ ھ) کے عہد سے تعلق رکھتا ھے - اپنے مرشد یعنی شاہ ابوالحسن [۱] کے حکم سے تحفۃالنصائح کا ترجمہ فارسی سے دکھنی زبان میں کیا -

مولف " اردوے قدیم " کے بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ اس نے قطبی کا تخلص بھی کبھی اختیار کیا ھے - یہ مثنوی اخلاق اور تصوف کے مسائل پر مشتمل اور ۲۵ باب پر منقسم ھے - فارسی میں اس مثنوی

[۱] شاہ ابوالحسن قطب شاھی عہد میں زندہ تھے' شاہ حیدر ثانی کے مرید اور خلیفہ تھے' خاموش کے لقب سے موسوم تھے - سنہ وفات کا علم مولف " اولیاء دکن " کو بھی نہیں ھے مولف نے ص ۹۱ و ۹۲ پر آپ کا ذکر کیا ھے -

کا نام تحفۃالنصائح تھا - اور یہ خواجہ یوسف راجو حسینی کی تصنیف ہے ' جو سید محمد حسینی گیسو دراز کے والد تھے - اور ان کا انتقال سنہ ۷۳۱ھ میں ہوا ہے' انھوں نے تحفۃالنصائح کو اپنے فرزند کے لئے تصنیف کیا تھا - [۱]

"تحفۂ دکھنی" کے مخطوطہ پر حسب ذیل عبارت بھی درج ہے :—

" این کتاب بزبان دکھنی تحفۂ حضرت شاہ راجو قتال "

خواجہ یوسف راجو حسینی کی مثنوی تحفۃالنصائح کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں بھی موجود ہے - (نمبر ۹۰ اخلاق فارسی) شاہ یوسف حسینی ' " راجو قتال " کے لقب سے مشہور تھے [۲] -

زیر بحث مثنوی کے بعض " باب " یہ ہیں :—

توحید ' ایمان ' عقائد ' عمل و علم تعلیم ' نماز ' زکاۃ ' روزہ ' حج ' تلاوت قران ' نکاح ' آداب طعام ' آداب‌جامہ وغیرہ -

مثنوی کی ابتدا حسب ذیل اشعار سے ہوتی ہے :—

بولوں صفت میں بے گلت اوس خالق جن و بشر
نر دھار کر اسماں رکھیا سورج ستارے ہور چندر
دی یوں بزرگی عرش کوں پلکھے اوڑے پکھیاے تے
جوں برق برساں چہار سو اپڑے ہزان پا یا دگر

خاتمہ :—

اِس تحفہ کے تیں لکھیا ہے عاجز ہور پیار سوں
تا خوش ہو راجو شاہ نے راکھیں کرم عاجز اوپر

---

[۱] تحفۃالنصائح کا سنہ تصنیف ۷۹۵ھ ظاہر کیا گیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ سنہ ۷۳۱ھ میں سید راجو کا انتقال ہوا ہے -

[۲]—" روضۂ اولیا " غلام علی آزاد بلگرامی -

انجمن ترقی اردو کے علاوہ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب وغیرہ کے پاس بھی اس مثنوی کے مخطوطات موجود ہیں - کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ یا یورپ کے کسی کتب خانہ میں اس مثنوی کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے -

---

(۱) اس مخطوطہ کی جلد قدیم چمڑے کی بنی ہوئی ہے - ممکن ہے وہ ایک یا ڈیڑھ صدی پہلے کی ہو -

(۲) اس مثنوی کے ساتھ بعض اور فارسی مخطوطات بھی شامل ہیں -

(۳) ایک مثنوی " ولی " کی بھی شامل ہے جس کا مطلع اور مقطع درج کیا جاتا ہے-

اول حق کی توفیق سوں بات کر
پیچھے بول توں نعت خیرالبشر
ولی جانتا نہیں کہ مرجائے گا
جو یو شہید دو جا دنیا پائے گا [۱]

ولی کی معلوم شدہ مثنویوں میں یہ شامل نہیں ہے -

(۴) اسی مخطوطہ میں بعض اور غزلیں بھی شامل ہیں ' ان میں سے ایک غزل شاہ عزیز اللہ کی ہے - اس غزل کا مقطع وہی ہے جس کو " مہر " نے اپنے تذکرہ میں شاہ عزیز اللہ کے بیان میں درج کیا ہے - اس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے -

منگتا بزرگاں سے امن از گردش دوران امن
عاجز عزیزاللہ پر یا حضرت مہران مدد

---

[۱]—یہ مصرع موزوں نہیں - [ادارہ] -

مهری زبان میں کہا سکت بولوں ولیوں کی صفت[۱]
عاجز عزیزاللہ اوپر دکھن کے سب پھراں مدد

(۵) قادر ' اور محمود کی غزلیں اور مخمس بھی اس میں شامل ہیں - یہ محمود قطب شاہی نہیں ہے بلکہ عہد آصفیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

(۳) کلیات شاہی

ورق (۱۱۹) سطر (۹) خط نسخ خوش خط جدول طلائی ' کاغذ زر افشانی - نظم -

مصنف : علی عادل شاہ المتخلص بہ " شاہی " تاریخ تصنیف درمیان سنہ ۱۰۶۷ھ تا سنہ ۱۰۸۳ھ - نام کاتب اور سنہ کتابت درج نہیں ہے -

سلطان علی عادل شاہ ثانی سنہ ۱۰۴۸ھ میں تولد ہوا ' محمد عادل شاہ (سنہ ۱۰۳۷ھ سنہ - ۱۰۶۷ھ) کا چشم و چراغ تھا ' باپ کی وفات پر سنہ ۱۰۶۷ھ میں تخت نشین ہوا ' اور سولہ سال کی حکمرانی کے بعد ابھی (۳۵) سال ہی کا تھا کہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا ' بیجا پور میں مدفون ہے -

سلطان کو اس کے اجداد کی طرح علوم و فنون کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی ' شعر و سخن کا خاص مذاق رکھتا تھا ' اس کے زمانہ میں گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے - " ہندوستانی " زبان کے بڑے بڑے شعرا اس کے دربار میں جمع تھے ' جن میں سے نصرتی ' ہاشمی ' مرزا وغیرہ مشہور ہیں - سلطان کو فنون سپاہ گری میں بھی کمال حاصل تھا ' بہ نفس نفیس کئی معرکے سر کیے تھے ' مغلوں سے کئی لڑائیاں ہوئیں مگر سلطان کے مقابل کبھی اُن کو کامیابی نہیں ہوئی -

---

[۱]—"...بولوں جو ولیوں..." (؟) - [ادارۃ] -

سلطان کا کلیات مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے جن کی تفصیل یہ ہے :

قصیدے چھ ، مثنویاں تین ، غزلیں انیس ، مخمس ایک ، مثمن ایک ، مرثیہ ایک ، راگ بیس ، شعر تین ، رباعی ایک ، فرد تین ، کہت چار ، تاریخیں دو ، دوہرے چار ، پہیلی ایک ۔

ان میں سے دونوں تاریخیں فارسی زبان میں ہیں ، ایک شرف برج کی (سنہ ۱۰۸۰ھ) دوسری بادشاہ محل کی تعمیر کی -

مخطوطے کا پہلا ورق نہیں ہے ، اس لیے پہلا قصیدہ ناقص‌الاول ہے - جن اشعار سے دوسرا ورق شروع ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہیں :

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھلے بدل
عقل معلم اپن قصہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے
عقل کا جاسوس ہو مکھ پہ اچھی یو کرن

خاتمہ :—

فزوں باد عشرت دریں بزم گاہ
کہ باشد ہمیشہ خلایق پناہ

مورخوں نے بیان کیا ہے کہ سلطان علی عادل شاہ کے کلام کو جمع کرنے کا کام اس کے ایک صاحب ذوق مصاحب ابوالمعانی کے سپرد تھا ، کوئی تعجب نہیں ہے کہ یہ نسخہ وہی ابوالمعانی کا مرتب کیا ہوا نسخہ ہو ، کیوں کہ کاغذ اور شان خط وغیرہ اسی پر دلالت کرتا ہے -

کلیات شاہی کے کسی دوسرے نسخے کا پتا نہیں چلا ، اور نہ اب تک یہ شائع ہوا ہے- کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے اور نہ یورپ کے کسی کتب خانے میں یہ پایا جاتا ہے -

(۴) علی نامہ

ورق (۹۱) سطر در متن (۱۳) بر حاشیہ (۱۶ شعر) جملہ اشعار فی صفحہ (۲۹) خط نسخ معمولی ' نظم -

مصنف : نصرتی ' تاریخ تصنیف : سنہ ۱۰۷۲ھ -

کاتب محی الدین ابن سید عبدالرسول نبیرۂ مخدوم اشرف جہاں -

تاریخ کتابت ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۱۷۲ھ روز سہ شنبہ در مقام بادامی -

نصرتی ' علی عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۰۶۷ھ - سنہ ۱۰۸۳ھ) کے دربار میں ملک الشعرا کی حیثیت رکھتا تھا - محمد نصرت اُس کا نام تھا ' اور نصرتی تخلص کرتا تھا ' اُس کے اجداد عادل شاہی حکومت کے نمک خوار تھے ' سپہ گری اُس کا پیشہ تھا ' نصرتی کی پرورش شاہی محل میں سلطان علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی بلکہ شاعری میں سلطان ہی سے تلمذ رکھتا تھا -

نصرتی اپنے زمانے کا ممتاز ہندستانی گو شاعر تھا - اُس کی تین تصنیفیں مشہور ہیں ' "گلشن عشق" جو سنہ ۱۰۶۸ھ میں تصنیف ہوئی ' "علی نامہ" جو سنہ ۱۰۷۲ھ میں مرتب ہوا ' "تاریخ اسکندری" جو سنہ ۱۰۸۳ھ میں لکھی گئی -

نصرتی کے مرنے کا سنہ ہنوز تحقیق طلب ہے ' البتہ ریاض حسنی[۱] سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی عالمگیر کی فتح بیجاپور (سنہ ۱۰۹۷ھ) کے وقت بقید حیات تھا -

" علی نامہ " نصرتی کی مشہور مثنوی ہے ' جس میں علی عادل شاہ کے حالات لکھے گئے ہیں ' اِس مثنوی کے ساتھ قصیدے بھی شامل

---

[۱] — ملاحظہ ہو نمبر (۲) -

میں ' نصرتی کے قصائد اپنی فصاحت و بلاغت اور مرقعہ نگاری میں خاص حیثیت رکھتے ھیں - قصائد کا عنوان بھی اشعار میں لکھا گیا ھے -

مخطوطہ کی ابتدا حسب ذیل اشعار سے ھوئی ھے :—

حمد اول ھے خدا کا کہ جلے روز ازل
دیا ھے ھمت مردان کوں جو توفیق سوں بل
رکھیا اس فتح کے نامے کا علی نامہ نانوں
جس کا ھے زرمیہ رستم کی کلی ھوئی ھیکل

بسم‌الله الرحمن الرحیم

سرا ناسری اُس سکت دار کوں
کہ آدھار ھے جن نر اد ھار کوں

خاتمہ :—

تلک جس سوت یو شاہ مظفر اچھو
دندیان پر سرا تیغ شوار اچھو

علی نامہ ھنوز شائع نہیں ھوا ھے - اِس کے قلمی نسخے مختلف مقامات پر پائے جاتے ھیں جن میں سے بعض حسب ذیل ھیں -

انڈیا آفس (۳۶ بلوم ھارٹ) ' برٹش میوزیم (۲۶۵۲۷) اور انجمن ترقی اردو میں اور آغا حیدر حسن ' اور نواب سالارجنگ بہادر کے پاس اس کے نسخے ھیں لیکن کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ھے -

(۵) علی نامہ

ورق (۱۳۶) سطر (۱۷) خط نسخ اوسط درجہ ' نظم -
مصنف نصرتی - تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۷۶ھ -

نام کاتب اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے -

یہ علی نامہ کا دوسرا نسخہ ہے مگر اول و آخر سے ناقص- پہلا اور آخری شعر درج کیا جاتا ہے -

که کوئی کس اوپر دات آنا سکے
گر آوے اچھوتا او جانا سکے

خاتمہ :—

گھڑی ہو کہ کچ دنت کیلے کی کہانب
دیسیں نیشکر سیلہ بہالیاں کے تھانب (؟)

(۹) ریاض حسنی

ورق (۱۱۱) سطر (۱۲) خط شفیعا معمولی' نظم و نثر -
مصنف: خواجہ عنایت اللہ فتوت - سنہ تصنیف سنہ ۱۱۶۸ھ[۱]
سنہ کتابت درج نہیں ہے - نام کاتب شیخ محمد اکرم -

خواجہ عنایت‌اللہ المتخلص بہ فتوت' کے اجداد بدخشاں کے رہنے والے تھے ' فتوت کے دادا خواجہ آفتاب اورنگ‌آباد آئے ' اورنگ‌آباد آنے سے پہلے انکا قیام '' چاندہ '' میں تھا - فتوت کے باپ خواجہ عبدالرحمن تھے جو سرکار آصفیہ کی سلک ملازمت میں داخل اور اعتضادالدولہ لشکر جنگ کے خطاب اور جاگیر سے ممتاز تھے' سنہ ۱۱۶۰ھ میں اُن کا انتقال ہوا - لشکرجنگ کے مرنے پر اُن کے دونوں لڑکوں یعنی خواجہ

---

[۱]—اگرچہ اصل مخطوطہ میں تاریخی مصرع کے نیچے سنہ ۱۱۷۵ ہجری لکھا ہوا ہے لیکن مصرع کے اعداد سے سنہ ۱۱۶۶ ہجری نکلتے ہیں - تیسرے مصرع سے بذل کی "ب" کے دو اعداد کا اضافہ کرنے سے سنہ ۱۱۶۸ ہجری تاریخ قرار پاتی ہے -

یہ تاریخ اس لیے بھی صحیح ہے کہ دیباچۂ کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب نواب صلابت جنگ کے عہد میں مرتب ہوئی ہے اور سنہ ۱۱۷۵ ہجری میں نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی کی حکومت تھی اس لیے اس کے پہلے یہ کتاب تصنیف ہوئی -

عنایت‌الله اور خواجہ ابوالبرکات کو دربار آصفیہ سے جاگیر اور خانی و بہادری کے خطاب عطا ہوے تھے -

خواجہ عنایت‌الله کی پیدایش اورنگ‌آباد میں ہوئی تھی - کمسنی سے شعر کہنے کا شوق تھا - حضرت سید سراج‌الدین سراج اورنگ‌آبادی سے تلمذ حاصل تھا ' سنہ ۱۲۲۳ ھ میں انتقال ہوا - " ریاض حسنی " ہندوستانی گو شعرا کا تذکرہ ہے جو نواب صلابت جنگ کے عہد حکومت (سنہ ۱۱۶۴ھ تاسنہ ۱۱۷۳ھ) میں لکھا گیا - تذکرہ قدیم رواج کے موافق نثر کی حد تک تو فارسی میں ہے مگر اشعار ہندوستانی زبان میں ہیں -

اِس میں شعرا کا ذکر ردیف وار ہے اور شمالی ہند اور دکھن کے شعرا سبھی شامل ہیں' ابتدا میں (۳۳) صفحہ کا ایک دیباچہ بھی ہے -

آخر پر تاریخ تصنیف کا ایک قطعہ بھی شامل ہے جو حسب ذیل ہے -

تاریخ بنائے این ریاض حسنی ٭ جستم ز فیض خاص آل مدنی
ازروے سرور بذل ہاتف بر گفت ٭ گلدستۂ ریحان بہار معنی

اس مخطوطہ کا پہلا صفحہ نہیں ہے ' حسب ذیل عبارت سے ابتدا ہوتی ہے :—

" آن خالق تحقیقی خلاق خلعت گوناگوں است "

خاتمہ ذیل کی عبارت پر ہوا ہے :

" بقول کلام ملک عزیزالعلوم [۱] ہر بندہ گنہ‌گار را امید است قولہ‌تعالی لا تقنطوا من‌رحمۃالله ان‌الله یغفرالذنب [۲] جمیعاً..."
لمحررہ عقیدت شیخ محمد اکرم " [۳] —

[۱]—العلم [اِدارۃ] -
[۲]—الذنوب - [اِدارۃ] -
[۳]—" لمحررہ عقیدت کیش شیخ محمد اکرم " (؟) [اِدارۃ]

سب سے پہلے سراج الدین علی خاں آرزو کا بیان ہے اور سب سے آخر شاہ کبرنگ کا - یہ مخطوطہ ھنوز شایع نہیں ہوا ' اور اسکے کسی اور نسخے کا پتا ابتک نہیں چلا ' اس نسخے کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ قدرت نے اپنے دیباچے میں یہ تصریح کی ہے کہ ریاض حسنی شیخ محمد اکرم کی فرمائش اور اصرار پر لکھی گئی ' اور یہ نسخہ شیخ محمد اکرم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے -

(۷) طبقات الشعراء

ورق (۱۳۲) سطر (۱۷) خط نستعلیق معمولی -

مصنف : قدرت اللہ شوق - تاریخ تصنیف سنہ ۱۱۸۸ ھ -

کاتب : سید محمد علی ملیح آبادی - تاریخ کتابت ۲۹ رمضان سنہ ۱۳۲۷ ھ -

قدرت اللہ صدیقی شوق سنبھل کے توابعات کے رہنے والے تھے' شاعری کے لحاظ سے ان کا نام مشہور نہیں ہے' انہوں نے بیان کیا ہے کہ بچپن سے شعر وسخن کا شوق تھا ' اسی شوق کے باعث مختلف دیوانوں اور بیاضوں کو جمع کرکے تذکرہ لکھا گیا ' یہ ہندوستانی گو شعرا کا تذکرہ ہے' اگرچہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے - یہ تذکرہ چار طبقات میں منقسم ہے اور چوتھے طبقہ کو پھر پانچ مقالوں میں تقسیم کیا ہے - امیر خسرو سے لے کر مولف نے اپنے زمانے تک کے شعرا کے حالات اور نمونہ کلام درج کیا ہے - طبقات کی تقسیم حسب ذیل ہے :—

طبقۂ اول شعرائے دکھنی و بعض معاصر—اس میں ۲۴ شعرا کا ذکر ہے -

طبقۂ دوم شعرائے ایہام گو—اس میں ۲۱ شعرا کا حال ہے

طبقۂ سوم شعرائے متاخرین—اس میں ۷۱ شعرا کا تذکرہ ہے

طبقۂ چہارم بعض نو مشقان و تازہ گویان -

محمد علی ملیح آبادی کاتب نسخہ نے اس نسخہ کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے -

" سید محمد علی ملیح آبادی نے ایک کرم خوردہ نسخہ سے ۲۳ یوم میں نقل کرکے اپنے خانگی کتب خانہ میں داخل کیا ' اور اصل نسخہ سے اس کی صحت بوجہ عجلت نہ ہوسکی اور یہ صحت کسی صحیح نسخہ کے دستیاب ہونے پر منحصر رکھی " -

اصل نسخہ رجب سنہ ۱۲۰۱ ھ کا لکھا ہوا تھا جو کرم خوردہ تھا محمد علی ملیح آبادی نے اسی سے نقل کیا - جس کے بعد حالیہ زمانے میں دارالمصنفین اعظم گڈہ کے نسخے سے اس کا مقابلہ اور صحت بھی کی گئی ہے ' جس کی صراحت موجود ہے - اس طرح یہ نسخہ مکمل ہے -

ابتدائی عبارت حسب ذیل ہے :—

زباں کو حمد سے تیری جو بہرہ مند کیا
میں بہترین سخن پہلے یہ پسند کیا

عزیز ترین کلامیکہ آرائش سرنامہ سخن و پیرائش دیباچہ ہر نو وکہن تواند شد حمدیست -

خاتمہ :—

"بعنوان ملک الوہاب نسخۂ طبقات الشعرا بموجب فرمائش خان مہربان دوست محمد خان خلف الصدق خان صاحب نصرت خان حاکم بخط بندہ احقرالعباد فیض علی بتاریخ نہم رجب سنہ ۱۲۰۱ ھ بروز پنجشنبہ وقت سہ پہر " -

کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے -

(۸) بہادر نامہ

ورق (۱۹) سطر درمتن (۱۳) بر حاشیہ (۲۴) خط نستعلیق معمولی۔ نثر۔

مصنف نامعلوم تاریخ تصنیف درمیان سنہ ۱۱۹۶ھ و ۱۲۱۲ھ تاریخ کتابت سنہ ۱۲۹۲ھ نام کاتب : نصیرالدین شریف (درچھاونی حیدرآباد)

افسوس ہےکہ مصنف کے متعلق کچھہ معلومات نہیں حاصل ہوسکیں۔ کتاب نثر ہندوستانی زبان میں ہے - اس میں حیدرعلی والی میسور کے حالات ہیں - تاریخی کتابوں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کتاب مستند معلوم ہوتی ہے' تاریخ میسور کا اچھا مواد فراہم کیا گیا ہے - ضمناً ناصرجنگ' اور ہمت بہادر خاں کے واقعات بھی درج ہیں -

کتاب کی ابتدا میسور کے راجہ کشن راج کے حالات سے ہوتی ہے ' اور حیدر علی کے خاندانی حالات کو بیان کرتے ہوے ان کے عہد حکومت کے واقعات تفصیلی طور پر بیان کیے گئے ہیں - حیدر علی کی وفات اور ٹیپو سلطان کے تخت نشین ہونے تک کے واقعات درج ہیں -

یہ حالات حیدر نامہ [۱] سے ملتے جلتے ہیں ' لیکن یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ کون سی کتاب کس سے ماخوذ ہے

ابتدائی اور آخری عبارت درج ذیل ہے :—

" حمد و ثناء اُس باد شاہ حقیقی کو سزا وار ہے کہ جس نے تمام سلطنت روے زمین کی انسان کے قبضہ میں دی اور شکر گزاروں کو بڑی بڑی مصیبتوں اور مشکلوں سے بچاکر اپنی قدرت کاملہ سے نمودار کیا "۔

---

[۱]—یورپ میں دکھنی مخطوطات ' (ص ۴۰۳) -

"اور آپ درو بست لشکر همراہ لیکر سرنگ پٹن کو آ پہنچے ' جو افواج پالیگراں سے لیے تھے سب کو ان کے مکانوں کو روانه کر دیے اور اپنی فوج کو چڑکاہ کو روانه کیے اور آپ عیش و عشرت میں مشغول رہے" - کتب خانه آصفیه اور کتب خانه جامعه عثمانیه میں اس کتاب کا کوئی نسخه نہیں ہے - اور یه کتاب شائع بھی نہیں ہوئی ہے -

(۹) ریاض العارفین [۱]

ورق (۱۹۱) سطر دومتن (۱۱) بر حاشیه (۲۰) = فی صفحه ۴۱ شعر خط نستعلیق معمولی - نظم -

مصنف : محمد اسحاق ' تاریخ تصنیف : سنه ۱۲۰۶ھ -

تاریخ کتابت : ۷ رمضان سنه ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۹ اکتوبر سنه ۱۸۷۵ع'

کاتب : نصیرالدین -

محمد اسحاق کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں - البتا ظاہر ہوتا ہے که ان کو میسور یا مدراس سے تعلق تھا ' اور اس کتاب کو انہوں نے اپنے دوست یعقوب کی فرمائش پر لکھا اور سات ماہ سات یوم میں ختم کیا - جس سے ان کے پر گو شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے -

اس مثنوی کا موضوع تصوف اور اخلاقیات ہے - فارسی سے اس کو ہندوستانی نظم میں ترجمه کیا گیا ہے - جمله گیارہ باب ہیں -

زیر بحث مخطوطه ناقص اول ہے - چند اوراق نہیں ہیں ' جن اشعار سے ابتدا ہوئی ہے وہ حسب ذیل ہیں :—

کیا لے فیض کاتب میں قلم
لوح دل پر حرف دانش کوں رقم

---

[۱]—"......العارفین" (؟)—[ادارہ] -

عطا امداد فیض عام سوں
گوہر افشانی دیا نیسان کوں
پالکر سبھی میں در شاہ وار
گوش محبوباں میں توں بخشا قرار

خاتمہ :—

بیچ اچھ بندگی کوں کر نمود
مصطفےٰ کی روح اشرف پر درود
اور مکرم آل اور اصحاب پر
پڑھ تحیت اور سخن کو ختم کر

یہ کتاب شائع ہوچکی ہے لیکن اب نا یاب ہے -

(۱۰) مجموعۂ فصاحت

ورق (۲۴۶) ' سطر (۱۴) خط نستعلیق اوسط درجہ - نظم -
مولف : تجلی علی شاہ تجلی - تاریخ تالیف : سنہ ۱۲۱۶ھ -
سنہ کتابت درج نہیں ہے - نام کاتب غیر موجود -

تجلی علی شاہ نام اور تجلی تخلص ' امرائے دربار آصفی سے تھے ' آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں (سنہ ۱۱۷۳ھ تا سنہ ۱۲۱۸ھ) کے سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے - مسلمہ علمی قابلیت رکھتے تھے - دکن کی تاریخ " تزک آصفیہ " کے نام سے انہوں نے مرتب کی ہے جو مستند مانی جاتی ہے - شاعری کا خاصا مذاق تھا ' فارسی اور ہندوستانی میں شعر کہتے تھے ' سنہ ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی -

" مجموعۂ فصاحت " میں ارسطو جاہ کی مدح میں مختلف شعرا نے جو قصیدے ' قطعات تاریخی وغیرہ لکھے تھے اُن کو ایک جگہ

کر دیا ہے - نظم کا بڑا حصہ هندوستانی زبان میں ہے اور کچھ فارسی بھی ہے -

ان قصائد اور قطعات کو شعرا کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار ترتیب دیا ہے -

زیر بحث مخطوطہ صرف جلد اول ہے، جس میں ردیف "ص" تک قصائد وغیرہ شامل ہیں ، ردیف ض سے ی تک دوسری جلد ہے ، مگر وہ اِس کتب خانے میں موجود نہیں ہے -

اِس مجموعے کی ابتدا ایک طویل دیباچہ سے ہوتی ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اسمعیل یار جنگ بہادر کی فرمائش پر مرتب کی گئی تھی -

معلوم ہوتا ہے کہ " تجلی " اس کو مرتب کر رہے تھے، دیباچہ وغیرہ بھی لکھدیا تھا ، مگر کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اُن کا انتقال ہو گیا ، اور اُس کے بعد کتاب مکمل کی گئی - اُس کی ترتیب کی گئی تاریخیں بھی نکالی گئی ہیں جن میں سے بعض درج کی جاتی ہیں -

ریاض قصائد ،	قصائد اعظم ،	دفتر وصف وزیر قابل
۱۲۱۹	۱۲۱۹	۱۲۱۹

جلد اول میں جملہ ۷۷ شعرا کا کلام شامل ہے، بلحاظ ردیف اُن کی تعداد ذیل میں درج کی جاتی ہے :—

الف - (۱۹) شعرا ؛ ب - ۳ شعرا ، ت - ۵ شعرا ، ث - ایک شاعر، ج - ۵ شعرا ، ح - ۲ شعرا ، خ - ۲ شعرا ، ذ - ۲ شعرا ، ر - ۴ شعرا ، ز - ۳ شعرا ، س - ۱۸ شعرا ، ش - ۷ شعرا ، ص - ۲ شعرا -

نواب ارسطو جاہ غلام سید خاں سہراب جنگ معین الدولہ مشیرالملک اعظم الامرا وکیل مطلق دولت آصفیہ، آصف جاہ ثانی نواب میرنظام علی خاں

کے دیوان تھے - سنہ ۱۱۹۵ ھ میں اس خدمت پر مامور ہوئے ' اور تا دم زیست اِس جلیل‌القدر خدمت کو انجام دیتے رہے ' محرم سنہ ۱۲۱۹ ھ میں انتقال کیا - ارسطو جاہ کی شخصیت تاریخ دکن میں خاص حیثیت رکھتی ہے ' کیوں کہ یہ وہ نازک وقت تھا جب کہ فرانسیسی طاقت برطانوی سطوت سے متصادم ہو رہی تھی اور اُسی زمانے میں پیشوا ' اور ٹیپو سلطان سے بھی متعدد معرکے ہوے تھے -

مخطوطہ کی ابتدا حسب ذیل عبارت سے ہوئی ہے :—

" توشیح کلام بلاغت آغاز فصاحت انجام سخن آفرینای راسزد کہ نظام توضیع اجرام افلاک ونثر ترصیع خطۂ خاک بررویے قیام حکمت بالغۂ اوخامہ وار سر نگوں" -

خاتمہ :—

" باقبال داور کامل جلد اول ازقصائد حمیدہ نواب ارسطو جاہ زاد اللہ عمرہ و اقبالہ درسال سعد باہاد یکہزار درصد و شانزدہ بحصول آئین بھی حسن ارقام یافت یارب این مجموعہ راتونامی کن تمت" -

کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک مکمل نسخہ موجود ہے ' (نمبر ۲۰۵ قصائد فارسی) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے ' اور نہ یورپ کے کسی کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ پایا جاتا ہے - یہ مجموعہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے' اس مخطوطہ پر ھمارا ایک تفصیلی مضمون رھبر دکن میں شایع ہوا ہے [۱] -

(۱۱) داستان نواب نظام علی خان

ورق (۲۱) سطر (۱۵) خط نستعلیق اوسط در جہ - نظم -

مصنف - کمتر - سنہ تصنیف - سنہ ۱۲۲۱ ھ -

---

[۱]—سالگرہ نمبر رجب سنہ ۱۳۵۴ھ -

نام کاتب موجود نہیں ہے' تاریخ کتابت ۲۵ صفر سنہ ۱۳۵۲ ھ -
کتبہ کے متعلق کسٹرین کو کچھ معلومات نہیں ہیں -

یہ مثنوی سلاطین آصفیہ کی ابتدائی حکومت اور آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں (سنہ ۱۱۷۳ھ تا سنہ ۱۲۱۸ ھ). کے مختصر حالات سے متعلق ہے - عنوانات کے تحت تاریخی واقعات ھندوستانی زبان میں بیان کئے گئے ہیں - لیکن عنوانات فارسی میں لکھے گئے ہیں ' بعض عنوان حسب ذیل ہیں :—

(۱) در بیان آن کہ رفتن ناصر جنگ برائے عزم وزاوت و بازگشتن وشہادت یافتن از فتور از دست ہمت بہادر' -

(۲) در بیان آں کہ ریاست کردن ھدایت محی‌الدین خاں و باز کشتہ شدن از دست ہمت بہادر و آں ہم کشتہ شدہ -

(۳) در بیان آں کہ بہ ریاست نشستن صلابت جنگ و تقسیم نمودن بہ برادران خود و باز جنگ شدن از مرہٹہ و ظفر یافتن -

اس مثنوی کو تاریخ کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا ' جیسا کہ اس کا نام داستان رکھا گیا ہے ویسے یہ داستان ہی ہے جو صدق و کذب پر مشتمل ہے -

ابتدا :—

خدا کو سزاوار حمد و ثنا
دیا کن سے دونوں جہاں کو بنا
عجب تیری قدرت ہے اے بے چگوں
کیا ہے کھڑا آسماں بے ستوں
وہ صانع کی دیکھو یہ صنعت گری
کہ نطفہ کو صورت دیا جیوں پری

خاتمہ :—

جو گذرے جہاں سے وہ نیکو سیر
بہتر برس کی تھی اون کی عمر
یہ قصہ ہوا جب کہ تیار وہن
تو بارہ سو اکیس تھے سال و سن

یہ کتاب ہنوز شائع نہیں ہوئی - کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے (نمبر ۲۱۷ تاریخ اردو) - کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ میں یہ موجود نہیں -

چوں کہ یہ داستان کسی دوسرے نسخے سے زمانہ حال میں نقل کی گئی ہے اس لئے آخر پر اشاریہ بھی موجود ہے -

(۱۲) چار کرسی

ورق (۹) سطر (۱۰) خط نسخ معمولی - نظم و نثر -
مصنف - نا معلوم ' تاریخ تصنیف قبل سنہ ۱۲۲۱ ھ
اس کتاب کے مصنف کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہوئیں -

یہ کتاب عقائد اور فقہ کے مسائل پر مشتمل ہے - کتاب در اصل فارسی نظم ہے اس کو ہندوستانی نثر میں ترجمہ کیا گیا ہے -

ابتدا :—

چار کرسی چار مذہب در وضو فرض است
سہ بغسل و سہ تیمم پنبج بنا اسلام دار

....

" چار کرسی یعنے محمد صلی‌اللہ علیہ‌وسلم بیتے عبداللہ کے اور عبداللہ بیٹے عبدالمطلب کے "

خاتمہ :—

یعنی یہ مسئلہ فرض آئے ہیں مسلمان پر ایک سو اور تیس بیچ گنتی کے ان سب کو یاد رکھ اور ترک مت کر - تمت تمام شد " -

اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں نہیں ہے -

(۱۳) شرح چار کرسی

ورق (۱۹) سطر (۱۲ و ۱۳) خط نستعلیق معمولی - نظم -

مصنف : تصور - تاریخ تصنیف : سنہ ۱۲۲۱ ھ -

کاتب کا نام موجود نہیں ہے - تاریخ کتابت درج نہیں ہے -

مصنف غیر معروف -

یہ مثنوی ہندوستانی زبان میں ,, چار کرسی " کی شرح ہے جو مختص عنوانات کے تحت کی گئی ہے - عنوان فارسی میں لکھے گئے ہیں اور نظم ہندوستانی زبان میں - عقائد اور فقہ کے مسائل کی شرح بیان کی گئی ہے -

ابتدا :—

نام سے اللہ کے کرتا ہوں اب میں بدو کار
تا برکت دے مری ترقیم میں پروردگار
ہے وہ روزی دینے والا خلق ذی‌الارواح کا
بخشنے والا ہے بندوں کا جو ہوں ایمان دار

خاتمہ :—

خاطر فاطر [۱] یہ ناکہ مادہ گذرا ہے ایک
کر عدد تاریخ کے امر شریعت سے شمار

---

[۱] —ناتر (؟) - ادارہ -

(۱۴) مختصر بیان دارالحکومت مدراس

ورق (۴۱) سطر (۱۳) خط نستعلیق معمولی - نثر -

مصنف : سید شاہ ابوالحسن - تاریخ تصنیف : سنہ ۱۸۰۸ع = (۱۲۲۶ھ) -

کاتب : سید شاہ محمد ابن سید محمد حسین - تاریخ کتابت : ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ -

شاہ ابوالحسن کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہیں ' یہ کتاب غالباً کسی انگریزی یا فارسی کتاب کا ترجمہ ہے کیوں کہ صفحہ اول پر حسب ذیل عبارت درج ہے :

" مکتبوں کے فائدے کے لیے ترجمہ کیا گیا منشی سید شاہ ابوالحسن سے "

کتاب کی نوعیت جغرافیہ کی سی ہے اس میں نقشے بھی شامل ہیں -

ابتدا :—

" دارالحکومت مدراس ایست انڈیا کپنی کے علاقہ میں ہے ' سو ہندوستان کے چار حصوں میں کا ایک حصہ ہے ' اس کو کبھی گزیٹ یعنی سرکاری کاغذ میں دارالحکومت فورٹ سنٹ جارج بھی لکھا کرتے ہیں - اور یہ ہندوستان کے جانب کی طرف تھوڑے تھوڑے ملکی ریاستوں کے ساتھ واقع ہے " -

خاتمہ -

" اس ضلع میں جملہ پانچ لاکھ ستر ہزار اسی پر تین (۵۷۰۰۸۳) آدمی ہیں " -

کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے - اگر چہ یہ کتاب مطبوعہ ہے مگر نا یاب ہے - شرف الدولہ (مدراس) کے کتب خانے سے یہ کتاب نقل کی گئی ہے -

(۱۵) معمولی برقلب

ورق (۳۴) سطر (۱۵) خط شفیعا معمولی - نظم -

مصنف : فدائی - تاریخ تصنیف : سنہ ۱۲۳۳ھ -

کاتب : گورسنگھ ساکن لاہور - تاریخ کتابت : درعہد اکبر شاہ باد شاہ (ثانی) ماہ ذیحجہ (؟) -

مصنف کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہیں - کسی نعمت اللہ نامی شخص کی فرمائش پر فدائی نے اِس کو مرتب کیا ہے -

یہ ایک مثنوی ہے جو تاریخ ملتان سے متعلق ہے - اِس میں مظفر خاں والی ملتان کے حالات بیان کیے گئے ہیں ' رنجیت سنگھ والی پنجاب سے نامہ و پیغام اور آخر میں جنگ کے بعد مظفر خاں کی شہادت کا ذکر ہے -

ابتدا :—

خدا یا جہاں کا تو ہے باد شاہ
ترے حکم میں ماہی سے تابماہ (؟)
ترے حکم میں سب زمین و زماں
ترے حکم میں سب مکین و مکاں

خاتمہ :—

ہوئی جب [۱] یہ بخیر عافیت
رکھا نام اس کا بخیر عافیت

[۱]—" ہوئی ختم جب (؟) ۔ [اِدارہ]-

ہے معمولی بر قلب اس کا یہ نام

کہ ھو ۃ ۔ الیہ عــالیت کا تمـام

یہ کتاب طبع نہیں ہوئی - کتب خانۂ آصفیہ یا کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ میں اِس کا کوئی نسخہ نہیں ہے -

(۱۶) فرخندہ نامہ

ورق (۳۷۶) سطر (۱۳) خط نستعلیق اوسط درجہ - نظم -

مصنــف : نذر علی تــاریخ تصنــیف : سنــہ ۱۲۵۶ فصلی (سنہ ۱۲۶۱ ھ) -

نام کاتب : موجود نہیں ہے - تاریخ کتابت درج نہیں ہے -

افسوس ہے کہ نذر علی کے متعلق کچھہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں - دکن کے کسی تذکرے میں اِن کا ذکر نہیں ہے - راجہ رام بخش پیشکار [۱] دولت آصفیہ کے دربار تک رسائی کے لیے اِنہوں نے شاهنامۂ فردوسی سے واقعات ملخص کر کے اُن کو ھندوستانی زبان کے سانچے میں تھالا ہے -

نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع کے عہد حکومت (سنہ ۱۲۴۴ ھ تا سنہ ۱۲۷۳ ھ) میں اِس کتاب کی ترتیب ہوئی ' اِس لیے اِس کا نام بھی نواب ناصرالدولہ کے نام نامی کی مناسبت سے " فرخندہ نامہ " رکھا گیا - تاریخ تصنیف حسب ذیل ہے :—

ہوئی مثنوی جس گھـڑی یـہ تمام

پے سـال تـاریخ ختـم کـلام

---

[۱]—پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۵۹ھ سے ۱۲۶۲ھ تک پیشکاری کی خدمت انجام دی پھر سنہ ۱۲۶۵ھ سے ۱۲۶۶ھ تک پیشکار رہے - چوں کہ اِس زمانے میں کوئی دیوان نہیں تھا اِس لیے یہ خدمت بھی یہی انجام دیتے رہے -

نظر کر کے ہاتف نے دل خواہ یہ
کہا خوب ہے مثنوی واہ یہ [۱]

ابتدا میں حمد و نعت، بادشاہ کی مدح وغیرہ ہے جس کے بعد اصل مضمون صفحہ ۳۴ سے شروع ہوتا ہے - حسب ذیل اشعار سے ابتدا ہوتی ہے :—

ستایش مسلم خدا ہی کو ہے
نہایش سزاوار شاہی کو ہے
کہ جس کی نہیں سلطنت کو زوال
نہیں کوئی ایسا جز ایزد تعال
منزہ ہے ذات اس کی حاجات سے
کہ مستغنی ہے اپنی وہ ذات سے

زیر بحث مخطوطہ ناقص الاخر ہے - آخری شعر ارد شیر بابکان کے عنوان کے تحت درج ہے جو حسب ذیل ہے -

کہ تا فیض جاری ہے خیرات کا
اثر ہے مظہر کی وہ ذات کا

یہ مثنوی طبع نہیں ہوئی ہے - کتب خانہ آصفیہ یا کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے -

(۱۷) افغانستان

ورق (۷۶) سطرمتن (۱۳) حاشیہ (۲۳) خط نستعلیق معمولی - نثر-
مصنف : سید عبدالفتاح عرف مہر اشرف علی - تاریخ تصنیف : درمیان سنہ ۱۲۵۹ و سنہ ۱۲۶۱ھ کاتب : نصیرالدین شریف - تاریخ کتابت ۴ شوال سنہ ۱۲۹۴ھ

---

[۱]—" خوب ...... یہ " = ۱۲۵۶ - اس سے سال ہجری مقصود ہوگا، جو اُس وقت عام طور پر رائج تھا - [ادارہ] -

مصنف کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہیں ' اس کتاب کے دیباچے میں مذکور ہے کہ مؤلف ایک اخبار بنام " مجمع‌الاخبار " ہفتہ وار نکالا کرتے تھے ' یہ اخبار اس کتاب کی تالیف کے وقت بھی جاری تھا - اس کتاب کی ترتیب میں سید فدا حسین جمعدار کی تصنیف سے جو ہندوستانی زبان میں تھی اور شیخ ذوالفقارالدین کی کتاب " تاریخ افغانستان " سے مدد لی گئی - اور جو خبریں اور واقعات مولف تک پہنچے اُن کو بھی اس کتاب میں درج کیا گیا ہے - مقدم‌الذکر کتاب کے واقعات کے بعد موخرالذکر کتاب کے مندرجہ حالات لکھے ہیں اور ان دونوں کے ختم پر اپنی معلومات بطور ضمیمہ اضافہ کی ہیں -

دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید فدا حسین سنہ ۱۲۵۵ ھ (سنہ ۱۸۳۹ع) میں افغانستان روانہ ہوا ' اور وہاں پہنچکر اپنے بھائی حاجی حسین علی خاں کے حسب ایماء افغانستان کے حالات قلمبند کئے- اس طرح سنہ ۱۲۵۵ ھ کے حالات اس میں درج ہیں -

انگریزی فوج زیرسرکردگی جنرل لینگٹن کوچ کرتی ہوئی فیروز پور پہنچی جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس فوج کا معائنہ کیا - اس کے بعد افغانستان روانہ ہوئی - جنگ کے بعد پھر فیروز پور ہوتی ہوئی میرٹھ کی چھاونی کو واپس ہوئی - یہ تمام واقعات مولف کے چشم دید تھے جو قلمبند کیے گئے ہیں -

اس کے بعد " تاریخ افغانستان " سے جو واقعات ماخوذ ہیں وہ شروع ہوتے ہیں - اُن واقعات کی ابتدا شاہ شجاع‌الملک درانی کے عہد حکومت سے ہوتی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۲۵۹ ھ تک شجاع‌الملک درانی نے خوب حکومت کی تھی' لیکن اس کے بعد ہی تغیر شروع ہوا - سرور خاں کا کابل پر قابض ہونے کے بعد غزنی کی طرف

پیشقدمی کرنا اور اس پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد جلال آباد کی طرف روانہ ہونا ، غرض ان تمام واقعات کا تفصیلی ذکر موجود ہے - امیر شیر محمد خاں کے لاہور کی طرف روانہ ہونے اور امیران سندھ کے مطیع ہونے اور امیر نصراللہ خاں کے سنہ ۱۸۴۵ع مطابق سنہ ۱۲۶۱ھ میں انتقال کرنے پر کتاب ختم ہوتی ہے - اس طرح اس کتاب میں سنہ ۱۲۵۵ھ سے سنہ ۱۲۶۱ھ تک کے چشم دید حالات درج ہیں - اس لیے یہ کتاب قابل قدر ہے -

فدا حسین جمعدار کے کچھہ کچھہ حالات بھی اس کتاب میں درج ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا عرف نبی بخش بخاری حیدری تھا ' انگریزی رسالہ " ترک سوار " میں جمعدار تھے ' اور میرٹھہ کی چھاونی میں ان کی تعیناتی تھی - ان کا وطن شاہ جہاں آباد تھا -

مخطوطہ کی ابتدا حسب ذیل عبارت سے ہوتی ہے :—

" حمدو ثنا بادشاہ حقیقی کوں سزاوار ہے جس نے تمام سلطنت روے زمین کی انسان کے قبضے اقتدار میں دی "

خاتمہ مصنف کے اشعار پر ہوا ہے آخری شعر حسب ذیل ہے :—

طمع میں جہاں کی تو اشرف نہ پھنس

کہ اللہ بس اور باقی ہوس

کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئي نسخہ نہیں ہے -

(۱۸) خزائن‌الامثال

ورق (۴۷۲) سطر ۱۵ , خط نستعلیق معمولی - نثر و نظم -

مصنف : حافظ محمد شمس‌الدین فیض - تاریخ تصنیف : سنہ ۱۲۷۱ھ آغاز کتاب' اتمام سنہ ۱۲۷۲ھ - نام کاتب : محمد غوث‌الدین ۔ تاریخ کتابت : سنہ ۱۲۷۸ھ

حافظ محمد شمس‌الدین فیض ' حیدرآباد کے مشاہیر شعرا سے تھے ' سنہ ۱۱۹۵ ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی اور سنہ ۱۲۸۲ ھ میں انتقال ہوا ' آپ کے علم و فضل سے تمام دکن فیضیاب ہوا ' آپ اپنے وقت کے نہ صرف بہت بڑے عالم و فاضل تھے بلکہ تصوف سے بھی خاص ذوق تھا - آپ کے شاگردوں کی طرح مریدوں کی بھی بڑی تعداد تھی - شاعری میں آپ کو خواجہ میر درد کے شاگرد حافظ تاج‌الدین مشتاق دھلوی سے تلمذ حاصل تھا -

اس کتاب کا دوسرا نام " دستورالشعرا " ھے ' دونوں نام تاریخی ھیں - خزائن‌الامثال سے سنہ ۱۲۷۱ھ اور دستورالشعرا سے سنہ ۱۲۷۴ھ برآمد ھوتا ھے -

اس کتاب میں مولف نے ھندوستانی زبان کی کہاوتوں کو ایک جگہہ جمع کیا ھے اور نظیر میں مستند شعرا کے اشعار بھی نقل کیے ھیں -

اس مخطوطے میں ابتدائی دیباچے کے دو ورق نہیں ھیں -

ابتدائی عبارت حسب ذیل ھے :—

" مغفور جناب حافظ تاج‌الدین مشتاق شاگرد با واسطہ حضرت خواجہ میر درد غفراللہ‌لھما کی زبان سے سنا تھا ' اور اساتذہ کے دواوین میں دیکھ پایا مع نظائر سب کو جمع کیا اور بقید حروف تہجی مع‌الترتیب لکھا ' اور اس مجموعہ کے دو نام رکھے ' ایک دستورالشعرا ۱۲۷۴ھ دوسرا خزائن‌الامثال یہ ابتدائی تاریخ ھے وہ اختتام کا سال " - ۱۲۷۱ھ

خاتمہ :—

راقم این کتاب محمد غوث‌الدین حیدرآباد میں اللھم‌اغفرلمولفہ و راقمہ و ناظرہ و سامعہ آمین یا رب‌العالمین بحرمۃ سیدالمرسلین صلعم وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین -

یہ نسخہ مولف کی زندگی ہی میں مرتب ہوا ہے - اور اِس کا کاتب خود مولف کا شاگرد تھا اِس لئے یہ نسخہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور بہت صحت کے ساتھ لکھا گیا ہے -

کتب خانہ آصفیہ میں اِس کا ایک نسخہ موجود ہے (لغت اردو ۱۸۴)

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں کوئی نسخہ نہیں ہے -

(۱۹) مواعظ نادر

ورق (۱۶) سطر (۱۰) خط نستعلیق اوسط - نثر -

مصنف : بچو لعل تسکین' تاریخ تصنیف سنہ ۱۲۷۲ ھ (مواعظ نادر تاریخی نام ہے) -

نام کاتب موجود نہیں ہے - تاریخ کتابت درج نہیں ہے (زیر بحث نسخہ زمانہ حال میں نقل کیا گیا ہے -

مصنف کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہیں' فیض کے خاص شاگردوں میں تھے' کسی تذکرے میں اِن کا ذکر نہیں ہے - اِس کتاب میں آصف جاہ اول (سنہ ۱۱۳۶ھ تا سنہ ۱۱۶۱ھ) کی وہ سترہ نصیحتیں ہندوستانی زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں جو اس دور اندیش فرمانروا نے اپنے انتقال کے وقت اپنے ولی عہد ناصر جنگ بہادر (سنہ ۱۱۶۱ھ تا سنہ ۱۱۶۴ھ) کو فرمائی تھیں -

ابتدا :—

" نظام ملک سخن کا انتظام مملکت معنی کا حمد پروردگار عالم و عالمیان ہے جس نے مشت خاک کو جوہر گویائی کا عطا کیا " -

خاتمہ :—

چوں بفرمان آصف جم جاہ ° شدہ تمکین بترجمہ قادر
نام و تاریخ ایں نصائح خوب ° گفت ہاتف مواعظ نادر
۱۲۷۲ھ

اس کے نسخے کتب خانہ آصفیہ یا کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نہیں ہیں -

(۲۰) گلدستۂ بیجاپور

ورق (۹۲) سطر (۱۱ تا ۱۷) خط نستعلیق معمولی - نثر -

مصنف : خواجہ مہر احمد علی خاں - تاریخ تصنیف سنہ ۱۲۷۹ھ -

نام کاتب موجود نہیں ہے - تاریخ کتابت درج نہیں ہے -

مصنف کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہیں ' البتہ اِتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصبہ شانور کے باشندے تھے ') اور نواب صاحب شانور کے متوسلین سے -

اِس مخطوطے میں اولاً تین صفحے کا دیباچہ ہے (جس میں سے پہلا صفحہ ضایع ہو گیا ہے ') اُس کے بعد بیجا پور کے عادل شاہی حکمرانوں کے حالات ہیں -

مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ نواب دلیر خاں حاکم شانور نے بیجاپور آکر وہاں کی عمارتوں کا معائنہ کیا اور تصویریں فراہم کیں - اور مہر احمد علی خاں سے خواہش کی کہ وہ ایک تاریخ لکھیں - اُن کے حسب ایماء سنہ ۱۲۷۷ھ میں ایک تاریخ فارسی زبان میں لکھی گئی - اُس کے دو سال کے بعد دلیر خاں کے فرزند ابوالقاسم خاں کی فرمایش پر اُسی فارسی تاریخ کا بقول مؤلف ہندی محاورہ کی زبان میں ترجمہ کیا گیا ـ

اس کتاب میں نو مجلسیں قرار دی گئی ہیں اور ہر مجلس کے عنوان کے تحت ایک بادشاہ کا حال ہے - واقعات کے لحاظ سے کتاب مستند معلوم ہوتی ہے ' ہجری سنہ کے ساتھ عیسوی سنہ بھی لکھدیا گیا ہے -

ابتدائی عبارت حسب ذیل ہے :—

" اس صفحات کا مخفی نہ رہے کہ قدوۂ امرائے زمان وزبدۂ رؤساء بلند مکان مہر سپہرایالت کیوان فلک............نواب دلیر خاں بہادر [۱] دلیر جنگ " -

خاتمہ :—

" اور تاریخ اختتام مہر بندۂ علی خاں عاشق نے فرمائی سو یہ ہے -

کی ابوالقاسم میاں نسخہ بلند شہلور میں

از یقین گلدستہ گلزار بیجاپور میں" [۲]

اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے (تاریخ اردو ۷۵۸) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں کوئی نسخہ نہیں ہے -

(۲۱) بوستان شہادت

ورق (۳۸) سطر در متن (۱۳) بر حاشیہ (۲۳) خط نستعلیق معمولی - نثر -

مصنف : سید احمد بن سید درویش - تاریخ تصنیف درج نہیں ہے مگر سنہ ۱۲۵۰ھ سے قبل قرار دیا جا سکتا ہے -

---

[۱]—دلیر خاں دلیر جنگ عہد آصفیہ میں بھی گزرے ہیں مگر یہ دلیر جنگ کوئی اور ہی ہیں کیوں کہ یہ شانور علاقہ میسور سے تعلق رکھتے تھے -

[۲]— اس شعر کا متن صحیح نہیں معلوم ہوتا - [ادارہ] -

نام کاتب : نصیرالدین - تاریخ کتابت ٥ صفر سنہ ۱۲۹۳ھ ـ

مصنف کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہیں ' مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق علاقہ مدراس سے تھا ' کیوں کہ ان کے ماخذوں کے ذکر میں خاصکر مولانا باقر آگاہ اور قاضی‌الملک بدرالدولہ مولوی محمد صبغۃاللہ کے تصانیف کا ذکر ہے - اور پھر بدرالدولہ کے نام کے ساتھ " استاذی " کی صراحت بھی کی ہے ' اِس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ قاضی صاحب کے شاگرد تھے ـ

اس کتاب کی تصنیف غالباً سنہ ۱۲۵۰ھ کے پہلے ہوئی ہوگی ' کیوں کہ مولوی محمد صبغۃاللہ کی کتاب داستان غم اسی سنہ میں تصنیف ہوئی ہے ' مگر اس کا حوالہ زیر بحث کتاب میں نہیں ہے بلکہ ان کی ایک اور کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے ـ

اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شہادت حضرت امام حسین علیہ‌السلام کے حالات کو چھ فصلوں میں بیان کیا ہے - آخر میں " فائدہ " کے عنوان کے تحت کئی امور لکھے گئے ہیں ؛ اور خاتمہ پر مصنف نے اپنا ایک مرثیہ اور مولانا باقر آگاہ کی کتاب " ریاض‌الجنان " کا اقتباس بھی شامل کیا ہے ـ

کتاب کی ابتدا حسب ذیل عبارت سے ہوئی ہے :—

" حمد و ثنا اُس خالق بے پروا کو سزاوار ہے کہ جس کی قضا و قدر کے آگے انبیا ' اپنے سروں کو تسلیم کر دئے " ـ

خاتمہ :—

" انکار کرنا ابن تیمیہ [۱] کا اِس حدیث کو فقط وہم ہے واللہ‌اعلم و صلی‌اللہ علی خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم‌الرحمین [۲] " -

---

[۱] —ابن تیمیۃ (؟) - ادارہ - [۲] —الراحمین (؟) - ادارہ -

کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے -

(۲۲) فتح المجاہدین

ورق (۲۰) سطر (۱۱) خط نستعلیق معمولی - نظم -

مصنف کا نام اور تاریخ تصنیف درج نہیں ہے -

کاتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے -

یہ ایک مثنوی ہے جس میں سنہ ۱۲۹۲ھ کے ھنگامۂ اھل سنت و الجماعت و فرقۂ مہدویہ کے واقعات درج ھیں -

ابتدائی اشعار :—

کروں حمد باری تعالیٰ رقم کیا پیدا قدرت سے لوح و قلم

تــری ذات ہے قادر ذوالجلال بری ہے عقل سے وھم سے خیال

خاتمہ :—

'' کرینگے میری مثنوی کوئی سیر دعا مانگو یہ عاقبت ہووے خیر

بوقت سحر مثنوی ہوئی تمام دیا اونکے نامو سے میں انتظام

تمام شد ''

اس مثنوی کا کوئی نسخہ کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نہیں ہے -

(۲۳) سوانح عمری محمد اسمعیل خاں

ورق (۲۸) سطر (۱۷) خط نستعلیق - نثر -

مصنف : سید عبدالرزاق - تاریخ تصنیف سنہ ۱۹۰۶ عیسوی -

تاریخ کتابت درج نہیں ہے ' نام کاتب موجود نہیں ہے -

سید عبدالرزاق صاحب برار کے متوطن تھے میجر ویلیلی هیگ[۱] کے ایماء سے یہ کتاب لکھی گئی ہے - اس میں محمد اسمعیل خان پنی ناظم برار کے حالات درج ہیں - کتاب کی ابتدا آصف جاہ اول کے حالات سے ہوتی ہے - اس ضمن میں اسمعیل خان کے باپ سلطان خاں کا مختصر تذکرہ ہے - اس کے بعد اسمعیل خان کے حالات شروع ہوتے ہیں ' سنہ ۱۱۸۹ھ میں اِن کے قتل ہونے تک کے واقعات لکھے گئے ہیں ' اُس کے بعد اخلاق و عادات اور اولاد کا ذکر بھی ہے -

ابتدا :—

" کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس نامور اور نیک نہاد ناظم کا سلسلہ کس مشہور خاندان امارت سے ملتا ہے " -

خاتمہ :—

" خدا اُن کی ان نشانیوں کو بادیر قائم رکھے خاندان امارت کے یادگار میں " -

کتاب مطبع مفید عام آگرہ میں طبع ہوچکی ہے - غالباً اب کمیاب ہے - اُسی کی یہ نقل ہے -

(۲۴) دھر و لیلا

ورق (۱۲) سطر (۱۱) خط نستعلیق معمولی - نظم -

مصنف کا نام اور تاریخ تصنیف درج نہیں ہے -

نام کاتب : سوھن - تاریخ کتابت سنہ ۱۹۱۱ سمت -

یہ ایک مثنوی ہے جس میں فرضی قصہ منظوم کیا گیا ہے - بلحاظ زبان و طرز بیان بارھویں صدی ہجری سے متعلق معلوم ہوتی ہے -

---

[۱]—" وولز لے هیگ " [؟] - [ادارہ] -

ابتدا :—

ایک راجـا تھا اجودھیا میں عجب

جس سے پاتے تھے جہاں میں فیض سب

تھا وہ راجا - تھا سبھی کچھ اوس کے گھر

کیـا جواہر لعل اور کیـا مال و زر

خاتمہ :—

نام بن ہرگز گذرا ہی نہیں أس سوا کوئی سہارا ہی نہیں

اِس کا کوئی نسخہ کتب خانہ آصفیہ اور جامعہ عثمانیہ میں
ں ہے -

تبصرے

(از ڈاکٹر تارا چند ، ایم - اے - ڈی ، فل)

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی، ترجمہ مولوی محمد اجمل خاں صاحب - ایم - اے -

بھگوت گیتا ، انجیل مقدس اور قرآن شریف مذہب کی تاریخ میں جو اہمیت رکھتے ہیں وہ بیان کی محتاج نہیں - ان میں سے ہر کتاب اپنے طرز میں یکتا اور فرد ہے - لیکن تینوں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ پڑھنے والے کے قلب اور دماغ پر ایسا گہرا اثر پیدا کرتی ہیں جو آسانی سے مٹ نہیں سکتا - ان کی تعلیم اور ان کے اسلوب بیان میں ایسی شان اور ایسا تحکم ہے کہ جس کی مثال ملنی مشکل ہے - تینوں کتابوں میں ظاہرا بہت بڑا اختلاف ہے - ہر ایک کی تشکیل جدا ہے ، فضاء جدا ہے، ذہن پر اثر ڈالنے کا طریقہ جدا ہے - قرآن شریف کا ولولہ خیز ، پر جوش اور آتشیں کلام دل میں حرکت اور خون میں گرمی بڑھاتا ہے - بھولے ہوئے مجہول اور سرکش انسان کو بیدار کرتا ہے اور اسے فرض اولیں سے آگاہ کرتا ہے - انجیل مقدس کی عہد عتیق کی داستانیں اور روائتیں جو آشنا اور نزدیک معلوم ہوتی ہیں ، عہد جدید کی دل میں گھر کرنے والی سیدھی سادی باتیں اور ایک درد اور محبت سے بھرے دل کی تین سال کی مختصر سوانح زندگی ہمیں ہیجان اور حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور زور سے بنی نوع انسان کی محبت اور خدا کی خدمت کی جانب مائل کرتی ہیں -

بھگوت گیتا کے مکالمے عقل اور نفس کی دائمی کش مکش کا آئینہ ہیں - لیکن عقل ایسی ہے جو یقین کے مستحکم اور اٹل مقام پر پہونچ چکی ہے اور جس کی مجبور کرنے والی منطق میں سکون اور نرمی ہے - اس کا تصور جلال شاندار اور پر شکوہ ہے - اس کا تخیل جمال دلکش اور دلربا ہے - کبھی عقل وہ دوست حبیب و لبیب ہے جو دل میں راہ کرلیتا ہے - کبھی وہ پیر مرشد ہے جس کی نگاہ بحر عرفان کی تمام گہرائیوں میں غوطہ لگا چکی ہے - کبھی وہ رہبر کامل ہے جو دنیا اور مافیہا کی ہر منزل سے واقف ہے - غرض بھگوت گیتا ایک نغمہ ہے جس کی علم و عمل اور عشق کے سروں سے تشکیل ہوئی ہے - اس نغمہ کی صدا ہزاروں برس سے سر زمین ہندستان میں گونج رہی ہے اور ہندستانیوں کے دلوں کو تسخیر کرتی رہی ہے -

اسی طرح قرآن شریف کی تلقین بھی وہ روح پرور نغمہ ہے جس کی دھن اسلامی فلسفہ اور تصوف میں سنائی دیتی ہے - جہاں جہاں اسلام کا ظہور ہوا ہے اس نغمہ کے الاپنے والوں نے اپنے خوش آئند راگوں سے فضا کو بھر دیا ہے - ہندستانی اور اسلامی تہذیب کے ساز جدا ہیں - مگر جاننے پہچاننے والوں نے کان بتاتے ہیں کہ دونوں سے نغمہ ایک ہی نکلتا ہے - مولوی محمد اجمل خاں کی کتاب کی اصل خوبی یہی ہے کہ انہوں نے ان سازوں سے نکلے ہوئے ترانوں کا مقابلہ کرکے دکھایا ہے کہ :—

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چراست
از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

کتاب کے دو حصے ہیں - پہلے حصہ میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں ہندستان کے پرانے زمانہ کی مختصر تاریخ ہے اور ہندوؤں کے

مذہبی مسئلوں پر بحث ہے - سری کرشن جی کی زندگی پر نظر ڈالی ہے ' اور ان کے متعلق چند مسلمان صوفیوں اور اہل قلم کی رائے دی ہے- اس کے بعد بھگوت گیتا کی تعلیم پر فلسفیانہ بحث ہے - راقم کتاب کے خیال کے بموجب بھگوت گیتا ایک پیغام عمل ہے - وہ سکھاتی ہے کہ انسان کو نتائج کی پرواہ نہ کرکے فرائض کو انجام دینا چاہئے - عمل میں خودی کا دخل غیر واجب ہے - اعمال اور فرائض میں جنگ کرنا شامل ہے - ضرورت آنے پر دھرم کی خاطر فتح و شکست کی پرواہ نہ کرکے ایثار اور بے نفسی کے ساتھ میدان کار زار میں حصہ لینا جائز و لازم ہے -

دوسرے حصہ میں ترجمہ ہے - ترجمہ نثر میں ہے - زبان صاف اور سادہ ہے - ترجمہ کے ساتھ اکثر مقامات پر مولانا روم ' حافظ ' شبستری ' عطار ' وغیرہ مشہور شعراء اور بزرگوں کے کلام کا اقتباس ہے - کہیں کہیں قران‌شریف کی آیتوں سے فقرے دے دیے ہیں - غرض یہ ہے کہ بھگوت گیتا کی تعلیم اور اسلامی تعلیم کی ہم آہنگی واضح ہو جائے -

ترجمہ کے بارہ میں زیادہ لکھنا اس لئے بیکار ہے کہ ڈاکٹر بھگوان داس نے اپنی تقریظ میں صحت کی داد دی ہے - کہیں کہیں ترجمہ میں نظر ثانی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے - مثال کے طور پر دوسرے مکالمہ کا تیرھواں شلوک لیجئے - صحیح معنے یوں ہونگے "جسم میں بسنے والے کے لئے جس طرح اس جسم (موجودہ) میں بچپن ' جوانی اور بڑھاپا ہے اسی طرح دوسرے جسم کا حصول - اس امر سے مستقل مزاج انسان ہراسان نہیں ہوتے " -

اس مکالمے کے اکتالیسویں شلوک میں بجائے "یہ مذہب عقل مستقل فطرت رکھتا ہے " ہونا چاہئے - " جس عقل میں استقلال ہے اس میں یکسوئی ہے " -

تیسرے مکالمہ میں ادھیاتم (अध्यातम) کا ترجمہ نفس اعظم ہوا ہے - اصل میں اس کا مطلب ذات برحق سے ہے -

اس قسم کی فروگذاشتوں کی جانب محض اس غرض سے توجہ دلائی ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں دور ہو جائیں - لیکن یہ ایسی نہیں ہیں کہ کتاب کی قدر و قیمت پر کوئی خاص اثر ڈالتی ہوں - کتاب واقعی بڑی کد و کاوش کے ساتھ لکھی گئی ہے اور فاضل مترجم نے اس میں ایک خاص نوعیت پیدا کر دی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے - جس روا داری اور صلح کل کے جذبہ کے تابع یہ کتاب تحریر ہوئی اس کی ہمارے ملک کو سخت ضرورت ہے - امید ہے کہ قوم کی بگڑی ہوئی فضا کو سدھارنے میں یہ کامیاب ثابت ہوگی -

---

" باز کے سو شعر "

مرتبہ واجد علی خاں جاوید - صفحات ۳۲ - قیمت ۲ آنہ

ملنے کا پتہ : کاشانہ باز - بازار گھانسی - حیدرآباد دکن -

یہ باز صاحب کی غزلوں کے سو شعر کا انتخاب ہے - انتخاب میں کافی دقت نظر سے کام لیا گیا ہے - باز صاحب باوجود دکھنی ہونے کے زبان پر کافی قدرت رکھتے ہیں - ان کے کلام میں خاصی صفائی اور سلاست ہے -

---

" فردوس خیال "

محمود اسرائیلی صاحب - صفحات ۱۰۴ - قیمت ۸ آنہ -

ملنے کا پتہ : محمود اسرائیلی صاحب - جہانگیر بلڈنگ -

سانکلی اسٹریٹ بمبئی -

اسرائیلی صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں - مختلف اخباروں اور رسالوں میں ان کی نظمیں ، غزلیں اور رباعیات چھپتی رہتی ہیں - یہ

ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے - جس میں مختلف مضامین پر قلم اُٹھایا گیا ہے - رباعیوں میں زیادہ تر مذھبی رنگ جھلکتا ہے - اور قناعت و توکل کی تعلیم دی گئی ہے -

---

" دو خدائی خدمتگار "

مہادیو دیسائی - صفحات ۹۹ - قیمت ۱۲ آنہ -

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی -

یہ کتاب مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سکریٹری مہادیو دیسائی صاحب نے سرحد کے مشہور لیڈر خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کے حالات میں لکھی ہے - یہ بات روشن ہے کہ گاندھی جی کے بعد جن لوگوں نے عدم تشدد کے اصول کو نہ صرف اپنی زندگی میں کچھ برتا ہے بلکہ سرحد کے جنگجو لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی ھدایت بھی کی ہے ان میں خان عبدالغفار خاں کو اولیت حاصل ہے - اسی وجہ سے وہ سرحدی گاندھی کہلاتے ھیں - ان کی مشہور تحریک خدائی خدمتگار کو بدنام کرنے کی بہت کوشش کی گئی اور ان کو طرح طرح سے تکالیف میں آزمایا بھی گیا ، مگر یہ دونوں بھائی اپنے عزم میں راسخ رہے - اس کتاب میں خان عبدالغفار کی زبانی کچھ ان کے حالات بتائے گئے ھیں جو انہوں نے مسٹر دیسائی سے بیان کئے - اسی طرح ڈاکٹر خان صاحب کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے - یہ کتاب ان دونوں بھائیوں کی سیرت کا آئینہ ہے (د)

" غالب کے سو شعر "

مرتبہ مقصود علی خان صاحب - صفحات ۳۷ - قیمت ۴ آنہ -

شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی -

مقصود علی خاں صاحب نے مختلف شعرا کے سو اشعار کا ایک ایک ست تیار کیا ہے - اب غالب کی باری آئی اور انہوں نے غالب کا

انتخاب واقعی اچھا کیا ہے - شروع میں ایک مختصر دیباچہ بھی ہے ' جس میں غالب کے تھوڑے سے حالات بھی لکھے ہیں -

---

" جوش کے سو شعر "

مرتبہ مقصود علی خاں صاحب - صفحات ۳۲ - قیمت ۴ آنہ -

شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی -

یہ جوش صاحب کے سو شعروں کا انتخاب ہے - اس انتخاب کو ان کی مختلف نظموں کی روح کہنا چاہئے - کسان - انگوٹھی - آثار انقلاب کے انتخابات ہیں ' مگر غزل کا کوئی شعر نہیں -

---

" حامد کے سو شعر "

مرتبہ منصور احمد صاحب - صفحات ۳۱ - قیمت ۲ آنہ -

شائع کردہ ہمایوں - ۲۳ لارنس روڈ - لاہور -

حامد صاحب دور حاضر کے ایک غزل گو شاعر ہیں ' لیکن ان کی شاعری غزل ہی تک محدود نہیں - وہ نظمیں بھی بلند پایہ کہتے ہیں - بہر حال اس کتاب میں صرف ان کی غزلوں کا انتخاب ہے اور اچھا خاصا انتخاب ہے - بعض بعض شعر تو کئی بار پڑھنے اور لطف اٹھانے کے لایق ہیں - منصور صاحب نے شروع میں ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں حامد صاحب کی غزلوں پر مختصر بحث کی ہے -

---

" انقلاب فرانس "

مصنفہ مولوی عبدالقادر صاحب - بی - اے (جامعہ)
صفحات ۱۱۸ قیمت ۱۲ آنہ - ملنے کا پتہ : جامعہ ملیہ
اسلامیہ دهلی -

انقلاب فرانس کی اهمیت دنیا کی تاریخ میں اس لئے بہت ہے کہ یہ پہلا ملک ہے جہاں اتنے بڑے پیمانہ پر ایک بلند نصب‌العین یعنی آزادی ' اخوت ' و مساوات کے لیے جمہور نے اپنی جانیں تک قربان کردیں' اور آخر کار اپنے متصد میں کامیاب ہوئے - صدیوں پہلے جب جمہوریت کا دور دورہ یونان میں تھا تو وہ چند شہروں تک محدود تھا - اس کے علاوہ غلام اور آقا کی تمیز باقی تھی - انقلاب فرانس کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے بڑے پیمانہ پر جمہوریت کے لئے ایک نیا راستہ نکال دیا اور آقا اور غلام کی تمیز مٹادی - جو مستبد نظام شاہی صدیوں سے چلا آتا تھا اس کو سپرد خاک کرکے جمہور نے تاج خسروی پہنا اور اعلان کیا کہ حکومت کے مالک جمہور ہیں - ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس کا اثر تمام دنیا پر پڑنا تھا اور پڑا - تقریباً دنیا کے تمام ممالک اس نظریہ سے متاثر ہوئے اور اپنے اپنے طریقہ پر اس نصب‌العین کے حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے - اس لحاظ سے کہ یہ انقلاب کیسے رو نما ہوا ' اس کے کیا وجوہ تھے ؟ اس کا ذکر نہایت دلچسپ ہے - اس خیال کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولوی عبدالقادر صاحب نے انقلاب کے نہ صرف واقعات کا نہایت سلاست سے ذکر کیا ہے - بلکہ ان اسباب پر بھی بے لاگ محاکمہ کیا ہے جن سے انقلاب رونما ہوا - پھر انہوں نے جمہوریت کی ابتدا - اس کے مختلف ادوار - مجلس قومی اور بعض امور میں جمہوریت کی زیادتیوں کا حال دلچسپ طور پر لکھا ہے - اس کے بعد جمہوریت کا زوال اور افق فرانس پر نپولین اعظم کے

نپر اقبال کے طلوع کی داستان بیان کی ہے اور دکھایا ہے کہ نپولین کا دور حکومت چند باتوں کے علاوہ جمہوری خیالات کا حامل تھا - نپولین کا کوئی جانشین نپولین جیسا نہ ہوا جس سے شاہی کو زوال آگیا اور پھر جمہوریت از سر نو قائم ہوئی جو تاحال قائم ہے - مولوی عبدالقادر صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اردو زبان میں ایک قابل قدر کتاب کا اضافہ کیا جس سے امید ہے کہ طلبہ کافی طور پر مستفید ہوں گے -

(ر)

ہندستانی اکیڈیمی کی چوتھی ادبی کانفرنس

ہندستانی اکیڈیمی کی اصلی غرض یہ ہے کہ وہ اردو اور ہندی کی ترویج و ترقی میں کوشش کرے اور ان دونوں زبانوں کی باہمی مغایرت اور اجنبیت کو دور کرے - لیکن زبان و ادب کی حیثیت ایک دولت عامہ (Public property) کی ہے جس میں ملک کے ہر صاحب ذوق کو حصہ لینے کا حق حاصل ہے اور اصل یہ ہے کہ بغیر عام ماہرین علم و ادب کی امداد کے اکیڈیمی کی مذکورہ غائت کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی - اسی امر کو ملحوظ رکھ کر اکیڈیمی کے ارباب حل و عقد نے ایک سالانہ کانفرنس کا انعقا و ازبس ضروری سمجھا تھا ' تاکہ ہماری زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس میں شریک ہوں' اکیڈیمی ان کے گرانقدر مشوروں سے مستفید ہو اور باہمی تبادلۂ خیال سے ملکی زبان و ادب کے باب میں صحیح اور صالح خدمات انجام دے سکے -

چنانچہ اکیڈیمی کی تین کانفرنسیں منعقد ہو چکی تھیں کہ یکا یک گورنمنٹ نے اپنی امداد کی نصف رقم کم کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکیڈیمی کو اپنے اکثر ضروری پروگرام روک دینے یا کم از کم مختصر و محدود کر دینے پڑے ' کانفرنس کا انعقاد بھی اسی میں شامل تھا - سالانہ لکچر روک دئے گئے ' مطبوعات کی تعداد میں بھی کمی کر دیگئی مگر

جلسے التوا کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کانفرنس کو روک دینا ' اکیڈیمی کے اصل مقصد کے منافی ہے ' اس لئے جس طرح بھی ممکن ہوا ' کانفرنس کو جاری رکھنے کا عزم بالجزم کر لیا گیا - اور اس طرح اکیڈیمی نے اپنی چوتھی ادبی کانفرنس کا تہیہ مضبوط کر لیا اور اس کا اعلان اخباروں میں کر دیا گیا - اردو اور ہندی کے مشہور ادیبوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے گئے' اور عام شایقین سے اخباروں کے ذریعہ درخواست کی گئی کہ وہ کانفرنس میں شریک ہو کر اپنی ملکی زبان و ادب کے مباحث و مسائل میں حصہ لیں-

چنانچہ یہ چوتھی ادبی کانفرنس بصدارت مسٹر سچدا نند سنہا ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۳۶ع کو میور کالج کے وجیانگرم ہال میں منعقد ہوئی - مقامی ارباب علم اور ممبران اکیڈیمی کے علاوہ بہر و نجات کے مشاہیر ادب بھی شریک جلسہ تھے' ان میں سے چند مخصوص حضرات کے اسماے گرامی درج ذیل ہیں :—

۱—ہز ہائنس مہاراج رانا جھالا وار -

۲—جناب کرشن پرشاد صاحب کول -

۳—راے بہادر جناب پریاگ دیال صاحب -

۴—پنڈت گردھر شرما -

۵—مسٹر دین دیال گپتا -

۶—مولوی عبدالسلام صاحب ندوی -

۷—مولوی سعید انصاری صاحب -

۸—جناب سید حسین صاحب برنی -

۹—ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری -

۱۰—جناب حمید الدین خاں صاحب -

۱۱—مولانا سیماب صاحب -

۱۲—روش صدیقی صاحب ' وغیرہ وغیرہ -

کانفرنس کی شرکت کے لئے مختلف یونیورسٹیوں نے بھی اپنے اپنے نمایندے بھیجے تھے - ہندو یونیورسٹی بنارس کی جانب سے منشی مہیش پرشاد صاحب ' مسلم یونیورسٹی کی طرف سے مولوی حمید الدین خاں صاحب ' عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر محی الدین قادری ' ایم - اے پی ایچ ڈی ' آگرہ یونیورسٹی سے پنڈت اجودھیا ناتھ صاحب شرما ' الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم - اے ' پی ایچ ڈی تشریف لائے تھے -

۱۲ جنوری کو جلسے کی کارروائی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے افتتاحی خطبۂ صدارت سے شروع ہوئی جو بعینہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے رسالہ " ہندستانی " کے ساتھ منسلک کی جاتی ہے - اس کے بعد مسٹر سچدا نند سنہا کرسی صدارت پر متمکن ہوئے اور آپ نے اپنا خطبۂ صدارت انگریزی میں شروع کیا - کچھ حصہ پڑھنے کے بعد آپ نے بقیہ خطبہ پروفیسر امر ناتھ جھا کو پڑھنے کے لئے دے دیا - اس خطبہ کا بھی اردو ترجمہ ناظرین یہاں ملاحظہ فرمائینگے - اس کے بعد ہندستانی اکیڈیمی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر تارا چند ' ایم - اے ' ڈی فل نے ' شکریہ ' کے عنوان سے کچھ خیالات ہندستانی زبان کے بارے میں ظاہر فرمائے - وہ تحریر بھی بعینہ یہاں درج کی جاتی ہے - اس کے بعد اردو اور ہندی کا مشترکہ اجلاس شروع ہوا ' اردو کی جانب سے مولوی عبدالحق صاحب بی - اے ' اور ہندی کی جانب سے پنڈت گنگا ناتھ جھا نے خطبۂ صدارت پڑھا ' مولوی عبدالحق صاحب کا خطبۂ صدارت بعینہ اور پنڈت گنگا ناتھ جھا کے ہندی خطبۂ صدارت کا ترجمہ ناظرین یہاں ملاحظہ فرمائینگے -

کانفرنس کے مشترکہ اجلاس میں مندرجۂ ذیل مقالے پڑھے گئے :—

۱—مولوی محمد اجمل خاں صاحب ' شانتی نکیتن ' بنگال ... " اردو اور ہندی کو متحد بنانے میں رومن رسم الخط نہایت ضروری ہے " -

۲—مسٹر سید حسین صاحب برنی ' بلند شہر ... ... " کرامت نامۂ شاہ دَولا " -

۳—ڈاکٹر بنارسی پرشاد صاحب سکسینہ ' ایم - اے ' پی ایچ ' ڈی ' الٰہ آباد ... ... " امرا ' عہد سلطانی میں " -

۴—رائے بہادر بابو پریاگ دیال صاحب ' لکھنؤ ... ... " اودھ کے سکّے " -

۵—پنڈت کرشن پرشاد صاحب کول' لکھنؤ ... ... " اردو ' ہندی ' ہندستانی " -

۶—مولوی عاشق حسین صاحب سیماب ' آگرہ ... ... عہد جدید کی تعمیر و تہذیب میں ادب اردو کا عملی حصّہ -

۷—رائے بہادر پنڈت سکھ دیو بہاری مسرا ' لکھنؤ ... ... ہندی' ہندوستان کی عام زبان -

۱۳ اور ۱۴ جنوری کو اردو اور ہندی کے علحدہ علحدہ اجلاس منعقد ہوئے - اردو کے اجلاس میں مندرجہ ذیل مقالے پڑھے گئے -

۱—مولوی سید سعید انصاری صاحب ' کانپور ... ... " ہندستانی ادب کی تشریحی قوت "

۲—خاں صاحب سید افضل حسین صاحب ' فیض آباد ... " مہر نیمروز " -

۳—منشی مہیش پرشاد صاحب بنارس ... ... " غالب " -

۴—سید رفیق حسین صاحب '
ایم - اے ' الہ آباد ... ... " ابتدائی اردو ادب میں مذہب کا عنصر " -

۵—مولوی عبدالسلام صاحب
ندوی ' اعظم گڑھ ... ... " اردو شاعری میں ایک انتخاب کی ضرورت " -

۶— مولوی نعیم الرحمن صاحب '
الہ آباد ... ... " اردو میں اوقاف قراءت " -

۷—مولوی عبدالماجد صاحب '
دریا بادی ... ... " اردو کا واعظ شاعر " -

۸—مسٹر ریاض الحسن صاحب '
ایم - اے ' الہ آباد ... ... " آرٹ اور حقیقت " -

۹—مولوی سید مقبول احمد
صاحب ' صمدنی ... ... " سلطان خسرو " -

۱۰—حاجی غلام محمد صاحب '
ایم - ایس - سی ' الہ آباد ... " ایتھر " -

۱۱—ڈاکٹر محی الدین قادری '
ایم - اے ' پی ایچ ڈی حیدرآباد ... " دور آصفیہ میں حیدرآباد کی اردو شاعری "

۱۲—مسٹر روش صدیقی ... بہاری ست سئی میں فارسی تراکیب -

مذکورہ بالا مقالوں کے علاوہ ذیل کے مضامین بھی موصول ہوئے تھے جو پڑھے ہوئے مقالوں میں شمار کرلیے گئے -

۱—قاضی احمد میاں اختر '
جونا گڈھی - ... ... " علامہ شبلی بہ حیثیت شاعر " -

۲—مولوی نورالحسن صاحب
نیر ' لکھنؤ ... ... " ہندی زبان اور مسلمانوں کا طبعی رجحان "

۳—مولوی لطیف احمد، آگرہ ... "اردو کی شستگی اور نفاست میں آگرہ کا حصّہ" -

۴—مولوی نصیرالدین ہاشمی، حیدرآباد ... ... "سلاطین دکن کی ہندستانی شاعری" -

اردو کے اجلاس میں ڈاکٹر زبید احمد صاحب، لکچرار، الہ‌آباد یونیورسٹی نے ایک تقریر فرمائی جس میں موصوف نے اس پر زور دیا کہ ہندستانی اکیڈیمی کی جانب سے ایک اردو قواعد کی تیاری از بس ضروری ہے - اس تقریر پر نیز مولوی نعیم‌الرحمن صاحب کے مضمون "اردو میں اوقاف قرائت" پر مباحثے شروع ہوئے جس میں حاضرین نے بڑی دلچسپی سے حصہ لیا اس میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی پر مغز تجاویز خاص اہمیت رکھتی تھیں - بالآخر ان مباحث کا یہ نتیجہ ہوا کہ کانفرنس کے شعبۂ اردو نے یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ ہندستانی اکیڈیمی دو کمیٹیاں ایسی مقرر کرے جو "اردو اوقاف قرائت" کی جزئیات پر غور کرے، اس کے سائنٹفک اصول بنائے اور اردو کی ایک نئی قواعد تیار کرے -

۱۳ اور ۱۴ جنوری کے شعبۂ ہندی کے اجلاس میں مندرجہ ذیل مقالے پڑھے گئے :—

۱—سری جت سوریا کرن پاریک ... ... "اپبھرنش زمانے کے اواخر میں عام زبان" -

۲—پنڈت ماکھن لال چترویدی کھنڈوا ... ... "آرٹ" -

۳—ڈاکٹر اومیش مسرا، ایم - اے، ڈی - لٹ - الہ‌آباد ... بھارت میں پراچین وشنو سمپردائے -

۴—سری جت گلاب رائے، ایم - اے
آگرہ ... ... جدید لٹریچر کی ضرورت -

۵—ٹھاکر سری ناتھ سنگھ،
الہ آباد ... ... بھوشن اور اسکی شاعری -

۶—پنڈت نرندو شرما - الہ آباد ... " جدید هندی شاعری " -

۷—شری رگھوبر متھو سال
شاسٹری - ایم - اے ، الہ آباد ... " هندی کے کایستھ مصنفین "

۸—رائے بہادر پنڈت سکھ دیو
بہاری مسرا ، لکھنؤ ... ... " هندو مذهب کی تاریخ میں دَس مدارج " -

۹—سری جت اقبال ورما سحر ،
فتحپور ... ... " انتقاد ادب "

۱۰—ڈاکٹر دهیریندر ورما ،
ایم - اے ، ڈی - لٹ ، الہ آباد ... " اودہ کے ضلعوں کے نام " -

۱۱—پنڈت رام نریش ترپاٹھی ،
الہ آباد ... ... تلسی داس کی زندگی پر نئی روشنی -

۱۲—سری جت ماتا پرشاد گپت،
جونپور ... ... " رام چرتر مانس کی تصنیف کی حقیقی تاریخ " -

۱۳—مسٹر جی پی سریواستو -
گونڈہ ... ... ڈراما بنام تاکی -

ٹھاکر سری ناتھ سنگھ کے مضمون پر کچھ مباحث پیدا ہوئے جس میں راؤ راجہ رائے بہادر ، پنڈت شیام بہاری مسرا اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے حصہ لیا -

پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے مضمون پر بھی کچھ بحثیں پیدا ہوئیں جس میں ڈاکٹر دھیریندر ورما اور ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے حصہ لیا - اسی جلسہ میں ڈاکٹر گورکھ پرشاد نے " هندي میں سائنٹفک لٹریچر " کے عنوان سے ایک لکچر دیا اور اس کے ذرایع اشاعت پر بھی بحث کی -

وقت کی کمی کے باعث چند مضامین پڑھے نہیں جاسکے اور اس لئے اس کانفرنس کے پڑھے ہوئے مقالوں میں شمار کر لئے گئے ان کی تفصیل یہ ہے :—

۱—بشیشر ناتھ ریو ' ساهتیہ
آچاریہ ' جودھپور ... ... مارواڑ کی مہراز کو مختلف اوقات میں امداد " -

۲—نالینی موهن سانیال ' ایم - اے
ندیا - بنگال ... ... نیرو کوی -

۳—ڈاکٹر پتمبر دت برتھوال '
ایم - اے ' تی - لٹ ' بنارس ... " ناگارجن " -

۴—سري جت واسدیو سرن ' ایم - اے
متھرا ... ... " مها بهارت میں ادبی طرز " -

۵—سري جت بھاگیرتھ پرشاد '
لکھنؤ ... ... " مت رام " -

۶—هرهر پرشاد گپتا ' بی - اے
الہ آباد ... ... " تلسی داس کا زمانہ انتقال "

کانفرنس هی کے سلسلے میں ۱۲ اور ۱۳ جنوري کو ایک مشاعرہ اور کوي سمیلن بھی منعقد کیا گیا تھا جس میں اس صوبے کے مشہور هندي اور اردو شعرا نے شرکت فرمائی تھی - مشاعرہ اور کوي سمیلن دونوں بہت کامیاب رهے -

افتتاحی خطبۂ صدارت

از

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو

کے ' سی ' ایس 'آئی ۔ پی ۔ سی

جو

ہندستانی اکیڈیمی ممالک متحدہ کی چوتھی ادبی کانفرنس کے موقع
پر ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۳۶ کو دیا گیا ۔

معزز حاضرین !

آج چار سال کے بعد اس اکیڈیمی کو آپ کی شرکت کا فخر حاصل ہوا ہے - سب سے پہلے میرا فرض یہ ہے کہ میں آپ کا خیر مقدم کروں اور اُن زحمتوں کا شکریہ ادا کروں جو آپ نے کانفرنس میں شرکت کے لئے گورا فرمائی ہیں -

حضرات ! پچھلے چار سال میں اکیڈیمی کو جن چلد در چلد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُن میں سب سے بڑی مشکل ' جس کی زد سے ہم اب تک محفوظ نہیں ہیں ' وہ روپیہ کی قلت ہے - گورنمنٹ نے جس کی امداد پر اکیڈیمی کے وجود کا انحصار ہے ' اپنے عطیہ میں سے نصف یعنی ۵۰ فیصدی کی رقم تخفیف کردی ہے - اگر یہ مشکل ہمارے راستے میں حائل نہ ہوتی تو میں خیال کرتا ہوں کہ دو تین جلسے اس کانفرنس کے اب تک اور منعقد ہوگئے ہوتے - اسی وجہ سے ہماری کوشش و سعی کا دائرہ محدود ہوگیا ہے بایں‌ہمہ ہم اپنے مقاصد سے غافل نہیں رہے - یعنی باوجود ان دقتوں کے اس چار سال میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اسی عرصہ میں اکیڈیمی نے ہندی اور اردو کے دو رسالے بھی جاری کئے جو بہ ادارت مولوی اصغر حسین صاحب ' اصغر اور مسٹر رام چندر ٹنڈن ہر تین ماہ کے بعد شایع ہوتے ہیں - ان میں ملک کے مشہور ادیبوں کے مضامین نکلتے رہے ہیں اور ان مضامین کے تذکرے اور

حوالے دیگر کتب و رسائل میں بھی پائے جاتے ھیں ' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان رسالوں کا پایہ بلند اور ادبی دنیا میں ان کو خاص وقعت حاصل ہے -

اس اکیڈیمی کا دوسری اکیڈیمیوں سے مقابلہ کرنا اس وقت انصاف سے بعید ہوگا - فرانس میں جو اکیڈیمی ہے وہ بحکم شاہی سنہ ۱۶۳۵ع میں قائم کی گئی تھی ' ابتدا میں اس کے ممبر صرف چالیس تھے - سنہ ۱۷۹۵ع میں جب کہ فرانس میں انقلاب ہو رہا تھا ' نپولین نے اس کی دوبارہ ترمیم کی اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس میں ترمیمیں ہوتی رہیں - میتھیو آرنلڈ نے اس اکیڈیمی کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ "یہ ادب کی عدالت العالیہ اور صحیح مذاق کا مرکز ہے" ایک فرانسیسی ادیب نے ان شیدائیان ادب کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نہ کہو کہ ان کی زندگی بیکار گئی ' اگرچہ ان کے نام ہر وقت لوگوں کے سامنے نہیں لیکن ان کے کارنامے ہماری تمام زندگی پر چھائے ہوئے ہیں ' یعنی انہیں کی بدولت فرانسیسی زبان کی توسیع و تصحیح ہوئی -

گذشتہ جون میں ' میں پیرس میں تھا ' اس وقت اس اکیڈیمی کا تیسرا صد سالہ جلسہ اس کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا ' میں بھی اس جلسے میں موجود تھا - اسی جلسے کے متعلق اس کی عظیم‌الشان اور وسیع عمارت میں نمایش بھی ہوئی تھی جس کے دیکھنے کے لئے ایک ہفتہ بھی کافی نہ ہوسکتا تھا - اس اکیڈیمی کے کتب خانے اور نمائش کے دیکھنے کے لئے ایک دن میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے ٹکٹ خریدے تھے - فرانس کے ایک ایک مرد و زن کو اکیڈیمی کے وجود و ہستی پر فخر و ناز تھا - اس اکیڈیمی کا دار و مدار محض گورنمنٹ کی امداد پر نہیں بلکہ تمام قوم کی فراخ دلی و فیاضی پر ہے - اسی طرح میں اور اکیڈیمیوں کا بھی

ذکر کر سکتا تھا لیکن اس وقت بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں - ہماری اکیڈیمی کو قائم ہوئے آٹھ سال ہوئے ' جن اکیڈیمیوں کو قائم ہوئے تین تین سو سال ہوگئے ' اُن سے اس ہشت سالہ بچے کا مقابلہ ' ظاہر ہے کہ بالکل غلط اور اسلئے فضول ہے - مگر جب ہماری قوم میں خصوصاً اس زمانے میں یہ احساس روز بروز بڑھتا جاتا ہے کہ کسی قوم کی تعلیم غیر زبان میں ہونا دشوار ہے ' صحیح تعلیم کی اشاعت کے لئے دراصل اپنی ہی زبان موزوں ہو سکتی ہے ' اس صورت میں یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ہمارے دولتمند اہل وطن اس اکیڈیمی کو بھی اپنی فیاضی سے مدد پہونچائینگے - میرے خیال میں اس اکیڈیمی کی بنیاد اُس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتی جبتک اسکے پاس معقول سرمایہ نہ ہو جائے اور اسکے کام کرنے اور کتبخانے کے لئے ایک مستقل عمارت نہ طیار ہو جائے - میں امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات ہماری اس کوشش میں پوری مدد فرمائینگے -

میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں قومی اتحاد کی بنیاد کوئی ہوسکتی ہے تو وہ مشترکہ ادب یا مشترکہ زبان ہے - ہم میں اگر ایک دوسرے کے ادب و شعر اور تاریخ و فلسفہ کی قدر پیدا ہو جائے یا بہ الفاظ دیگر ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگیں تو بہت کچھ اختلافات اور غلط فہمیاں ' جو اس وقت ہمارے لئے باعث ننگ ہیں ' دور ہوسکتی ہیں - اور اس طرح " ایک متحدہ ہندوستان " کے خواب کی تعبیر محسوس طور پر ہمارے سامنے آسکتی ہے - اس اکیڈیمی کا یہ فرض ہے کہ وہ ان مقاصد کی تکمیل کی کوشش کرے اور اہل وطن اگر اس مقصد کو مبارک سمجھتے ہیں تو اس میں اسکی مدد فرمائیں - اس سلسلے میں آپکے سامنے چند تجریزیں پیش کی جائیں گی ' میں

اُنکے بارے میں فی الحال کچھ عرض نہیں کرسکتا ، منتظمان ادارہ آپ کے مشوروں سے مستفید ہونے کے لئے طیار ہیں اور سب سے بڑی غرض و غائت اس کانفرنس کی یہی ہے -

آخیر میں، میں اکیڈیمی کو مبارک باد دیتاہوں کہ اسنے اپنی کانفرنس کا صدر مرے عزیز دوست مسٹر سچدانند سنہا کو منتخب کیا ہے - سنہا صاحب نے صرف قانونی یا سیاسی معاملات ہی میں شہرت نہیں حاصل کی ہے بلکہ ادبی دنیا میں بھی ایک بلند پایہ رکھتے ہیں ' آپ نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی ہے، چنانچہ پٹنہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ جس میں بیش بہا کتابیں موجود ہیں آپنے پبلک کو نذر کیا ہے -

قبول صدارت کے لئیے اکیڈیمی کی جانب سے میں آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ جلسہ آپ کی صدارت میں نمایاں کامیابی حاصل کرے گا -

خطبۂ صدارت

از

مسٹر سچدا نند سنہا

بار - ایٹ - لا ، پٹنہ

جو

ہندستانی اکیڈیمی کی چوتھی ادبی کانفرنس میں دیا گیا ۔

معزز ممبران هندستانی اکیڈیمی و دیگر حاضرین !

آپ لوگوں نے مجھ کو هندستانی اکیڈیمی کی کانفرنس کا صدر منتخب کرکے جو عزت بخشی هے اس کے لئے میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا هوں - میرے خیال میں صدارت کے لئے میرا انتخاب صرف ایک حیثیت سے درست هے - وہ یہ کہ میں بھی ان لوگوں میں سے هوں جو یہ سمجھتے هیں کہ هندستانی میں وقت گذرنے کے ساتھ هندوستان کی عام زبان کی صلاحیت بہ‌نسبت هندی اور اُردو کے کہیں زیادہ هے جو اسی زبان کی پر تکلف ادبی شکلیں هیں - یہی نہیں بلکہ اس میں سب درجہ کے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے هندی اور اردو سے زیادہ هر قسم کا ادب پیدا کرنے کی قابلیت موجود هے - میں اس سلسلے میں کچھ اور بعد میں بھی عرض کروں گا - فی‌الحال مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجائے کہ مجھ کو صدر منتخب کرکے آپ لوگوں نے باقاعدہ تسلیم کر لیا کہ میرا وطن صوبہ بہار بھی هندوستان کی زبانوں کے آئندہ اتحاد میں ایک اهم درجہ رکھے گا - جس کے لئے میں آپ کا سچے دل سے شکریہ ادا کرتا هوں - میری ناچیز رائے میں هندوستان کا لسانی اتحاد جس میں هندستانی عام زبان هوگی اسیقدر اهم هے جتنا کہ ملک کا انتظامی اتحاد جو نئی اصلاحات کی تحت میں قائم کیا جانے والا هے -

هندستانی اکیڈیمی جس کے سلسلے میں هم لوگ آج یہاں جمع هوے هیں تقریباً آٹھ سال پہلے ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۲۷ع میں حکومت

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی ایک تجویز کے ماتحت قائم ہوئی تھی اور اس ادارہ کو اسی سال ہزاکسیلنسی سر ولیم میرس گورنر صوبجات متحدہ نے لکھنو میں ۲۹ مارچ کو باقاعدہ کھولا - مجھے یہ یاد کرکے بہت خوشی ہوتی ہےکہ اس اکیڈیمی کا وجود میرے معزز دوست انریبل رائے راجیشوربلی کی بدولت ہے جو اُس زمانے میں وزیر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ تھے اور جن کو شمالی ہندستان کی خاص زبانوں اور ان کے ادب سے بہت دلچسپی ہے - ابتدا میں اکیڈیمی کو صوبہ کی حکومت سے پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی رقم منظور ہوئی لیکن افسوس ہے کہ مالی مشکلات کی بنا پر یہ رقم بہت زیادہ گھٹا دی گئی - اس کی وجہ سے مجبوراً اکیڈیمی کو بھی کام کم کردینا پڑا - مجھکو قوی امید ہے کہ حالات بہتر ہونے پر وزارت تعلیم کے لئیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ پھر اتنی ہی رقم کی منظوری دے ' جتنی پہلے ملی تھی جسکی کمی کا مجھے یقین ہے کہ مقامی حکومت کو بھی اتنا ہی افسوس ہوگا جتنا کہ ہندستانی اکاڈیمی کے ممبروں کو -

جہاں تک مجھے معلوم ہے برطانوی ہندستان کے کسی صوبہ میں ہندستانی اکیڈیمی سے بالکل ملتا جلتا کوئی اور ادارہ نہیں ہے- چونکہ اس ادارہ کا قیام صوبہ کی کونسل ہی کی خواہش کے مطابق ہوا تھا اس لئے کچھ عرصے بعد بہار اور اوڑیسہ میں بھی کوشش کی گئی کہ حکومت دو ادبی ادارے ' ایک پٹنہ اور دوسرا کٹک میں قائم کرے - صوبہ کی حکومت نے اس تجویز کو منظور کرلیا - اس سلسلے میں وزیر تعلیمات (سر محمد فخرالدین مرحوم) نے نمائندوں کی ایک کمیٹی سر علی امام مرحوم کی صدارت میں مقرر کی تاکہ وہ بہار اور اوڑیسہ میں ادبی ادارے قائم کرنے کے لئیے اسکیم بنائے - اس اکیڈیمی کے کئی ممبر بہار اور اوڑیسہ کمیٹی میں رکھے گئے اور آخرکار سر علی امام نے ایک اسکیم پیش کی

جو میری راے میں معقول اور قابل عمل تھی - اسوقت تک بہار اور اوڑیسہ کی حکومت سخت مالی مشکلات میں پڑ گئی تھی - اس لئے رپورٹ داخل دفتر کر دی گئی اور اب تک یہ تجویز نہ تو صوبہ کی وزارت تعلیم ہی نے پھر پیش کی اور نہ کونسل کے دوسرے ممبروں نے - مجھے اس بات کا بہت سخت افسوس ہے اور میں اس امید کی جسارت کرتا ہوں کہ بہت جلد بہار میں بھی ہندستانی اکیڈیمی قائم ہوجائے گی - عنقریب آئندہ زمانے میں جبکہ اوڑیسہ کی نظام حکومت کی علیحدگی سے شاید بہار کی حکومت کا بار کم ہوجائے اُس وقت وہ پٹنہ میں ایک ایسی ہی ہندستانی اکیڈیمی قائم کرسکے جیسی اس صوبہ کی الہ‌آباد میں موجود ہے -

یہ ادارہ تقریباً آٹھ برس سے قائم ہے اور میری راے میں اس نے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جن کے لئے یہ قائم کیا گیا تھا بہت اچھا کام کیا ہے - اس کی خدمات کی یادداشت اس کی سالانہ رپورٹوں میں ملیگی لیکن میں جنرل سکریٹری ڈاکٹر تارا چند صاحب کو مشورہ دوں گا کہ اگر اس ادارے کے گذشتہ آٹھ برس کے کاموں کی وہ ایک مختصر جامع رپورٹ شائع کردیں تو اور زیادہ بہتر ہو - جہاں تک میں سالانہ رپورٹوں کو پڑھکر معلوم کر سکا ہوں اکیڈیمی نے اب تک ستّایس کتابیں ہندی اور انیس اردو میں شائع کی ہیں جس میں تصنیفات اور ترجمے شامل ہیں - جہاں بہت سی تصنیفات عمدہ اور قابل قدر ہیں وہیں ترجمے اور تالیفات بھی بہت کار آمد ہیں - ان کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اکیڈیمی نے اپنے قیام کے زمانے سے سنہ ۱۹۳۳ع تک مشہور اسکالروں کے چھ اردو اور چھ ہندی میں لکچروں کا بھی انتظام کیا تھا - یہ لکچر جن میں سے کچھ، یا تو اسی زبان میں جس میں وہ تھے یا اردو سے

هندي اور هندی سے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کردئیے گئے هیں جو حقیقتاً اکیڈیمی کے کاموں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی - لیکن مجھے یہ معلوم کرکے بہت افسوس هوتا هے کہ سنہ ۱۹۳۴ع سے وہ بند کردئیے گئے اور غالباً اس کی وجہ یہی تھي کہ گورنمنٹ نے رقم کی منظوری بہت کم کردي تھی -

همارے کاموں کے پروگرام میں دوسري مد مشہور مصنفین اور یونیورسٹیوں کے قابل طلباء کی هندی اور اردو کی عمدہ کتابوں پر انعامات دینا هے - هندوستان میں ایک تنہا ادبي اکیڈیمی هونے کی حیثیت سے اس کا یہ کارنامہ بھی ویسا هی اچھا هے کیونکہ دونوں زبانوں میں ملاکر مبلغ آٹھ هزار روپئے عمدہ کتابوں کے عام مصنفین کو اور مبالغ آٹھ سو روپئے یونیورسٹیوں کے طلبا کو دئے گئے تاکہ ان کو هندی اور اردو کی عمدہ کتابیں لکھنے کی ترغیب دی جائے - مجھے اس میں بھی شک نہیں هے کہ مبلغ نو هزار روپئے انعامات میں دے کر اکیڈیمی نے شمالی هندوستان کے ورناکیولر لٹریچر کو ترقی دینے میں بڑي خدمت کی هے -

" هندوستانی " جو اردو اور هندی میں اکاڈیمی کا ثماهی رسالہ هے سنجیدہ مضامین پر پراز معلومات مقالے شائع کرتا هے اور ایک بلند عملی معیار قائم رکھتا هے - ان ٹھوس اور نمایاں خدمات کے علاوہ هندوستانی اکیڈیمی نے اور بھي کام کیے هیں جو اس طرح شمار نہیں کیے جاسکتے اور جن کے نتائج وقت کے گذرنے کے ساتھ ظاهر هوں گے - هندستانی بولنے والے لوگوں میں سائنٹفک اور ادبی تصنیفیں شائع کرکے اس نے عوام کے ذهنوں پر ایک ایسا اثر ڈالا هے جس کے مفید نتیجے آگے چل کر ظاهر هوں گے - یہ اردو اور هندی کے مصنفین کو ایک هی نظام میں ملاکر اور ان زبانوں میں سادگی پیدا کرکے اس خلیج کو پر کرنا چاهتی هے جس کا وجود

ایک ادبی اور سماجی خطرے سے کم نہیں - آخری بات یہ ہے کہ اکیڈیمی آپ کی کمیٹیوں کے ذریعے سے ' جو ادبی مشورے دیتی ہیں اور انعامات دے کر ' ادبی پیداوار پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہے اور ورناکیولر زبانوں کا ادبی معیار بڑھاتی ہے -

میں نے اکیڈیمی کے قیام سے اب تک اس کے تمام کاموں اور ان کی نوعیت پر ایک سرسری نظر ڈال کر آپ لوگوں کا وقت فضول نہیں صرف کیا ہے کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ اس صوبے میں بھی لوگ ان تمام باتوں سے بے خبر ہیں - چوں کہ اس قسم کی کانفرنس کا جیسی ہم لوگوں نے کی ہے ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ جہاں اور باتیں ہوں وہاں عوام کو ان امور سے باخبر کر دیا جائے اس لئے میں نے یہ بہتر سمجھا کہ اکوڈیمی کے تمام کاموں پر ایک سرسری نظر ڈالوں تاکہ پبلک اور مقامی حکومت صاف صاف ہماری آٹھ سال کی خدمات کا صحیح اندازہ کرسکے - اب تک یہ ادارہ گورنمنٹ کی منظور کی ہوئی رقم اور اس تھوڑی سی آمدنی کی بدولت چل رہا ہے جو رسالے اور کتابوں سے حاصل ہوتی ہے - اس کو چاہئے کہ یہ اپنی خدمات کو انجام دینے کے لئے پبلک سے امداد اور چندہ طلب کرے - ایسا نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے - مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ اگر اس قسم کی اپیل کی گئی تو ہندی اور اردو کے شائقین بہت فیاضی سے اس کا خیر مقدم کریں گے - جو کچھ بھی ہو بہر حال کوشش تو کرنی چاہئے -

اسی سلسلے میں ' میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے خیال سے اکیڈیمی کی تحت میں سالانہ کانفرنس کا ہونا بہت ضروری ہے اور بہتر یہ ہے کہ ان صوبوں کی مختلف خاص جگہوں پر ہو اور اگر ممکن ہو تو اس کے حدود کے باہر دوسرے ہندستانی بولنے والے خطوں میں بھی ہو تاکہ

اہل علم اور وہ سب لوگ جو شمالی ہندوستان کے ورناکیولر لٹریچر کی ترقی میں دلچسپی لیتے ہیں مل کر ایک دوسرے سے ان تمام مسئلوں پر بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کرسکیں جن کا تعلق ہماری اکیڈیمی کے مقاصد اور خدمات سے ہے مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اس تجویز کی تائید ' ہندی کے ایک نئے رسالے " ہنس بمبئی " کے دسمبر نمبر میں ایڈیٹر کی جانب سے ہوئی ہے اگر میری یاد داشت صحیح ہے تو اکیڈیمی کی کانفرنس اب سے چار سال پہلے سنہ ۱۹۳۲ع میں ہوئی تھی جو اب سے تقریبا چار برس ہوئے - یہ وقفہ یقیناً بہت زیادہ ہے - میرے خیال سے آئندہ کے لئے ہم کو یہ اصول بنا لینا چاہئے کہ اپنی کانفرنس سالانہ منعقد کریں - شائد ہماری اگزیکیوتیو کاونسل اب تک اس جلسے کا انتظام صرف اس لئے نہیں کرسکی کہ اس کی آمدنی گھٹ گئی تھی - اگر ایسا ہے تو ہم کو اور زیادہ چاہئے کہ اپنی ضروریات کو پبلک اور مقامی حکومت کے سامنے پیش کریں تاکہ آئندہ ہم ان فیاض لوگوں کی امداد سے جن کو ہمارے کام میں دلچسپی ہے اپنے کام کو اور زیادہ عمدگی کے ساتھ جاری رکھ سکیں -

یہاں تک میں نے اس ادارے کے صرف کاموں پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے - میں نے یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ ہم کو اپنی مالی حالت درست کرنی چاہئے اور ذرائع آمدنی بڑھانے چاہئیں تاکہ ہم آئندہ اور زیادہ سرگرمی سے قابل اطمینان کام کر سکیں - لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا فرض اس وقت تک نہیں ادا ہوگا جب تک کہ میں ان مسئلوں پر اپنے خیالات کا اظہار صاف صاف نہ کردوں جو ہمارے تمام کاموں کے پس پردہ ہیں - آنریبل راے راجیشور بلی نے سر ولیم میرس کو ہندستانی اکیڈیمی کو قائم کرنے کی دعوت

دیتے ہوے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ " اکیڈیمی ایک ایسی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کریگی جسے پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ سب سمجھ سکینگے" مجھے اس نصب‌العین سے پورا اتفاق ہے - سر ولیم مورس نے وزیر تعلیمات کی اس بات کا جواب جس کا حوالہ دے چکا ہوں ان الفاظ میں دیا :
" ہر ہندی لکھنے والے کا نصب‌العین یہ ہونا چاہئے کہ گویا وہ مسلمانوں کے پڑھنے کے لئے لکھ رہا ہے اور اسی طرح اردو لکھنے والے کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ گویا وہ ہندوؤں کے پڑھنے کے لئے لکھ رہا ہے - مثلاً اگر اردو لکھنے والے بلاوتی عربی فقرے اور ہندی لکھنے والے سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈھ کر بے تکلف اپنی زبان میں لائینگے اور اُسکو مشکل بنا دینگے تو وہ دوہرا گناہ کرینگے - پہلا تو یہ کہ اس طرح وہ جان بوجھ کر اپنے تئیں اپنے پڑھنے والوں کو دوسرے فرقے سے علحدہ کردینگے جو بلا شبہ ادب نہیں بلکہ سماج کے لحاظ سے بڑی بات ہے - دوسرا یہ کہ اس طرح رفتہ رفتہ اُنکی کتاب عام آدمی کے سمجھ کے باہر ہوجائیگی جو اکیڈیمی کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہے - مجھے پورا اعتماد ہے کہ اکیڈیمی کے با اختیار لوگ اسکی روک تھام کی پوری کوشش کرینگے " -

یہ الفاظ خود بہت صاف اور واضح تھے - لیکن ہماری سنہ ۱۹۳۱ع کی کانفرنس میں آنریبل سر شاہ محمد سلیمان نے اپنے خطبۂ صدارت میں اکیڈیمی کے اغراض و مقاصد کو اور زیادہ کھولتے ہوئے الفاظ میں یوں سمجھایا - " اکیڈیمی کی یہ حکمت عملی طے ہوچکی ہے کہ وہ ایک عام زبان پیدا کرے جسکے لئے صرف انہیں الفاظ کو اختیار کرے جو عام طور سے استعمال کئے جاتے ہوں اور مشکل و نامانوس الفاظ کو ترک کرے خواہ وہ عربی و فارسی کے ہوں یا سنسکرت کے - اسکی کوشش یہ ہوگی کہ وہ پرانے مشرقی ادب کے نامانوس الفاظ کو نکالے جو روز مرہ کی بول چال میں استعمال

نہیں کئے جاتے اور اونکی جگہ اُن سادے الفاظ کو رواج دے جسے ہر ایک آسانی سے سمجھ سکتا ہے - مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی اکیڈیمی رفتہ رفتہ اس صوبے کی تمام مختلف زبانوں کو ملاکر ایک کردیگی - ایک عام زبان حاصل کرنے میں برابر ترقی کی جارہی ہے حالانکہ لکھنے کے لئے دونوں خطوط عرصے تک قائم رکھنے پڑینگے " -

اِس اکیڈیمی کے بانیوں' گورنر اور وزیر تعلیمات اور ہماری پہلی کانفرنس کے صدر موجودہ چیف جسٹس کے ان اعلانات کو پیش نظر رکھکر میں تھوڑا سا وقت اس بحث میں صرف کرنا چاہتا ہوں کہ کہاں تک اس ادارے کے حامیوں اور بانیوں کا اصل مقصد حاصل ہوا ہے - میں اس سلسلے میں کچھ مشورے پیش کروں کا جس کو اگر اپ نے پسند کیا تو اکیڈیمی کے منتظمین اسکے کاموں کی توسیع اور ازسرنو تنظیم میں اُسے کام میں لاسکتے ہیں - جہانتک کہ زبان کو سادہ بنانے اور ایک عام بول چال کی زبان کو ترقی دینے کا سوال ہے میرے خیال سے یہ بڑے بڑے علوم و فنون کو عام زبان میں تعلیم دینے کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ پبلک کو سیاسی تعلیم دینے کے لئے - لیکن مجبوراً مجھے صاف صاف الفاظ میں لکھنا پڑتا ہے کہ اکیڈیمی نے ابھی تک اس پر کافی توجہ نہیں کی ہے - اس سے پہلے ۱۹۳۱ع کی کانفرنس میں جناب صدر انریبل سر شاہ محمد سلیمان کی خواہش کے بموجب میں نے مسئلہ کے اس پہلو پر لوگوں کو توجہ دلائی تھی اور اِس پر مطمئن ہوگیا تھا کہ کانفرنس نے ایک کمیٹی مقرر کی کہ اس مسئلہ پر بحث کرے اور اس چیز کے حاصل کرنے کی تدبیریں اور راستے نکالے جسے گورنر اور وزیر تعلیمات کے اعلانات کو مدنظر رکھتے ہوے میں اس ادارے کا اصل مقصد سمجھتا ہوں - بدقسمتی سے مقررہ کمیٹی اس کام کو سر انجام

دینے کے لئے کوئی قابل عمل تدبیر نہ نکال سکی - یہ کم افسوس کی بات نہ تھی کہ میں اس کانفرنس کے ایک ممتاز ممبر کا ایک لوتھکل اخبار میں پڑھکر بہت متعجب ہوا جنہوں نے یہ لکھا تھا کہ اس ادارہ کا اصل مقصد وہ نہیں ہے جو اسکے بانی اور حامی بیان کرتے ہیں اور ایک ایسی عام بول چال کی زبان کو ترقی دینے کا خیال جسے شمالی ہندستان میں سب سمجھ سکیں فضول ہے - مجھے افسوس ہے کہ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوسکتا - تجربہ بتاتا ہے کہ ایک عام بول چال کی زبان نہونے سے شمالی ہندوستان کے صوبوں میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم ورناکیولر زبان میں نہیں دی جاسکتی جیسی کہ کچھ دوسرے صوبوں میں دی جاتی ہے - خاص طور پر بنگال میں جہاں اس کا انتظام مکمل ہوچکا ہے کہ تمام لڑکوں کو میٹریکیولیشن تک تعلیم بنگالی زبان میں دی جائے - یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بنگالی سارے بنگال کی عام زبان ہے اور اسکی کثیر آبادی اسی کو لکھتی اور پڑھتی ہے چاہے ان کا مذہب و ملت کچھ ہو - صوبہ بنگال کو شمالی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بنسبت یہ بڑا فائدہ ہے جہاں ہندی کو اُردو سے اور اُردو کو ہندی سے بڑھانے کی ہمیشہ کوشش کی جاتی ہے حالانکہ دونوں ہندوستانی ہی کی مختلف صورتیں ہیں - جس زمانے میں سر هارکورٹ بٹلر ایجوکیشن سکریٹیری تھے اس صوبے میں بھی پرائمری اسکول میں ابتدائی تعلیم دینے کے لئے ایک عام زبان استعمال کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جہانتک میں جانتا ہوں اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ کوئی ایسی زبان موجود نہیں جو پڑھنے پڑھانے کے کام آسکے - حالانکہ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ میٹریکولیشن تک ورناکیولر ہی میں تعلیم ہوتی ہے اور امتحان میں امیدوار کو اجازت ہے کہ وہ چاہے

تو اسی میں جوابات بھی لکھے - اس طریقہ کی کامیابی اور ناکامیابی پر ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا - اس طریقہ میں یا تو پڑھانے والوں کی تعداد دوگنی کرنی پڑیگی جس میں روپیہ زیادہ صرف ہوگا یا پھر پڑھائی خراب ہوگی کیونکہ اگر پڑھانے والا دونوں زبانوں پر قدرت نہیں رکھتا تو وہ طلبہ کی ایک یا دوسری جماعت کی ضرورتوں کو پورا نہ کرسکیگا اور اگر اتفاق سے دونوں زبانیں جانتا ہے تو بھی اسکو بار بار اپنی باتوں کو دوہرانا پڑیگا جس سے اس کے پڑھانے کی رفتار سست ہوجائیگی -

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اب صوبہ بہار میں بھی ایک ایسی ہی کوشش ہونے والی ہے - اس صوبہ کے ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم مسٹر جی - ای- فاکس نے اپنی رپورٹ بابت سنہ ۳۵-۱۹۳۴ع میں لکھا ہے "ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ اسکول قائم کرنا اچھا ہوگا اور مستقبل میں ٹکسٹ بک کمیٹیاں بغیر خاص اجازت کے لور پرائمری تعلیم کے لئے کسی مضمون میں اور اپر پرائمری تعلیم کے لئے سوائے ادب کے باقی تمام مضامین میں کوئی ایسی کتاب منظور نہ کریںگی جو جہاں تک ممکن ہوسکے ایک ہی کتاب نہ ہو اور ناگری اور اردو دونوں خطوط میں نہ لکھی جا سکے" - پھر لکھتے ہیں " پڑھانے والوں سے بھی کہدیا گیا ہے کہ جب وہ ہندو اور مسلمان لڑکوں کو پڑھاتے ہیں تو انکو ایک ایسی ورناکیولر زبان اختیار کرنی چاہئے جسکو دونوں سمجھ سکیں - میں امید کرتا ہوں کہ یہ طریقہ پرائمری اسکول کے مسلمان لڑکوں کے لئے مفید ثابت ہوگا" -

میری رائے میں یہ طرز عمل بہت پسندیدہ ہے اور میری دلی خواہش ہے کہ مسٹر فاکس کی قابل تعریف کوششوں کو پوری کامیابی حاصل ہو - لیکن اور جگہوں پر اس قسم کی تدبیروں سے جو تلخ تجربے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے مجھے ڈر ہے کہ بہار میں بھی

کوئی کامیابی نہ ہوگی - بات یہ ہے کہ ہندی اردو کا جھگڑا محض سے ہندو مسلمان کے جھگڑے سے متعلق ہے - آپ کو یقیناً خبر ہوگی کہ شمالی مغربی صوبے میں خاص طور پر اور ملک میں عام طور پر اس صوبے کی وزارت تعلیم کے ایک سر کلر سے ہیجان پیدا ہوگیا ہے جس کی رو سے پرائمری درجوں کے بعد ہندی اور گُرمکھی کی تعلیم ملغ کر دی گئی ہے اور تمام طلبہ کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ اردو پڑھیں - آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں آپ کو اس جھگڑے میں نہیں کھینچنا چاہتا - لاہور کے ایک روزانہ اخبار میں میں نے سرکلر کے ایک حمایتی کا ایک ارٹیکل پڑھا اور ایک پیراگراف تک پہونچا جس کی سرخی یہ تھی " ایک ہندو اسکالر کا اقرار " -

یہ پیراگراف حسب ذیل تھا :— " میں نے ایک ہندو اسکالر ڈاکٹر تارا چند کی تاریخ ہندوستان کی ایک ٹکسٹ بک میں زبانوں کا نقشہ بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا - انہوں نے ہندوستان کو تقریباً بیس لسانی حصوں میں منقسم کیا ہے اور جو رقبہ انہوں نے ہندی زبان کے حصے میں رکھا ہے صوبہ متحدہ کا صرف ایک حصہ ہے - مجھے اس میں شک نہیں کہ اس ہندی کو بھی اردو زبان کی ایک شاخ کہا جا سکتا ہے جس طرح کہ اس زبان کی اور بھی شاخیں ہیں جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بولی جاتی ہیں - ایک ممتاز ہندو اسکالر کا یہ نظریہ ان لوگوں کے لئے قابل غور ہے جو ہندی کو سارے ہندوستان کی عام زبان سمجھتے ہیں " - اب چوں کہ ڈاکٹر تارا چند نہ صرف ایک اسکالر ہیں بلکہ اکیڈیمی کے سکریٹری بھی ہیں اس لئے میں نے قدرتاً اس کتاب کو دیکھا جس کا حوالہ دیا گیا تھا - آپ میرے تعجب کا اندازہ کر سکتے ہیں جب میں نے حسب توقع اس سائنٹفک لسانیاتی نقشۂ ہندوستان کو دیکھا اور اس میں اردو زبان کے حصے

کا کوئی خط زمین نہیں پایا - اس کی وجہ صرف یہ سیدھی سادی بات ہے جسے ہر اسکالر جانتا ہے کہ جسے اردو کہتے ہیں وہ صرف مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور یہ کوئی مستقل زبان نہیں ہے - پھر بھی وہ مصنف جس کا میں نے حوالہ دیا ہے ڈاکٹر تارا چند کی سند پیش کرکے لسانیاتی نقشے سے ایک غلط نتیجہ نکالتا ہے کہ " ہندی کو اردو زبان کی ایک شاخ کہا جاسکتا ہے " - خوش قسمتی سے ہم لوگ اس کانفرنس میں ان مسئلوں پر سیاسیات اور تعصب سے پاک رہ کر بحث کر سکتے ہیں -

میں نے اس حال کے واقعے کو صرف اس لئے دوہرایا ہے کہ آپ اندازہ کرلیں کہ ہوا کس رخ بہ رہی ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اردو ہندی کا جھگڑا ہندستانی زبان کی ان دو مختلف صورتوں کو الگ رکھنے کا ذمہ دار ہے - اسی کی وجہ سے یہ دونوں ملنے نہیں پاتیں کہ ان سے ہندستانی زبان تیار ہو جسے ہر طبقہ کے لوگ سمجھ سکیں اور جو وقت کے گذرنے کےساتھ سارے ہندوستان کی عام زبان قرار پائے - اصل بات یہ ہے کہ ایک مشترکہ زبان کو اس وقت تک پیدا کرنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ دونوں شکلیں دو مختلف ناموں کی تحت میں موجود ہیں اور ہر نام پبلک کے ذہن میں سیاسی خیالات پیدا کردیتا ہے - ہندی زبان میں ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ تمام غیر ملکی الفاظ خواہ وہ کتنے ہی عرصہ سے لوگوں کی زبان پر چڑھ کر اس کا جزو بن گئے ہوں نکال دیے جانے چاہیں - اور یہی نہیں بلکہ عام ہندی الفاظ جو روزمرہ گفتگو اور خط و کتابت میں برابر استعمال ہوتے ہیں خارج کر دیے جانے چاہیں - اسی طرح اردو زبان میں بھی یہ غلط فہمی ہے کہ اس زبان کولکھنے اور بولنے کا سب سے بلند معیار یہ ہے کہ کم سے کم ہندوستانی الفاظ استعمال کیے جائیں جن کا رکھنا بہت ضروری ہو اور جن کے بغیر

ایک جملہ بھی لکھنا یا بولنا ناممکن ہو اور بقیہ تمام الفاظ ایران اور عرب کی زبانوں سے بھرتی کر لیے جائیں -

میں اس موضوع پر بہت احتیاط سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں - اگر زبان کی ان دو مختلف شکلوں کے متعلق جیسا کہ یہ آج کل لکھی جاتی ہے جو کچھ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے غلط ہے تو مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہ ہوگا گر آپ اس کو صحیح کردیں گے - لیکن مجھے اس میں تامل ہے کہ جو کچھ میں نے اظہار رائے کیا ہے قطعی غلط ہے - گذشتہ اکتوبر کی بات ہے جبکہ میں اور رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو لکھنؤ میں مقیم تھے موصوف نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ریلوے کے بک اسٹال سے چند اردو رسالے لے لیے تھے جس میں انہوں نے تمام مضمون نگاروں کو ایک ایسی زبان میں لکھتے ہوئے پایا جو اس اردو سے قطعی مختلف تھی جسے وہ زندگی بھر پڑھتے اور بولتے رہے - انہوں نے یہہ بھی بتایا کہ بہت سے سیدھے سادے ہندستانی الفاظ کے بدلے ان مصنفین نے بڑے بڑے نامانوس الفاظ تقریباً سب فارسی اور عربی سے بھر لئے تھے - میں اپنے خیال کی تائید میں رائٹ انریبل سر تیج بہادر سپرو صدر مستقل ہندستانی اکیڈیمی سے بڑھ کر کوئی سند نہیں پیش کرسکتا -

میں صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ جدید ہندی کو جیسا کہ آج کل اخباروں ، رسالوں اور کتابوں میں لکھی جا رہی ہے سمجھنے میں مجھے بڑی دقت پیش آتی ہے حالانکہ میں ہندی کے بڑے بڑے پرانے شعرا مثلاً کبیر، ملک محمد جائسی ، عبدالرحیم خانخاناں ، تلسی داس ، سور داس ,اور بہاری لال وغیرہ کے کلام سے بغیر لغت کی مدد کے لطف اٹھا سکتا ہوں لیکن جدید ہندی کی نثر و نظم کو سمجھنے کے لئے اس کی برابر ضرورت پڑتی ہے - مجھے نہیں معلوم ہندی لکھنے اور پڑھنے والوں

میں سے کسی نے هندی لکھنے کے اس نئے ڈھنگ کے خلاف کچھ کہا یا لکھا ہو ۔ لیکن یہ دیکھ کر تسلی ہوتی ہے کہ اسکے خلاف ردعمل ہو رہا ہے - ایک مشہور هندی مصنف (جن کا ایک اچھا خاصا پرانا نام " گنگا پرشاد " ہے جسکو بدقسمتی سے جی - پی - سریواستو میں بدل کر وہ بلا وجہ بہت خوش معلوم ہوتے ہیں) حال ہی میں ایک بہت پر لطف ڈراما " ساہت کا سپوت " لکھا ہے جس میں انہوں نے بہت سختی کیساتھ هندی لکھنے اور بولنے والوں کے موجودہ رویہ کی هجو کی ہے کہ وہ اپنی تقریر و تحریر کو سنسکرت کے بڑے بڑے فقروں سے جسے لوگوں کی بہت زیادہ تعداد نہیں سمجھ سکتی سجاتے ہیں - میں امید کرتا ہوں کہ اس ڈرامے کی اشاعت جسکی هجو دلچسپ اور پر معنی ہے کار آمد ثابت ہوگی اور یقین رکھتا ہوں کہ اس کے اثر سے لوگ هندی زبان کے بولنے اور لکھنے میں سادگی کا خیال رکھیں گے -

ان لوگوں کے خیال سے جو شمالی هندوستان میں ایک ایسی مشترکہ زبان کو ترقی دینا چاہتے ہیں جسے سب سمجھ سکیں اور جو رفتہ رفتہ سارے هندستان کی عام زبان بن سکے آج کل کی اردو تحریریں اتنی ہی ناپسندیدہ ہیں جتنی کہ هندی - مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ اردو زبان میں سادگی پیدا کرنے کے مسئلے پر اردو رسالوں میں کافی توجہ کی گئی ہے بالخصوص " زمانہ " میں جس کے لائق اڈیٹر ہماری اکیڈیمی کے ایک ممبر ہیں - اس نے گذشتہ سال " اردو، هندی اور هندستانی " کے موضوع پر هندو اور مسلمان اهل قلم کے بہت سے مضامین شایع کیے جسمیں زبان اردو میں عربی و فارسی الفاظ شامل کرنے کی سخت مخالفت کی گئی تھی - میں ان مضمون نگاروں میں سے صرف دو کا حوالہ دوں گا - ایک بہت مشہور مصنف اور جریدہ نگار ہیں جو هندی اور اردو دونوں زبانیں بہت

خوبی کے ساتھ لکھتے ھیں جس کی وجہ سے ان کی کتابیں شمالی هندستان میں سب سے زیادہ مقبول ھیں - اپنے مشہور فرضی نام " پریم چند" سے انہوں نے گذشتہ اپریل کے "زمانہ" میں اس مسئلے پر اپنے خیالات یوں ظاہر کیے تھے " نہ تو فارسی اور عربی کے نامانوس الفاظ سے بھری ہوئی اردو اور نہ سنسکرت کے بڑے بڑے لفظوں سے بھری ہوئی هندی کبھی هندوستان کی قومی زبان ہوسکتی ھے - ہماری قومی زبان وھی ہوسکتی ھے جو عام لوگوں کی مشترکہ زبان ھے - میں کسی لفظ کو صرف اس لئے نہیں نکال دونگا کہ وہ عربی یا فارسی یا سنسکرت ھے - میرا معیار تو صرف یہ ھے کہ آیا عام لوگ اس کو سمجھ سکتے ھیں یا نہیں " یہ ٹھیک وھی بات ھے جس کا علمبردار میں هندستانی اکیڈیمی کو سمجھتا ھوں اس کے بانیوں کے اقوال کو مد نظر رکھتے ہوئے جن کا حوالہ اوپر دے چکا ھوں -

دوسرا حوالہ ایک مشہور مصنف مسٹر عظیم بیگ چغتائی سے دیا جاتا ھے جنہوں نے گذشتہ جولائی کے "زمانہ" میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ھے اور ہر قسم کے تعصب سے بالکل دور رہ کر اس مسئلہ پر بحث کی ھے - ان کا سارا مضمون قابل غور ھے اور میں اس میں سے کئی ٹکڑے سنانے پر مجبور ھوں جو ہر چند کہ اردو طرز تحریر کے متعلق کہے گئے ھیں مگر هندی طرز تحریر کے لئے بھی ٹھیک اترتے ھیں " اردو اور هندی کے حمائتی ضد اور تعصب سے بھرے ہوئے ھیں اور دونوں زبانوں کو نقصان پہونچا رھے ھیں - گذشتہ بیس سال میں اردو کے حمائتی بالخصوص مسلمانوں نے اس میں الٹے عربی الفاظ زبردستی بھر دئیے کہ ایک اوسط درجہ کی قابلیت کے هندو کے لئے ان کو سمجھنا بہت مشکل ھے - چونکہ ایک طرف هندو فارسی و عربی زبانوں پڑھنا چھوڑ رھے ھیں

دوسری طرف مسلمانوں نے نہ صرف اردو میں عربی کے نامانوس الفاظ بھر دئیے ہیں بلکہ ان ہندوستانی الفاظ کو بھی نکال دیا ہے جو عرصے سے اردو زبان کے جزو بن چکے تھے اور ان کی جگہ عربی الفاظ رکھ دیئے ہیں - اس کی وجہ سے آجکل کی اردو کو ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد نہیں سمجھ سکتی کیوں کہ اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک شخص نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ عربی و فارسی سیکھنے میں صرف کیا ہو - لیکن اس کے باوجود آج کل کی اردو کے حمائتی یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ہندو کا قومی فرض یہ ہے کہ اس خوف ناک قسم کی اردو کو پڑھے اور اس کا پرچار کرے - اس لئے اگر اردو کو باقی رکھنا ہے تو اس کے حامیوں کو چاہئے کہ وہ عربی و فارسی الفاظ کے استعمال میں اعتدال کو بہت زیادہ مد نظر رکھیں اور ہندستانی الفاظ کے استعمال پر دھیان رکھیں تاکہ اردو قومی زبان بن سکے - "

اس طرح ظاہر ہے کہ آج کل ہندی اور اردو لکھنے اور بولنے کا انداز ان زبانوں کے ایک ادیب کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل اور مغلق سے مغلق عبارت لکھے - معاملات کی افسوناک حالت کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے مصنفین اور مقررین اب تک وسطی زمانے کی ذہنیت رکھتے ہیں جو سولھویں صدی کے انگلستان میں ملی اور اس کے مقلدین سے ملتی جلتی ہے - لیکن جب کہ انگریز اور دوسری انگریزی بولنے والی قومیں اس ذہنیت—" یوفیوازم "—سے بلند ہوچکی ہیں ہم شمالی ہندوستان میں ابھی تک اس میں پڑے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے پُر شوکت فقروں اور جملوں کے شکار ہیں جو مغلق اور نامانوس ہوتے ہیں اور سنسکرت یا عربی و فارسی سے لئے جاتے ہیں - اس طرح ہم معنی کے بجائے لفظوں کی قدر کرتے ہیں اور سادگی اور فصاحت

کو اپنی علمیت اور قابلیت دکھانے کے لئے قربان کر دیتے ھیں - یہی وہ مشکل مرحلہ ھے جسے اس اکیڈیمی کے ارباب حل و عقد کو طے کرنا ھے خواہ اس وقت وہ اس سے کتنا ھی بچیں اور سوال ان کے سامنے یہ ھے کہ وہ لکھنے اور پڑھنے کی اس مشترکہ زبان کو ترقی دینے کے لئے کیا کر سکتے ھیں جسے سب سمجھ سکیں اور جو بجا طور پر " ھندستانی " کہلائے جانے کی مستحق ھو -

ایک خطبۂ صدارت کے سلسلے میں ھماری ادبی دنیا کے حالت سدھارنے کے ترکیبیں اور تدبیریں تجویز کرنا جن سے کوئی مفید نتیجہ نکلے آسان نہیں ھے - ان معاملات پر اُن واقف کاروں کے غور و فکر کی ضرورت ھے جو ھندستانی ادب اور زبان کے رواج دینے کے حامی ھوں - میں مختصراً چند باتیں پیش کرتا ھوں جو میرے خیال میں ھمارے آئندہ طرز عمل کے لئے بحث و مباحثہ کی بنیاد ھونگی - پہلی بات تو یہ ھے کہ ھندستانی زبان کی اُن دو شکلوں کے دو مختلف ناموں کو نکالنے کے لئے سخت کوشش کی جانی چاھئے جو ھندی اردو کے جھگڑے میں شامل ھو گئے ھیں اب جہانتک کہ زبان کے نام کی حیثیت سے لفظ اردو کا تعلق ھے یہ نہ تو قدیم ھے اور نہ لوگوں کی زیادہ تعداد کو اس سے کوئی خاص اُنس ھے - میں اردو کے ایک مشہور اسکالر اور شاعر شمس العلما سید علی محمد شاد مرحوم کی مشہور کتاب " فکر بالغ " کا حوالہ دینے کی اجازت چاھتا ھوں - وہ لکھتے ھیں " کچھ لوگ ھیں جو یہ کہتے ھیں (بدقسمتی سے کچھ نا واقف لوگوں نے اسکی تصدیق بھی کر دی ھے) کہ اس زبان کا نام اردو اس لئے پڑا کہ یہ مسلمانوں کے فاتح لشکروں میں پیدا ھوئی - کیا یہ لوگ مجھے کوئی تاریخ کی کتاب ' کوئی روز نامچہ یا تذکرہ چھٹی صدی ھجری سے لیکر تیرھویں صدی ھجری تک کا دکھادیں گے

جس میں یہ زبان اردو کے نام سے لکھی گئی ہو - جہاں کہیں اس کا نام لیا گیا ہے اس کو ہندی یا ہندوستانی کہا گیا ہے - راقم الحروف نے اردو کا نام تاریخوں ' روز نامچوں اور تذکروں میں ڈھونڈھا مگر کہیں نہ پایا - حقیقت یہ ہے کہ اردو کا نام تیرھویں صدی ہجری میں یکایک آگیا " یعنی انیسویں صدی عیسوی میں -

کچھ سال پہلے یہی خیال میرے معزز دوست شمس العلما سید علی بلگرامی مرحوم نے ظاہر کیا تھا جو یقیناً ہندوستان کے بہت بڑے فاضلوں میں تھے اور جو نہ صرف عربی ' فارسی اور اردو جانتے تھے بلکہ سنسکرت اور اس سے نکلی ہوئی بہت سی ہندستانی زبانیں جانتے تھے - اس طرح اب کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اردو کے نام کو ہندستانی پر ترجیح دی جائے - مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے اس خیال کے حامی علامہ سید سلیمان ندوی جیسے عالم و فاضل ہیں - گذشتہ ستمبر میں پٹنہ میں ایک تقریر کے سلسلے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ان الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے " لفظ اردو ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے محض ایک غلط فہمی ہے جسکو نکال دینا چاہئیے - ہماری زبان کو آئندہ سے ہندستانی کہنا چاہئیے اسی اصول کی بنا پر جیسے انگلستان کی زبان انگریزی ' فرانس کی فرانسیسی ' اٹلی کی اٹیلین وغیرہ وغیرہ کہلاتی ہے "- ایسے مشہور اور صاحب کمال لوگوں کے اقوال پر اضافہ کرنا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی -

ہندی کے حامی کہا کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں لفظ اردو پر جو اعتراضات کیے جاسکتے ہیں ہندی کے خلاف معقولیت کیساتھ نہیں کئے جاسکتے - ان کا کہنا یہ ہے کہ ہندی شمالی ہندستان کی زبان کے نام کی حیثیت سے ایک پر فضا تاریخی لفظ ہے اور عربی و فارسی زبانوں

میں تمام مسلمان مصنفین نے اس کو برابر استعمال کیا ہے - وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندستانی کی طرح یہ لفظ بھی سنسکرت زبان کا نہیں ہے اور نہ ہندوستانی ہی ہے یہ خالص فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس حیثیت سے مسلمانوں کو بالخصوص اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئیے - ان کی یہ دونوں دلیلیں تسلیم کی جاسکتی ہیں مگر پھر بھی اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اردو کی طرح ہندی کا لفظ بھی ہندی اردو کے جھگڑے میں ایک سیاسی رنگ اختیار کرچکا ہے صرف اس بنا پر مشورہ دینے کی جرات کرتا ہوں کہ اکیڈمی کو نہ صرف اپنے یہاں سے ان الفاظ کو نکال کر ان کے بجائے اپنی کتابوں میں ہندستانی کا نام اختیار کرنا چاہئیے بلکہ اس دوسرے نام کو مقبول بنانے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنی چاہئیے -

دوسرا مشورہ میں یہ دینا چاہتا ہوں کہ اکیڈیمی کو جس قدر جلد ممکن ہوسکے ان تمام الفاظ کی ایک لغت مرتب کرنا چاہئیے جو بجا طور پر ہندستانی کے دیسی الفاظ کہے جاسکیں - میں خاص طور پر لفظ " دیسی " استعمال کر رہا ہوں جس میں وہ الفاظ شامل نہ ہو سکیں جنہیں صرف وہی بہت پڑھے لکھے آدمی سمجھ سکتے ہیں جو قدیم اور غیر ملکی زبانوں سے واقف ہوں - یہ بات مشہور ہے کہ لیٹن جو صدیوں سے ایک مردہ زبان ہے یورپ میں سیکڑوں برس تک پڑھے لکھوں کی زبان سمجھی جاتی تھی جب کہ یورپ کے ممالک کی مقامی زبانیں صرف ورناکیولر اور ان پڑھ دیسی لوگوں کی زبانیں سمجھی جاتی تھیں - میں جانتا ہوں کہ ہماری زبان میں ہزاروں الفاظ ہیں جو نہ سنسکرت سے لئے گئے ہیں اور نہ عربی و فارسی سے - لیکن بد قسمتی سے آج کل کا ڈھنگ یہی ہے کہ بول چال اور لکھنے میں زیادہ سے زیادہ الفاظ سنسکرت اور فارسی و عربی کے بھر دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے ورناکیولر الفاظ

زبان سے گرتے جا رہے ہیں اور خطرہ ہے کہ ہم آئندہ اُنھیں بالکل نہ بھول جائیں - اس لئے قبل اس کے کہ وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے ہم کو چاہئے کہ ان کو احتیاط کے ساتھ ایک لغت میں جمع کر لیں - اتنے بڑے کام کو کوئی شخص اکیلا نہ کرسکے گا اور کوئی ایسا ادارہ بھی شاید ہی کرسکے جس کے مالی ذرائع مختصر ہوں - اس لئے میرے خیال میں اکیڈیمی کا یہ فرض ہے کہ اس کام کو سر انجام دینے کی پوری کوشش کرے -

ایک اور مشورہ (جس کے لئے میں اپنے محترم دوست سر راس مسعود کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کا پہلا خیال میرے دل میں پیدا کیا تھا) یہ ہے کہ اکیڈیمی کو چاہیے کہ هندی اور اردو کے کلاسیکل (یا پرانے) مصنفین کا ایک سلسلہ شائع کرے جس میں تنقیدی مقدمے ' فرهنگ اور تشریحیں شامل ہوں - اس وقت اردو یا هندی کے شائقین کے لئے بلا زیادہ روپیہ صرف کئے ان کے پرانے ادب کا ایک عمدہ ذخیرہ معقول قیمتوں پر مہیا کرنا بہت مشکل ہے - جو لوگ ڈنٹس کی " ایوری مین لائبریری " (Every man Liberary) کی ایک هزار جلدوں سے باخبر ہیں یا جنھوں نے اکسفورڈ یونیورسٹی پریس کا ذخیرہ (جسے " ورلڈ کلاسک سیریز " کہتے ہیں) دیکھا ہے جسکی ہر کتاب ہاف کراؤن سے زیادہ کی نہیں ہوتی کسقدر کف افسوس ملتے ہوں گے کہ وہ اردو هندی کی ادبیات اس طرح نہیں جمع کرسکتے - میرا خیال ہے کہ ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن ترقی اردو نے بہت سی کتابیں شائع کی ہیں جن میں اردو هندی کی ادبیات ملتی ہیں - مگر یہ کتابیں ناکافی ہیں اور هندی اور اردو ادبیات کے پڑھنے والوں کی ضرورتوں کو نہیں پورا کرتیں - اس معاملے میں اردو ادب هندی ادب سے بھی پیچھے ہے - اس

لئے اس اہم معاملے میں میں چاہتا ہوں کہ اکیڈیمی راستہ دکھائے اور کام شروع کرے - درحقیقت یہ بڑا مبارک دن ہوگا جب ہندی اور اردو ادبیات مستند اور یکساں جلدوں میں ایک روپیہ فی جلد کی سستی قیمت پر دستیاب ہوسکیں گی - یہ کام اردو اور ہندی ادب کے شائقین اور طلباء کے لئے بڑا مفید ہوگا - اس درمیان میں میں یہ چاہتا ہوں کہ اکیڈیمی اسی سال ایک "ہندستانی ادب" کا سلسلہ شایع کرنا شروع کردے جس میں (کم و بیش) ایسی کتابیں ہوں جو آسان اردو اور سادی ہندی میں لکھی گئی ہوں اور جو ناگری اور عربی دونوں خطوط میں لکھی جاسکتی ہوں - پرانے ادب میں یہ سلسلہ ایسی کتابیں شامل کر سکتا ہے جیسے سید انشا کی رانی کیتکی اور کلو ادوے بھان کی کہانی اور ہندی مصنفین میں سے پنڈت شری دھر پاٹھک اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیا - اور اسی طرح اس میں نظیر اکبر آبادی اور سید انور حسین آرزو کے کلام کے مجموعے یا انتخابات شامل کیے جاسکتے ہیں - یہ فہرست محض اشارہ دینے کے لئے ہے اور آسانی کے ساتھ اسکو بڑھایا جا سکتا ہے - اس طرح کا سلسلہ اگر اکیڈیمی شائع کرے اور کتابوں کو قابل اہل قلم ترتیب دیں اور اس پر اپنی تنقید شامل کریں تو یقین ہے کہ ہندستانی ادب کی ترقی پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے - میرا مشورہ یہ بھی ہے کہ جو روپیہ انعامات میں صرف کیا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ اگر آئندہ ہندستانی ادب کی ترغیب دینے میں صرف کیا جائے تو اس سے کہیں بہتر ہو جو ایسی کتابیں لکھوانے میں صرف ہوتا ہے جن سے ہندی اور اردو کی پہچان باقی رہتی ہے -

مجھے ڈر ہے کہ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا ہے اس لئے اب

بیانات کو ختم پر لاتا ہوں - شمالی ہندوستانی کے ادبی مسئلوں پر عرصہ سے جو کچھہ میرے خیالات تھے ان کو میں نے سب کے سامنے بہت آزادی اور صفائی سے پیش کر دیا ہے - ممکن ہے کہ جو لوگ موجودہ معیار اور طریقوں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں مجھہ سے اختلاف کرتے ہوں - لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ اس موقع پر میرا فرض یہی تھا کہ جو کچھہ میں ہندستانی اکیڈیمی کا مقصد اور غائت سمجھتا ہوں اسکی تائید کروں اور اسکی بھلائی کے لئے جو کچھہ مجھہ سے ہو سکے کروں - یہی وجہ ہے کہ میں اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ اکیڈیمی کو میرے مشوروں پر کوئی نہ کوئی طرز عمل اختیار کرنا چاھیے - میں نے اکیڈیمی کی شائع کی ہوئی کتابوں میں اگر سب نہیں تو کچھہ بہت دلچسپی سے پڑھا ہے مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ ان سب میں میں نے وھی بات پائی جسے سر تیج بہادر نے ایک مرتبہ یوں کہا کہ " اردو اور ہندی کا پروپیگنڈا کرنے والے اردو میں فارسی عربی اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ بھرتے چلے جارہے ہیں - ایسے خیالات رکھتے ہوے جو میں نے ابھی آپ کے سامنے ظاہر کیے ہیں - میں محسوس کرتا ہوں کہ اکیڈیمی کے لئے یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ ایک ایسے طرز تحریر کو روا رکھے - کیونکہ جب خود ہندستانی اکیڈیمی سنسکرت سے بھری ہوئی ہندی اور فارسی و عربی سے بھری ہوئی اردو کی کتابیں شائع کریگی تو اس سے موجودہ حالت سدھرنے کے بجاے اور خراب ہوجائیگی - برخلاف اس کے میں امید کرتا ہوں کہ یہ بہترین ادارہ جو خوش قسمتی سے اپنے کاموں کو سیاسی تعصب اور اختلافات سے بے لوث رکھتا ہے آئندہ اپنے یہاں سے ایسی کتابیں شائع کرے گا جو ایک مفید تحریک کی ابتدا کریں گی اور شمالی ہندستان کیلئے ایک عام زبان فراہم کر دیں گی جو ادب اور تعلیم دونوں کی ضرورتوں کو پورا کرے گی -

خطبۂ صدارت

از

مولوی عبدالحق صاحب، بی۔ اے
بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو

جو

ہندستانی اکیڈیمی کی چوتھی ادبی کانفرنس میں دیا گیا۔

حضرات!

اردو زبان و ادب کا جدید دور گذشتہ صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے - اس میں چار بڑی با قاعدہ اور منظم تحریکیں عمل میں آئیں -

۱—فورٹ ولیم کالج ' کلکتہ -

۲—دهلی کالج -

۳—سائنٹفک سوسائٹی ' علی گڑہ -

۴—اورینٹل کالج ' لاهور -

پہلی تحریک جو انیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی ملکی ضرورت پر مبنی تھی - انگلستان سے رائٹر (محرر) بالکل نو عمر آتے تھے یعنے سولہ سے اٹھارہ برس کی عمر کے - ان میں سے اکثر کی تعلیم بہت محدود اور کم ہوتی تھی اور جو کسی کی تعلیم اچھی بھی ہوتی تو اسے مطالعہ اور تعلیمی ترقی کا موقع نہیں ملتا تھا - دوسرے جب یہ نو عمر پہلے پہل هندوستان میں آتے تو ان کی حالت لاوارثوں کی سی ہوتی تھی اور ابتداے ملازمت میں کوئی ان کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا نگراں اور رهنما نہیں ہوتا تھا - نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ نا اهل اور کاهل هو جاتے تھے -

دوسری بڑی بات یہ تھی کہ ملازمین کمپنی کو مختلف‌السنہ و مذاهب اور اطوار و عادات کے لاکھوں آدمیوں کے عدالتی معاملات فیصل کرنے ' اضلاع کی مال گزاری کا انتظام کرنا اور اُن کے جھگڑے چکانے پڑتے تھے - عدالتوں میں وکالت اور تمام ضروری کارروائی دیسی زبان کے ذریعے سے ہوتی تھی - قانون انگریزی نہیں بلکہ یہاں کا قدیم قانون رائج تھا -

اس لئے مجسٹریٹوں کے فرائض بہت پیچیدہ اور اہم ہو گئے تھے - معمولی فرائض کے علاوہ ججوں مجسٹریٹوں کو وقتاً فوقتاً گورنر بہ اجلاس کونسل کے سامنے موجودہ قوانین کے متعلق ترمیمات وغیرہ پیش کرنی ہوتی تھیں جس کے لئے انہیں اہل ملک کی خواہشات اور ضروریات کا جاننا ضروری تھا -

دوسری بڑی چیز تجارت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا اصل منشا تھا - اس سے پہلے یہاں کوئی فرماں روا تجارت کے بھیس میں نہیں آیا تھا - اور اس لئے کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ اجنبی تاجر کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے تعمیر کرنے لگیں گے اور بیوپار کرتے کرتے حکمرانی فرمانے لگیں گے - تجارت کے فروغ کے لئے ضرور ہے کہ تاجر ملک کی زبان اور حالات سے واقف ہو - اور جہاں تجارت کے ساتھ حکومت کا سایہ بھی ہو تو ملک کی زبان، اہل ملک کی عادات اور رسم و رواج اور اُن کے آئین و قوانین کا جاننا لازم ہو جاتا ہے -

اُس زمانے میں ایک آفت اور پیدا ہو گئی تھی اور اس کا انسداد ضروری تھا - انقلاب فرانس نے تمام یورپ میں ہل چل مچادی تھی، مذہبی اور سیاسی خیالات میں اختلال پیدا ہو گیا تھا اور وہ خطرناک اصول رفتہ رفتہ کمپنی کے فوجی اور ملکی ملازمین تک بھی پہنچ گئے تھے - اس لئے بڑا اندیشہ تھا کہ سب کیڈٹ اور رائٹر اس کے شکار نہو جائیں - ایسے مواقع پر دل و دماغ کو زیر کرنے کے لئے ہمیشہ دو قوتوں سے کام لیا گیا ہے - ایک حکومت، دوسرے مذہب - اس لئے حکومت اور مذہب کے اصول سکھانے ضروری تھے تا کہ نووارد جوان عام روش سے بہکنے نہ پائیں - اسی وجہ سے مذہبی تعلیم کالج کا جز تھی اور کوئی اعلی عہدہ یا پروفیسری یا لکچراری کی خدمت کسی غیر عیسائی کو نہیں

دی جاتی تھی اور ایسے عہدہ دار کو اقرار صالح کرنا پڑتا تھا کہ وہ نہج کے طور پر یا علانیہ ایسے عقائد اور آراء کی تعلیم نہ دے گا جو عیسائی مذہب یا چرچ آف انگلینڈ کی تعلیم و ارکان کے خلاف ہو -

ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر لارڈ ولزلی نے ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ع کو ایک مدرسہ بنام فورٹ ولیم کالج قائم کیا - ولزلی بڑا اولوالعزم شخص تھا اور اس مدرسے کے متعلق اس کے بڑے بڑے خیالات تھے - وہ اس میں قدیم و جدیدالسنہ ' ہندوستان کی دیسی زبانوں ' اصول قانون ' تاریخ عامہ و تاریخ ہندوستان ' نیچرل ہسٹری ' کیمیا ' معاشیات ' ریاضی ' نباتات وغیرہ سب کی تعلیم دینا چاہتا تھا - مگر پیسے کے لوبھی کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی - اس لئے اس کی تعلیم زیادہ تر دیسی اور مشرقی زبانوں تک محدود رہ گئی - ڈائرکٹر سرے سے کالج کے مخالف تھے ' محض لارڈ ولزلی کی سینہ زوری سے چند سال تک قائم رہا -

یہ کچھ بھی سہی ' لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ کالج نے دیسی زبانوں اور خاص کر ہندوستانی زبان کے لئے بہت مفید کام کیا - اردو زبان میں سادہ اور روز مرہ کی زبان لکھنے کا ڈھنگ ڈالا - اور مقفی اور مسجع عبارت ترک کردی گئی - کوئی پچاس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں - جن میں کچھ ترجمے تھے ' کچھ تالیفات اور کچھ انتخابات - جو قصص و حکایات ' تاریخ و تذکرہ ' لغات ' صرف و نحو اور مذہب وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہیں - کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیئے - ایک تو روز مرہ کی زبان کو صفائی اور فصاحت کے ساتھ لکھنا سکھایا - دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے اردو لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز پر کتابیں لکھنے کی کوشش کی گئی -

اس میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا بڑا ہاتھ تھا - اس کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں اور اپنا جواب نہیں رکھتیں - ایک کام اس نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اس میں طبع ہونے لگیں - یہ مسئلہ اب تک زیر بحث ہے اور اس میں جیسی کہ چاہئے کامیابی نہیں ہوئی - اگر یہ کالج قائم رہتا اور حسب ضرورت اس کے مقاصد میں توسیع ہوتی رہتی تو بڑی قابل قدر خدمت انجام دیتا -

دوسری تحریک دلی میں نمودار ہوئی - دہلی کالج کا ذکر ہندوستان کے نظام تعلیم کے سلسلے میں نیز اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ کیا جائیگا اور تعریف کے ساتھ کیا جائیگا - اگر چہ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کے لکھنے والے اسے اکثر بھول جاتے ہیں - اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں - ایک یہ کہ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا - اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے ' معلومات کے اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام کیا - اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کر دی جس میں سے ایسے پختہ ' روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہیگا - دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھا - تمام مغربی علوم اردو ہی کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے اور باوجود اُن موانعات کے جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے ہے وہ نہایت کامیاب رہا - کالج کے پرنسپل اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ " مشرقی شعبے کا طالب علم اچھ

مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے " علاوہ اس کے جن جن ماہران تعلیم اور قابل اصحاب نے کالج کا معائنہ کیا انہوں نے اس کی تصدیق کی - مسٹرکر ؟ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن احاطۂ بنگال اپنے تبصرۂ تعلیمی بابت سنہ ۱۸۵۳ء میں لکھتے ہیں کہ -
" ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرہی ہے جو اُسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور پر ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ اور اخلاق و فلسفہ کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے - اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بٹروس نے اپنے زمانۂ پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عملدر آمد کیا اور اُن کے جانشین ڈاکٹر سپرنگر نے اُسی جوش کے ساتھ اُسے جاری رکھا - یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جز تسلیم کر لیا گیا ہے - مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے - چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں کے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا" -

افسوس یہ موقع کبھی نہ آیا -

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) تھی - جو کالج کے طلبہ کے لئے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی - یہ ترجمے سب کے سب کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے کئے ہوے ہیں - اس مجلس کے ترجموں اور تالیفات کی تعداد قریب سوا سو کے ہے - جو تاریخ ' جغرافیہ ' اصول قانون ' ریاضیات اور اس کی مختلف شاخیں ' ہیئت ' کیمسٹری ' میکانیات ' فلسفہ معاشیات ' طب ' جراحی ' نباتیات '

مضریات ' مقناطیس ' مناظر و مرایا وغیرہ علوم و فنون نیز ادبیات پر مشتمل ہیں - آج کل جب یہ کام دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کس قدر دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ اُن ترجموں کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے - لیکن آفرین ہے کالج والوں کی ہمت پر -

اس کالج نے صحیح طریقۂ تعلیم کو رواج دینے اور اردو کو علمی زبان بنانے میں عظیم‌الشان خدمت انجام دی اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کا یہ کام نہایت قابل قدر ہے - اگر سنہ ۵۷ کی شورش میں اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا اور یہ کالج اسی اصول پر قائم رہتا اور زمانے کی ضروریات کے مطابق اس میں اصلاح و ترقی جاری رہتی تو آج ہماری زبان کہیں سے کہیں پہنچ جاتی -

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۴ع میں سر سید احمد خاں مرحوم نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی - جس کی غایت یہ تھی کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کراکر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے - اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں - دہلی کالج کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے اردو زبان میں علوم جدیدہ کو منتقل کرنے اور اُسے علمی زبان بنانے کی سعی کی - سر سید اسے انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے - انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب‌الاخلاق بھی اسی کے بچے تھے جنھوں نے ملک میں علمی ذوق اور روشن خیالی پھیلانے میں بڑا کام کیا -

سنہ ۵۷ کی شورش کے کچھ دنوں بعد جب علمی مرکز دہلی سے لاہور میں منتقل ہوا تو وہاں اوائل سنہ ۱۸۶۵ع میں ایک انجمن بنام

" انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب " قائم ہوئی جو بعد میں " انجمن پنجاب " کے نام سے موسوم اور مشہور ہوئی - اور اسی کی سعی سے اورینٹل کالج کی بنا پڑی جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کالج کے تفویض کر دیا گیا - یہ تعلیمی ادارہ بھی تھا اور تالیف و ترجمہ کی اکیڈیمی بھی - مترجم زیادہ تر کالج کے معلمین اور اس کے رفقا تھے - ان صاحبوں نے مختلف علوم و فنون پر بہت سی انگریزی کتابوں کے ترجمے کیے - چند کتابیں تالیف بھی کیں اور بعض سنسکرت ' عربی ' فارسی کتابوں کے بھی ترجمے کیے - اس میں ڈاکٹر لائٹز کی کوشش و استقلال کا بہت بڑا دخل تھا - وہ انجمن پنجاب کے پریزیڈنٹ اور اورینٹل کالج کے پہلے پرنسپل تھے اور سنہ ۱۸۸۶ع تک اس خدمت پر مامور رہے - ان کے جانے کے بعد تالیف و ترجمہ کا کام سست پڑ گیا - اگرچہ پہلا سا زور شور اور اهتمام نہیں رہا تاہم یہ کالج اردو اور مشرقی زبانوں کی خدمت تعلیم اور امتحانات کے ذریعہ سے انجام دے رہا ہے - اور گو اب وہاں کوئی شعبہ تالیف و ترجمہ کا نہیں مگر وہ سنت قدیم پروفیسر شفیع پروفیسر اقبال اور پروفیسر شیرانی کے دم سے زندہ ہے -

یہ چار تحریکیں جن کا سرسری ذکر میں نے آپ کی خدمت میں کیا ہے ' گزشتہ صدی کی ادبی اور علمی ترقی میں بہت بڑی اهمیت رکھتی ہیں - فورٹ ولیم کالج ' دهلی کالج اور اورینٹل کالج نے اردو زبان کے لیے جو کام کیا وہ خاص ضرورت سے تھا یعنی درسی کتب کا بہم پہنچانا - مگر اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت سی کتابیں ایسی بھی تھیں جو عام مطالعہ کے لیے بھی مفید تھیں اور ان سے تعلیم و ادب کے شائقین کو بہت فائدہ پہنچا - علاوہ معلومات میں اضافہ کرنے اور خیالات میں انقلاب پیدا کرنے کے سنجیدہ مضامین کے لکھنے کا اسلوب بھی رائج ہوگیا -

سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد عام تھا لیکن اس کا کام بھی دھلی کالج یا اورینٹل کالج ھی کے نہج پر ہوا - اِن اداروں کے حالات پر غور کرنے سے ایک بات البتہ کھٹکتی ھے - وہ یہ ھے کہ ہر ادارے نے از سر نو کام شروع کیا اور گزشتہ تحریکوں سے کوئی سلسلہ اور ربط قائم نہیں رکھا - یعنی نہیں دیکھا کہ اس سے پہلے کیا کیا کام ہوا ' کون کون سی کتابیں لکھی یا ترجمہ کی گئیں ' ترجمہ کن اصول پر ہوا ' کون کون سے نئے الفاظ وضع کیے گئے اور کون سے ایسے پرانے الفاظ تھے جو نئے اصطلاحات کے لیے استعمال کیے گئے - ان کی کون سی چیزیں اختیار کرنے کے قابل ھیں اور کون سی قابل ترک - اس سے بڑی بصیرت ہوتی ھے اور کام میں آسانی ہوجاتی ھے - جس طرح اگلوں کے اچھے کام پچھلوں کے حق میں مفید ہوتے ھیں اسی طرح اُن کی غلطیاں کچھ کم مفید نہیں ہوتیں تاکہ آنے والے ان سے بچیں اور ان کا اعادہ نہ کریں -

میں دیکھتا ہوں کہ اس زمانے میں جو ادارے زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کا کام کررہے ھیں وہ بھی اسی غلطی میں مبتلا ھیں - اور اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہو رھی ھے کہ ان کا کام کسی اصول پر نہیں ہو رہا - کوئی کتاب اچھی سی ھاتھ لگ گئی اس کا ترجمہ کرا لیا ' کسی نے کوئی چیز لکھ کر بھیجی' کمیٹی نے پسند کی ' چھاپ کر شایع کردی - کوئی تالیف شایع ہوئی سفارش کے ساتھ پیش ہوئی انعام دیدیا - کچھ لکچر دلوا دئے ' کچھ جلسے کرلیے اور سب سے بڑا کارنامہ یہ کہ مشاعرہ کا اهتمام کردیا - گویا ہم اندھیرے میں چاند ماری کر رھے ھیں - لگا تو تیر نہیں تکا - اس طرح سے کام نہیں ہوتے ' ان حرکتوں سے زبان اور ادب نہیں بنتا ' اِن طریقوں سے آپ خیالات میں انقلاب اور طبائع میں جدت نہیں پیدا کرسکتے - اس سے بھی بڑی کوتاھی بلکہ

معصیت جس کا ارتکاب یہ ادارے کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اِن اداروں میں باہمی کوئی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے - ہر ایک نے اپنی ڈیڑہ اینٹ کی الگ مسجد بنا رکھی ہے - جب مقصد ایک ہے اور کام ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کبھی کبھی سر جوڑ کر نہ بیٹھیں ؛ اپنے کاموں پر نظر ڈالیں اور آئندہ کے لیے اپنے کام کا کوئی ایسا نقشہ تیار کریں جو حقیقی طور پر ہمارے ادب کے حق میں مفید ہو - اس اتحاد عمل ' امداد باہمی اور تقسیم کار سے کام میں سہولت اور توسیع اور عمل میں قوت پیدا ہوگی ' نیز بہت سے ایسے مسائل حل ہوجائیں گے جو اس وقت ہماری توجہ کے محتاج ہیں - اس طرح سال میں ایک آدھ بار باہم مل بیٹھنے سے اور بہت سی کارآمد باتیں سوجھ جائیں گی جو فرداً فرداً غور کرنے سے خیال میں نہیں آتیں - لیکن یہ مجلسیں ہنگامے کے لئے نہیں بلکہ کام کی خاطر ہونی چاہئیں اور ان میں صرف انہیں کو دعوت دی جائے جو اہل نظر اور صاحب رائے ہیں - بعد میں اُن کی تجویزیں اور فیصلے عام اطلاع اور تنقید کے لئے شایع کئے جائیں تاکہ ضرورت ہو تو ان فیصلوں پر نظر ثانی کی جاسکے -

حاشا و کلا میرا مقصد کسی ادارے کو الزام دینا نہیں ' ہر ادارہ اپنی بساط اور فکر کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور مفید کام کر رہا ہے - لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ حالت میں جس طرح کام ہو رہا ہے اس میں بہت سا وقت ' محنت اور روپیہ رائیگاں جاتا ہے - اگر ہم متفقہ طور پر کام کی نوعیت ' کام کی تقسیم ' اس کی ترقی و اشاعت اور جدید ضروریات کے متعلق غور کرکے کچھ امور طے کرلیں گے اور اُن کے عمل میں لانے کی تدبیریں سوچ لیں گے اور ان کے انجام دینے کے وقت کا بھی تعین کر دیں گے تو یقین ہے کہ ہم اتنے ہی وقت میں اُسی قدر محنت اور

روپیہ کے صرف سے بہت بڑا اور بہت بہتر کام کرسکیں گے - یہ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں - انجمن ترقی اردو ایک مدت تک اٹکل پچو کام کرتی رہی - ایک عرصے کے بعد مجھے تنبہ ہوا کہ اس طرح بے اصولی سے کام کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ، ایک منظم ادارے کا کام جس کا مقصد زبان و ادب کی ترقی ہے اس سے بہتر اور افضل ہونا چاہئے - چنانچہ اب ہم نے ایک خاص اصول پر کام کرنا شروع کیا ہے - مثلاً ہم نے اردو شعرا کے تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مرتب کئے اور اس وقت تک بہت سے کمیاب اور نادر تذکرے شایع ہو چکے ہیں اور بعض ابھی زیر ترتیب ہیں ۔ ان تذکروں سے اردو ادب کے ارتقا اور اس زمانے کی معاشرت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں جو اب تک چلی آرہی تھیں ان کی بدولت رفع ہوگئیں - چنانچہ ان تذکروں کی اشاعت کے بعد سے اردو ادب کی تاریخ کے متعلق جو تحریریں اور کتابیں شایع ہوئی ہیں اُن کے مولفوں نے ان سے استفادہ کیا ہے - اسی طرح انجمن نے قدیم اردو ادب کے متعلق تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور اردو کی بعض قدیم کتب نظم و نثر شایع کی ہیں جن سے ابتدائی زبان کی کیفیت معلوم ہوتی ہے - نیز انجمن نے ایک سلسلہ لغات بھی ترتیب دینا شروع کر دیا ہے - فی‌الحال انگریزی اردو کی ایک مبسوط اور جامع لغات بھی زیر طبع ہے اور جلد شایع ہو جائے گی - انگریزی ہندی لغات بھی زیر ترتیب ہے - پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی مکمل ہو چکی ہیں اور اب ان کی نظر ثانی کی جا رہی ہے - اس میں تقریباً بیس ہزار اصطلاحات مختلف پیشوں کی بڑی تلاش اور محنت سے جمع کی گئی ہیں - قدیم اردو کی لغات بھی زیر ترتیب ہے ، قدیم الفاظ موجودہ لغت کی کتابوں میں نہیں ملتے - ہمارے لغت نویس انہیں

متروک و مردود سمجھتے ہیں - اس لغات سے ادبی تحقیق میں بہت مدد ملے گی - جائزۂ زبان اردو (یعنی اردو زبان کے سروے) کا کام بھی ایک سال سے ہو رہا ہے - یوں تو یہ زبان ہندستان کے تقریباً ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن ہر علاقے میں اس کی کیا حیثیت ہے - کس قدر لوگ لکھ پڑھ سکتے ہیں - بولنے اور سمجھنے والے کتنے ہیں ' تالیف و تصنیف کا کیا حال ہے ' اخبار اور رسائل اور مطابع کتنے ہیں ' وہاں کی زبان کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں ' مدارس میں اس کی کیا حیثیت ہے ' وغیرہ وغیرہ حالات و واقعات کا ہمیں پورا علم نہیں - کام کرنے کے لئے ان کا جاننا ضروری ہے - اکثر صوبوں سے رپورٹیں وصول ہو چکی ہیں اور باقی مقامات میں کام جاری ہے - اِس وقت ایک اور تجویز میرے زیر غور ہے - یہ ارادہ ہے کہ دنیا کی اعلیٰ زبانوں میں جس قدر مہا تصانیف (کلاسکس) ہیں ان سب کا ترجمہ اردو میں کردیا جائے - میں نے اُس کی ایک فہرست تیار کی ہے جو خاص خاص اصحاب کی خدمت میں رائے کے لئے بھیجی جا رہی ہے - اگر یہ تجویز عمل میں آگئی تو ہماری زبان میں ایک ایسا عجیب و غریب سامان مہیا ہو جائے گا جو دنیا کا بہترین کارنامہ اور بنی نوع انسان کا افضل ترین ارث سمجھا جاتا ہے - اور اس سے ہماری زبان کو جو بیش بہا فائدہ پہنچے گا وہ محتاج بیان نہیں - اس کے علاوہ ہم دنیا کی موجودہ بڑی بڑی تحریکوں پر بعض کتابیں تالیف کرا رہے ہیں جو معلومات کی توسیع میں بڑا کام دیں گی - اس بیان سے میرا مطلب انجمن ترقی اردو کا اشتہار دینا نہیں بلکہ مثال کے طور پر وہ طریقۂ عمل بتانا ہے جس پر انجمن اس وقت کاربند ہے یا جو اس کے پیش نظر ہے -

ادبی اداروں کے اتحاد عمل سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس وقت جو ہمارے ادب میں ایک قسم کی بیراہہ روی پائی جاتی ہے اس کا

بھی انسداد ممکن ہے - جب ہم متفقہ طور پر اس کے خلاف آواز بلند کریں گے اور اپنے عمل سے نمونے پیش کرنے کی کوشش کریں گے تو ہماری آواز بے اثر نہیں رہے گی - آج کل ہمارے ادب میں خیالی یا اس وقت کے محاورے میں رومانی رنگ غالب ہوتا جاتا ہے- کچھ مدت قبل ادب جدید کے ایک دور میں جس کا تعلق زیادہ تر علی گڑھ تحریک سے تھا ، اُس وقت کے اہل ادب مثلاً سرسید احمد خاں یا مولانا حالی زندگی کے واقعات اور اس کی مشکلات سے بحث کرتے تھے ؛ قومی تنزل کے اسباب ، آیندہ ترقی کی تدابیر ، تعلیم کی ترغیب ، دشواریوں سے مردانہ وار مقابلہ ، رسم و رواج اور توہمات کی تنقید ، ادب کی اصلاح وغیرہ ایسے مضامین تھے جن پر بحث کرنے سے ان کا قلم کبھی نہیں تھکا - مولوی نذیر احمد جیسے عالم نے جتنے ناول لکھے وہ سب اُس وقت کی زندگی اور معاشرت کا آئینہ ہیں - لیکن اِس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرر اور آزاد کی روح نئی جون میں نمودار ہوئی ہے - ہمارے ادیب اور شاعر عالم خیال میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور روز بروز حقیقت اور زندگی سے دور ہوتے جاتے ہیں - یوں سمجھئے گویا وہ زندگی کی حقیقتوں اور دشواریوں اور اُن پر غور کرنے سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں - لیکن کیا اِن حیلوں سے بچ سکتے ہیں ؟ ادب زندگی سے بنا اور اسی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو ایک لچر کہانی ہے -

یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے - مثلاً عرب جاہلیت کے شعرا کو لیجئے - شاعری ان کی رگ و پے میں بھری ہوئی تھی - معمولی سا معمولی اور جزئی سے جزئی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا اور تحریک شعر کے لیے کافی تھا - ان کی لڑائیاں ، ان کی فتح و شکست، عشق و محبت (خیالی نہیں) ، خوف و

خطر ' انتقام ' مہمان نوازی وغیرہ یہانتک کہ ایک بچھڑے کی ولادت تک کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے - ان کے کلام میں تازگی' آزادی' مردانہ پن اور ذوق زندگی پایا جاتا ہے - اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس زمانے کی معاشرت ' رسم و رواج اور خیالات و توہمات کی تاریخ مرتب کرسکتے ہیں - گزشتہ تیس سال میں ہماری زندگی میں بہت کچھ تغیر واقع ہوا ہے ' اور اگر دو ایک شاعروں سے قطع نظر کی جاے تو کہا ہمارے شعرا کے کلام میں کہیں بھی اس انقلاب کا پتا ہے - ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذالرحمن ہیں ' انہیں مشاہدہ ' مطالعہ اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ' ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہامات کا نزول ہوتا رہتا ہے - لیکن اگر انہیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں ہے تو انہیں ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر آنا پڑے گا ورنہ ان کی شاعری کو کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا -

ہمارے رسالے اور اخبار بھی بہت کچھ اسی رنگ میں نظر آتے ہیں - وہ دنیا کی ان عظیم‌الشان تحریکوں پر جنہوں نے دنیا میں ہیجان پیدا کر رکھا ہے ' بہت کم سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں - وہ زیادہ تر ادب لطیف ' معمولی فسانوں اور نظم نما نثر کے شائق معلوم ہوتے ہیں - ایک بڑا عیب یہ ہے کہ جب کبھی وہ ملکی معاملات پر بحث کرتے ہیں تو اس میں فرقہ بندی کی بساندھ آنے لگتی ہے یا خواہ مخواہ ایسے معاملات کو جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں مذہبی رنگ میں رنگ کر پیش کرتے ہیں - یہ عام طور پر ہندی اردو اخباروں اور رسالوں کی حالت ہے - اس سے تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوتا ہے - اور یہ ادب کے حق میں زہر ہے - اگر ہمارے ادبی ادارے اور کسی غرض سے نہ سہی ' صرف ادب کی خاطر متفقہ طور پر

ان باتوں سے اپنی بیزاری ظاہر کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اثر نہو - لیکن صرف تجویزیں پیش کر دینا اور قرار دادیں منظور کر لینا کافی نہو گا - ان اداروں کو خود بھی ان پر عمل کر کے دکھانا ہوگا -

اس قسم کے اور بہت سے قصے قضیے ہیں - مثلاً ہندی اردو یا رسم خط کی بحث یا اور چھوٹے موٹے مسائل جن کا تعلق زبان اور ادب سے ہے ' ان سب جھگڑوں کے چکانے کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے جو میں نے عرض کیا ہے - اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک اپنی رائے کو صائب اور قوی سمجھتا ہے لیکن باہم مل بیٹھنے اور مشاورت کی بڑی کرامات یہ ہے کہ جن رایوں کو ہم اٹل سمجھے بیٹھے تھے وہ باہم گفتگو کرنے کے بعد جھو جھری معلوم ہونے لگتی ہیں - خلوص نیت شرط ہے -

رسم خط کا مسئلہ آج کل بہت زیر بحث ہے اور خاصا بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے - اس میں مشکل یہ آپڑی ہے کہ جیسا ہمارے یہاں عام دستور ہے ' رسم خط کو قومی تہذیب اور مذہب کا جز سمجھ لیا گیا ہے - اس لئے موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ لوگ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے - لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہم اس پر بحث کرنا ترک کر دیں - غور سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ اس مسئلہ کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا - بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہے - جس رسم خط میں صرف کم ہوگا ' وقت کم لگے گا ' جگہ کم گھرے گی ' اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہو گی وہی مقبول ہو کے رہیگا - عام طور پر لوگوں نے اسے ہندی اردو سے متعلق کرکے جھگڑے کے لیئے ایک نیا شاخسانہ کھڑا کر لیا ہے - رسم خط کا مسئلہ عام ہے اور ہندوستان کی تمام زبانوں سے تعلق رکھتا ہے - اس کا حل آسان ہو ' لیکن اس کا رواج آسان نہیں - اس کے لئے ایک مدت درکار ہوگی - فی الحال یہ مناسب معلوم ہوتا

ھے کہ ھمارے رسوم خط میں جو نقائص ھیں اُن کی اصلاح کشادہ دلی سے کی جائے - ھندی سمیلن نے اس طرف قدم اتھایا ھے- اسي طرح اگر کوئی ایک کمیتي ایسی قرار دی جائے جو اردو رسم خط پر غور کرکے اس میں مناسب اصلاح عمل میں لاے تو ایک مفید کام ھوگا -

ھندوستانی اکیڈیمی کا وجود اس صوبے میں بہت غنیمت ھے - و اسی قسم کے مسائل حل کرنے اور اسي طرح کی اصلاحیں عمل میں لا کے لئے قائم کی گئی تھی - میں اس وقت اس کے کاموں پر کوئی تبصر کرنا نہیں چاھتا ' لیکن اکیڈیمی کے کار فرماؤں کی خدمت میں اس قدر عرض کرنے کی جرأت کرتا ھوں کہ جب اکیڈیمی نے ھندوستانی کا لقب اختیار کیا ھے اور ھندوستانی کے رواج کا بیڑا اتھایا ھے تو کیوں اب تک کچھ کتابیں ایسی تالیف نہیں کرائی گئیں اور کوئی رسالہ ایس شایع نہیں کیا گیا جو ھندوستانی زبان میں ھو اور بجنسہ بغیر کسي تغیر و تبدلی کے دونوں رسم خط میں لکھا جاسکے - اگر یہ ممکن ھو او اکیڈیمی اس کی کوشش کرے تو زبان کی بڑی خدمت ھوگی - اور یہ ج اعتراض ھے کہ ھندوستاني کي دوڑ صرف معمولي بول چال اور کارو بار تک ھے اور ادب میں اس کي کوئي حیثیت نہیں ' بہت کچھ رفع ھو جا گا - اور اس سے بھي زیادہ مفید کام جو اکیڈیمي کرسکتي ھے وہ یہ ھے ک وہ اسي زبان میں ایسي ریڈریں تیار کراے جو دونوں رسم خط میں لکھ جائیں اور مدارس میں رائج کي جائیں - اس لیے وہ دورنگي جو اس وقت اس صوبے کے مدارس میں پائي جاتي ھے خود بخود اُتھ جائے گي اور لڑکے ابتدا سے ایسي زبان لکھنے اور بولنے کے عادی ھو جائیں گے جو اس علاقے کا ھر شخص سمجھ سکتا ھے - ھندوستاني کے رواج کا سب سے ب ذریعہ یہ مدارس ھوسکتے ھیں - جب زبان ایک ھو جائے گي تو رسم خ

کي نزاع آپ سے آپ اٹھ جائے گي - ابھی زبان ھي ایک نھیں ' رسم خط کی بحث کیسی -

حضرات!

وقت گزرتا جاتا ھے اور بہت سے ایسے مسائل ادھورے پڑے ھیں - اگر ھم فوراً اور بہت جلد ان کو طے نھیں کرسکتے تو کم سے کم ھمیں ان کے جلد طے کرنے کا سامان فوراً مہیا کرنا چاھئے - جس وقت کوئی ایسی تجویز پیش ھو اور انشاءاللہ اس کا موقع بہت جلد آنے والا ھے تو مجھے امید ھے کہ وہ اصحاب جو اپني زبان کے سچے بھي خواہ ھیں اپنے تجربہ اور مشورے سے مدد دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے -

---

خطبۂ صدارت

از

پنڈت گنگا ناتھ جھا

سابق وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی

جو

ہندستانی اکیڈیمی کی چوتھی ادبی کانفرنس کے شعبۂ ہندی میں

دیا گیا ۔

ایکم ست بپرا وسودھا ودنتی

ایکم ایو پرم برمہہ ویوھارے پرتھک و دھم

معنی : وجود ایک ہے ' برھمن لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ایک ہی ہستی مطلق عملی دنیا میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے -

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج اس منصب پر آنے میں مجھے کتنی مسرت ہوئی - اسکے لئے میں شکر گذار ہوں - لیکن زیادہ شکر گذار اس امر پر ہوں کہ اب میرا یہ زمانہ آگیا ہے جب " گھرسیت ایوکشے شومر ستونا دھرم ماچریت " معنی : جب موت چوٹی پکڑ لیتی ہے اس وقت دھرم کا عمل کرنا چاہئے -

اس قاعدہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے - اس کے تحت میں جو اصول یا جو مباحث میرے ذہن میں آتے ہیں انکو اہل علم کے سامنے ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں ' اس کے شروع کرنے کا موقع آج مجھکو آپ کی عنایتوں سے حاصل ہوا ہے - هندستانی اکیڈیمی جب قائم ہوئی اس وقت میں موجود تھا - اس کا پہلا فرض تھا اصلاح زبان ' اور اصلاح بھی اس طرح کی کہ جس سے اردو اور هندی کا اختلاف دور ہو جائے - اختلاف میں اتحاد پیدا کرنا فلسفیوں کا همیشہ سے فرض رہا ہے اسلئے یہ فرض قابل تسلیم ہے اور همیشہ رہیگا -

لیکن میرے دل میں کچھ شبہہ شروع ہی سے ہونے لگا - ممکن ہے کہ میں اُن بلند نظروں کی جماعت کے درجے تک نہیں پہونچا ہوں جن کے لئے " ایک میوا دوتیم برمہ " یعنی برمہ ایک ہی ہے اور دوسرا

نہیں ، صرف ملتہائے اصول ہی نہیں ہے بلکہ ان کے تجربے بھی ہو چکے ہیں - میری عقل ابھی تک اسی کاروباری حالت میں گھری ہوئی ہے ، جس سے میری نگاہ ابھی تک بیچ ہی کی حالت میں ہے - اسی وجہ سے میرے خیالات برابر ایسے رہے ہیں کہ روحانی نقطہ نظر سے صرف ہندی اور اردو ہی نہیں بلکہ ملک کی تمام زبانیں ایک ہیں اور رہیں گی ، مگر جب تک ہم عملی حالت میں ہیں ، اختلاف ماننا ہی پڑے گا ، اور اُسی کے مطابق کام بھی کرنا ہوگا -

اس طرح کا خیال میرے دل میں یکا یک ہی نہیں پیدا ہوا - بلکہ جب سے میں سنہ ۱۹۰۲ع میں الہ‌آباد آیا اور ٹکسٹ بک کمیٹی کا ممبر ہوا اُسی وقت سے دیکھنے لگا اور برتنے کی کوشش بھی کرنے لگا - اُن سرکاری احکام کو جن کے مطابق ان صوبوں میں ہندی اور اردو کو متحد کرنا ٹکسٹ بک کا سب سے بڑا فرض تھا اس وقت سے متحد کرنے کی کوشش کو خود اور روایتی طور سے دیکھتا اور بھگتتا رہا - اس تجربے سے میرے دل میں یہ اصول جاگزیں ہو گیا کہ معمولی بول چال میں " میں کھاتا ہوں میں جاتا ہوں " وغیرہ کے استعمال تو ایک قسم کے ہیں اور ایک قسم کے ہوتے رہیں گے ، لیکن مضمون نگاری اور تصنیف کے عمل میں یکسانیت قطعاً نا ممکن ہے - غیر ممکن ہی نہیں بلکہ برباد کن ہے - اتنا ہی نہیں بلکہ پریم ساگر کے زمانہ تصنیف سے ہندی کی جو روش شروع ہوئی وہ اس حالت کو پہونچ گئی تھی کہ اب اس کو دوسرے راستے سے لے جانا تباہ کن ہوگا - اور ان زبانوں کا اتحاد اُسی وقت ممکن ہوگا جب پانی کے کل دھارے وجود مطلق کے بحر بے پایاں میں محو ہوجائیں گے -

جس آدمی کے دل میں یہ اصول جاگزیں ہو گیا تھا اُسے دونوں زبانوں کے متحدہ کرنے والے ادارے کو دیکھ کر تعجب ہونے لگا - (اپنے اصول پر

شبہ ہونے لگا) جب ہندی اور اردو کے بڑے بڑے عالم و فاضل اور مصنفین اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں تو یہ اتنا غیر ممکن نہیں ہو سکتا جتنا میں نے سمجھ رکھا تھا ' اس سے اپنی عقل پر اعتماد بھی کمزور ہوگیا اور بڑے اشتیاق سے ہندستانی اکیڈیمی کے کارناموں کو دیکھنے لگا -

لیکن کچھ ہی دنوں - مہینے سے بھی کچھ کم میں یہ دکھائی دیا کہ ہندی اور اردو کے دونوں دھاروں کا پریاگ پر بھی سنگم نہیں ہو رہا ہے ' اور دونوں دھارے ساتھ ساتھ اور الگ الگ چل رہے ہیں اور چلائے جا رہے ہیں - دونوں زبانوں میں علحدہ علحدہ کتابیں تیار ہو رہی ہیں اور آخر میں اس ادارہ کے آرگن تماہی رسالے بھی الگ الگ نکل رہے ہیں -

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب یونیورسٹی میں میری یہ تحریک ہوئی تھی کہ ہندی اور اردو کے بورڈ آف سٹڈیز (Board of Studies) الگ ہوں - ہندی اور اردو دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں - کورس بھی ان کے الگ تھے مگر کورس کو مقرر کرنے والا بورڈ ایک ہی تھا جس میں سات ممبر ہوتے تھے - اور کورس مقرر کرنا پڑ گیا تھا ' صرف ہندی اور اردو ہی کا نہیں بلکہ مرہٹی ' گجراتی اور بنگلہ کا بھی - اسی سے میں نے دو بورڈوں کی تجویز کی تھی - اس کی سخت مخالفت کی گئی کہ الگ بورڈ بنانے سے دونوں زبانوں کے ایک ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور آخر کار یہ تحریک کثرت رائے سے نا منظور ہو گئی -

ایسے تجربے کے بعد آج اس ہندستانی اکیڈیمی کے اندر ' ہندی اور اردو کے الگ الگ اجلاسوں کو دیکھ کر ' اور اس سے اپنے اصولوں کی تائید پاکر میں کتنا مسرور ہوں ' میں نہیں کہہ سکتا -

جیسا ہوا ہے ویسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا ' یہی مناسب تھا اور یہی مناسب ہے - مروجہ زبانوں کی رو زبان کے استعمال کرنے والوں کے

مذاق پر منحصر ہے - ہمیشہ اور ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے - مروجہ زبانوں
پر حکومت نہیں کام کرتی - اگر حکومت کام کرتی تو پانینی سے لے کر دیگر
واعد دانوں کا تسلط رہتے ہوئے بھی - "مرتو' آتما" (یہ دونوں لفظ
سنسکرت میں مذکر ہیں) لفظوں کا استعمال صیغہ مؤنث میں کبھی
ہ ہوتا ' موت اور روح کے الفاظ اردو میں مؤنث کیوں نہ استعمال کئے جاتے
ہوں لیکن ان کے هندی ترجمے مرتو اور آتما کو مؤنث لکھنا ' شاستری
حکام کے خلاف ہے - لیکن اسے غلط کہنے کا ساهس (کی همت) نہیں ہوسکتا '
مجھے شبہہ ہے کہ "کا ساهس" یا "کی ساهس" کہیں ' کیونکہ
سنسکرت میں لفظ ساهس مؤنث نہیں مانا گیا ہے) مروجہ زبان میں
، کا استعمال مؤنث میں ہوتا دکھائی دیتا ہے اور هندی میں ضرور
حیح ماننا پڑیگا -

مجھے یقین ہے - مجھے امید ہے - میری خواہش ہے کہ اب اسی
تے پر لوگ چلیں گے اور دونوں کا رواج جاری رہا ہے - اور جاری رہے گا
جہ آخری مقصد ایک ہی کی طرف رجوع رہنا رہے گا - اس طرح
لنفین بھی "ایکمست" والے اصول کو ذہن میں رکھتے ہوئے عملی
ت میں "بہرا بہودها ودنتی" والے اصول کی تقلید کرتے جائیں گے
هندی اردو دونوں دھاراؤں کو زندہ رکھیں گے -

صرف اسی ملک میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں ایک ہی زبان
ہونے کوشش بھی رہے - "ایکمست" - لیکن جب تک یہ کوشش
اب نہیں ہوتی اس وقت تک عمل کی حالت میں مختلف زبانیں
، اس صوبے میں هندی اردو دونوں کا مناسب طور پر استعمال ہوتا
، ہم ایسے بیچ کے لوگوں کے لئے یہی مناسب ہوگا "بہرا بہودها دونتی"
ہی وید کا حکم ہے - تمام شد -

شکریہ

از

ڈاکٹر تارا چند
ایم - اے ، ڈی - فل ، سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی

جو

ہندستانی اکیڈیمی کی چوتھی ادبی کانفرنس میں دیا گیا -

شکریہ از جناب سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی

ہندستانی اکیڈیمی کی طرف سے میرا کرتویہ ہے کہ میں مسٹر سچدانند سنہا ' ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا اور مولانا عبدالحق کا شکریہ ادا کروں - آپ نے ہمپر جو احسان کیا ہے اُس کے گنوں کی چرچا کرنا میرا میرے فرض ہے - اکیڈیمی کی نیو کو ڈلے آج قریب قریب نو برس پورے ہوتے ہیں - لوگ پوچھتے ہیں کہ اِن نو برسوں میں اِس نے کیا کام کیا - اور آگے اس سے کیا آشا ہے - ادب یا ساہتیہ کی تاریخ سے پرچے رکھنے والے جانتے ہیں کہ کسی قوم یا اُس کے ادب کے جیون میں ۹ برس کا سمے بہت تھوڑا ہوتا ہے - اتنے سمے میں کسی بڑی تبدیلی کی اُمید کٹھن ہے - پھر بھاشا جس پر ادب کا آسرا ہے بڑی حد تک اپنے سوبھاؤ سے ہی بدلتی ہے - سماج کی گتی کے ساتھ بنتی اور بگڑتی ہے - لیکن سماج کی چال کا جن شکتیوں پر آدھار ہے اُن پر قابو پانا آسان نہیں -

یہ مانتے ہوئے بھی اتنا کہدینا ضروری جان پڑتا ہے کہ سماج بھاشا پر دو طرح سے اثر ڈالتی ہے - ارادے اور اِچھا کے ساتھ بھی اور بنا ارادے کے انجان طریقوں سے بھی - ہر سماج اپنی نئی پودھہ کے بچوں کو بھاشا سکھلاتی ہے لیکن پہلے پہل بنا کسی جانے بوجھے طریقہ کے یہ تعلیم ہوتی ہے - ماں باپ ' کنبے اور پڑوس والوں سے لڑکے لڑکیاں بولی سیکھتے ہیں - لیکن اس طرح کی سکشا پانے کے بعد بھی بالک تعلیم کے دوسرے راستے پر چلنا شروع کرتے ہیں ' مدرسوں اور پاٹھ شالوں میں جاتے ہیں - یہ راستہ اُس تعلیم کا ہے جسکے طریقے سوچ سمجھکر نکالے گئے ہیں - سماج کی اِچھا اور ارادہ سے پیدا ہوئے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں -

بھاشا پر بھی دونوں طرح کے اثر پڑتے ھیں - ایک تو وہ جنکا سمبندھہ ھمارے ارادے کے ساتھ ھے اور دوسرے وہ جو آدمیوں کے میل سے ' انکے ارادوں کے بنا ھی کام کرتے ھیں - جہاں تک اکیڈیمی جیسی سنستھاؤں کا تعلق ھے اونکا فرض ھے کہ سوچ سمجھکر ایسے اثر پیدا کرنے کی کوشش کریں جن کے زور سے ایسی بھاشا بنے جو دیش اور جات کے کام کے لئے مفید ھو -

اگر اس نگاہ سے بھاشا کے سوال پر غور کریں تو دو تین باتوں کی طرف دھیان دینا ضروری ھوگا - پہلی بات تو یہ ھے کہ ھمارے لئے بڑے فخر اور گورو کی جگہہ ھے کہ سارے ھندوستان نے ھمارے صوبے کی زبان کو ھی اس یوگیہ سمجھا ھے کہ یہ کل قوم کی زبان بنے - لیکن اسی کے ساتھہ دکھہ اس بات کا ھے کہ ھمارے صوبے میں بھاری دبدھا ھے کہ اس زبان کی صورت کیسی ھو - سوچنے کی بات ھے کہ بنگال' مہاراشٹر ' گجرات ' پنجاب میں بنگلہ ' مراٹھی ' گجراتی یا پنجابی بلا تفریق کے صوبہ کے سب رھنے والوں کی ایک بھاشا ھے - دکھن میں بھی دراوڑی بھاشاؤں کی یہی حالت ھے - لیکن ھمارے صوبے میں جہاں کی زبان کو سب ھندوستانی سیکھنا چاھتے ھیں چاھے وہ اتر میں رھتے ھوں چاھے دکھن میں وھاں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ھوسکا کہ صوبے کی زبان کیا ھو - زبان ایک ھو یا دو ھوں - اس دبدھا کے نتیجے اچھے نہیں ھیں - اس سے ایکتا کی بجائے انیکتا پھیلنے کا ڈر ھے - یہ انیکتا دیش اور صوبے دونوں کے ھتوں کے وِرودھی ھے -

اس وقت صوبے کا ھی خیال کیجئے اور یہاں کی کٹھنائیوں پر دھیان دیجئے - یہ سب چاھتے ھیں کہ ھماری تعلیم نیچے درجوں سے لیکر اونچے سے اونچے درجے تک ھمارے دیش کی بھاشا کے ذریعہ سے ھو -

بلکل ' مہاراشٹر ' گجرات اور تامل دیشوں میں یہ آسانی سے ہو سکتا ہے پر اپنے صوبے میں بڑی مشکل ہے - اس سے جب کہول انٹرینس تک کی پڑھائی دیشی بھاشا میں ہوتی ہے تب بھی اسکول کی ہر ایک جماعت میں اودو اور ھندی کی الگ الگ کتابیں ہیں - ماسٹروں کو دونوں بھاشاؤنکا ایک سا ابھیاس نہیں ' ایک بھاشا استعمال کرتے ہیں تو دوسری زبان کے لڑکے نہیں سمجھتے - دونوں بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو گھنٹے میں سبق کم پڑھا سکتے ہیں - اگر ایف - اے ' بی - اے اور ایم - اے میں بھی دیشی بھاشا دوارا پڑھائی ہوئی تو ظاہر ہے کٹھنائی بڑھ جائیگی - کیونکہ اونچے درجے کے مضمونوں کو پڑھانے کے لئے زبانیں وگیان اور علم کی پری بھاشاؤں اور اصطلاحوں کی وجہ سے اور بھی دور دور ہوتی جائیں گی - ایک ھی یونیورسٹی میں ایک ھی وشے کو پڑھانے کے لئے دو دو پروفیسر رکھنے پڑینگے - اس وقت بھی یونیورسٹی کی تعلیم کا خرچہ صوبے پر بھاری ہو رہا ہے آگے تو اس کا بوجھ سہنے قابل نہ رہ جائے گا -

پھر کونسلوں میں کیا ہوگا - ممبر کس بھاشا میں بولینگے - ان کی تقریروں کو کون سمجھیگا - رائے دینے والوں کو کیسے سمجھائنگے - اخباروں اور اشتہاروں میں ' سرکاری احکاموں میں کونسی بھاشا کا پریوگ کرینگے ؟ اگر دو دو زبانیں چلیں تو صوبے کا جیون دو بھاگوں میں بٹ جائیگا - مذہب تو انیک ہیں ھی ' سماجیں الگ الگ ہو جائینگی - راج نیتی ' شکشا ' سبھیتا ' سیاست ' تعلیم ' تمدن سب ھی جدا جدا ہونگے - ایسی حالت میں یہ ممکن ہے کہ بجائے اس کے کہ ہمارے صوبے کی بھاشا سارے دیش کی بھاشا ہو ' اس صوبے کی بھاشا یہ جگہ لے جو ان جھگڑوں سے پاک صاف ہے اور جس میں اونچے سے اونچے وشیوں کی تعلیم ہو سکتی ہے - یہ ہمارے لئے شرم کی بات ہوگی -

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ ایکتا کی کوشش بیکار ہے - ہمارے دیش میں ایک زبان کبھی نہیں چل سکتی - یہ تو میں مانتا ہوں کہ اس سمے دیش کی حالت بری ہے، سمپرداؤں اور فرقوں کے جھگڑوں نے کولاہل مچا رکھا ہے - طبیعتوں میں بھید اور دویش ہے، دلوں میں بھڑکنی ہے - لیکن کیا یہی حالت ہمیشہ بنی رہیگی ؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں - اس دشا کے نتیجے ایسے بھیانک ہیں کہ ان کو سونچنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں- کون ہے جو اپنی آنیوالی سنتانوں کو سدا کے لئے دکھ، پھوٹ اور غلامی کی ابھاگی دشا میں پڑا رہنا پسند کریگا ؟ اس وقت دیش پر چاہے جتنا گہرا اندھیرا چھایا ہو وہ سمے ضرور آئیگا جب اِس کالی رات کی سیاہی دور ہوگی اور پریم اور عقل کا سورج اودے ہوگا - ہمیں اُس وقت کی تیاری کرنی چاہئے -

زبان کے متعلق بہت سی بھکی باتیں ہو رہی ہیں - کچھ نے تو یہ وچار کرلیا ہے کہ زبان کے ساتھ مذہب ایسا بندھا ہوا ہے کہ اگر زبان پر کوئی وار ہوا جس سے اس میں کمزوری آئی تو مذہب بھی چل بسے گا - یہ بڑی بھول ہے - یورپ اور امریکہ میں کروڑوں عیسائی ہیں اُن میں سے سوائے اِنے گنے لوگوں کے کسی کو عیسائی دھرم کی اصلی بھاشا کا گیان نہیں ہے - حضرت عیسیٰ مسیح عبرانی بولتے تھے - اسی میں انجیل کی پرانی اور نئی کتابیں ہیں - مگر انگلستان، فرانس اور جرمنی اتیاد دیشوں کے عیسائیوں کو کبھی یہ گھبراہٹ نہیں ہوئی کہ بائبل کے عبرانی میں نہونے کے کارن اُن کے دھرم میں کوئی دربلتا آئی ہو - چین میں کروڑوں بدھ اور مسلمان ہیں - نہ بدھ پالی جانتے ہیں جو ان کے دھرم کی پستکوں کی بھاشا ہے نہ مسلمان عربی - لیکن دونوں اپنے اپنے مذہب میں پکے ہیں - ہندی میں اگر فارسی عربی کا پٹ دے دیا جائے تو ہندو دھرم

کی ہاں نہیں ہوسکتی اور اردو اگر ہندی کے لفظ اختیار کر لے تو اسلام خطرے میں نہیں پڑجائیگا -

نہ یہی خیال ٹھیک ہے کہ ہندوؤں کی سبھیتا اور مسلمانوں کے تمدن کی رکھشا کے لئے دو الگ الگ زبانیں یعنی پنڈتاؤ ہندی اور مولویانہ اردو ضروری ہیں - پہلا سوال تو یہی اٹھتا ہے کہ کیا سچ مچ ہمارے یہاں دو سبھیتائیں یا تمدن ہیں - یہ سب جانتے ہیں کہ سبھیتا کا سمبندھ دو چیزوں سے ہے ایک ہمارے اندر ہے دوسری باہر ' اندر والی چیز من ہے باہر والی سماج - من کی دو صورتیں ہیں وچار اور بھاؤ - سماج بھی دو کھمبوں کے سہارے کھڑی ہے ' شکھشا اور سمپتی - اب اگر ہم ہندستان کے بنیج بیوپار یا کھیتی اور دستکاری کیطرف دیکھیں تو سمپردائوں اور فرقوں میں تنک بھی فرق نہ ملیگا - تعلیم بھی سب کی بہت کچھ ایک سی ہو رہی ہے سب پر ایک ہی طرح کے وچارونکا جن کا سوتا یوروپ ہے اثر پڑ رہا ہے - پرانے زمانے کے درشن اور شاستر ' علم اور فلسفہ کیطرف سے دھیان ہٹ رہا ہے - کیول اس لئے نہیں کہ ہم انگریزی مدرسوں میں پڑھتے ہیں اور ہمارے دلوں پر یوروپ کا رعب چھایا ہوا ہے - بلکہ اس لئے کہ سائنس اور فلسفی کا آدمی ماتر کی بدھی سے ناتا ہے اور اس لئے وہ کسی خاص دیش کی نہیں ساری دنیا کی اکساں میراث ہے -

بھاوؤں کو دیکھئے - ایک طرف وہ جیون کی یاترا کا راستہ نشچے کرتے ہیں - دوسری طرف سفر کی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے راہ کو کانٹوں سے صاف کر رنگ برنگے پھول پتوں سے سجاتے ہیں - ہمارے دیش میں آدمی اور سماج کے جیون میں نئی طاقتوں نئے وچاروں کا زور دکھائی دیتا ہے - مذہب کے ساتھ وطن کا بھاؤ دلوں پر قبضہ کر رہا ہے - گاؤں کے

جھونپڑوں میں ' شہر کے مکانوں میں ' رئیسوں کے محلوں میں اس کی آواز گونج رہی ہے - یہ آدمیوں کے ملنوں کے باندھنے میں ' ہندوستانیوں کو ایک سماج بنانے میں دن و دن سپھلتا حاصل کر رہا ہے - اس بہاؤ کا ہماری کلا میں ' آرٹ میں ' ادب میں ' کوتا میں سنچار ہو رہا ہے - عبدالرحمن چغتائی ہوں یا نند لال بوس ' ان کی تصویروں کے پاتر اپنی مجلسوں میں یا شیو پاروتی دونوں کا طرز ایک ہے ' عمل ایک ہے ' رنگ آمیزی ایک ہے ' سندرتا کا آدرش ایک ہے -

غرض یہ کہ اگر ہم اپنی سماج کے جیون سمدر کی گہری جانچ کریں تو معلوم ہوگا کہ کوڑا کرکٹ جھاگ اور پھین سے ڈھکی ہوئی سطح کے نیچے ایک ہی پانی ہے جو لہریں لے رہا ہے - تفرقہ کا اندر جال دکھاوٹی ہے جو آن کی آن میں ٹوٹ سکتا ہے - آئیے ہم آپ اس اکیڈیمی کے ممبر مل کر وہ اسم اعظم پڑھیں جو اس طلسماتی ڈھونگ کا سدا کے لئے انت کر دے -

اردو ہندی کا فرق ' زبانوں کے ڈھانچے کا فرق تو ہے نہیں - دونوں کی قواعد یا ویاکرن ایک ہے ' دونوں ایک ہی بھاشا آرین کی شاکھائیں ہیں - دونوں کا شبدوں کا بھنڈار بہت کچھ ملتا جلتا ہے - فرق ہے تو کوتا میں چھندوں کا ' ادب میں کچھ لفظوں کا اور ترکیبوں کا - چھند کا فرق تو پرانا ہے ' لیکن آج کل ہندی اور اردو دونوں میں نئی نئی بحریں چل رہی ہیں جو اس فرق کو دھیرے دھیرے مٹا رہی ہیں - مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں ایک سے راگ سنائی دیتے ہیں - ترکیبوں کا فرق آسانی سے مٹ سکتا ہے - لفظوں میں مشکل ہے - خاص کر علم یا وگیان کی بھاشا میں - لیکن ابھی یہ فرق اتنا نہیں بڑھا ہے کہ رک نہ سکے - سنسکرت اور عربی کے تتسم شبدوں سے پرہیز کرنے سے اور ہندستانی میں تت بھو شبد گھڑنے کے لئے قاعدے بنانے سے یہ کٹھنائی دور ہو سکتی ہے - جو شبد ہمارے

یہاں پیشہ وروں میں استعمال میں آتے ہیں ان سے بہت سی اصطلاحیں مل سکتی ہیں - مادہ یا مول شبد کہیں کا ہو اُسپر ہندوستانی پرتیہہ سابقے اور لاحقے اتیادہ لگا کر ہندستانی بنایا جاسکتا ہے - اسی طرح سنگیا (اسم) سے کرم (فعل) اور فعل سے اسم بن سکتے ہیں - اور اسی طرح اور شبد اور سماس یا مرکب - یہ کوئی نئی بات نہیں ہندی اور اردو کا اِتہاس اس طرح کے ملنوں' پریوگوں سے بھرا ہے- ہمارے ملک کا نام ہندستان ہی اس کا ثبوت ہے - یہ نام اُس میل کی اور اشارہ کرتا ہے جس کی چھاپ ہماری آبادی پر ہے ' ہماری سبھیتا ' کلا اور ادب پر ہے -

سماج ملنوں کے میل سے پیدا ہوتی ہے - اور بھاشا سماج کے جیون میں پران ہے - من مل جائیں تو ایک سماج بن جائے اور ایک بھاشا پیدا ہوجائے- بڑی حد تک یہ کام شاعر اور ادیب' کوی اور لیکھک کرسکتے ہیں- وہ نہیں جو لفظوں کے آڈمبر رچتے ہیں ' لیکن وہ جن کے لئے کہا ہے کہ شاعری کا درجہ پیمبری ہے - یہ لوگ زبان کے سنوارنے والے تو ہیں ہی ملنوں کے ملانے والے بھی ہوسکتے ہیں - افسوس ہے اس وقت ایسے شاعر اور ادیب کم ہیں جن کا کوئی پیام ہو - کیوں نہیں ہمارے کوی اُس دنیا کا سندیسا دیتے جس کے سنہولے آسمان پر الست سکھ کی مسکراہٹ ہے ' جس کی ہری بھری زمین پر شانتی سدا راج کرتی ہے اور جہاں ستیہ ' سندرتا اور آنند کی دیویوں کے مندر ہیں - اصلی کوی وہی ہے جس کا انبھو یا حس تیز ہے - وہ اس دنیا میں کلیوں کی چٹک میں قدرت کے رسیلے راگ سنتا ہے - پھولوں کی شوخی میں ایک رتوں کے انوکھے درشیہ دیکھتا ہے - ترنت اُس کی کلپنا اُسے ایک دوسری دنیا میں پہنچا دیتی ہے اور وہ یہاں میں وہاں کی لیلا کی جھلک پاتا ہے - وہ آدمیوں کے آپس کے بیوہاروں میں کوتوہل کا انبھو کرتا ہے - سماج کے جیون پرواہ کا تماشہ

دیکھتا ہے - اُس کی وچار شکتی تخیل کی قوت آدمیوں میں او
سماج کی سنستھاؤں میں اپار دنیا کے پاتروں کا چرت اتل نیتک ا
اخلاقی قوتوں کی کاروائی دیکھتی ہے - کویتا ' ناٹک ' قصے اور کہانی
اُس کی چترائی کا پتہ دیتے ہیں ' گنوں کو وہ اپنی رچنا (تخلیق
کے بل سے اُس دور سے دور لیکن نزدیک سے نزدیک دنیا کی خبر اڑا لاتا ہے
اور اس دنیا کے معمولی انسانوں تک پہونچاکر ان کے دلوں کو امنگ
جوش اور ولولے سے بھر دیتا ہے -

اگر ہماری اکیڈمی ہمارے کویوں اور لیکھکوں کو جگا سکے تاکہ
وہ اِس مایاوی دنیا کے سپنوں کی اصلیت پہچان لیں اور اُس سچی
دنیا کے امرت مے نور سے ہمارے ملوں کو روشن کردیں تو سچ مچ
اِس سنستھا کا مقصد پورا ہوجائے -

مجھے امید ہے کہ مستر سبھا جو برسوں سے ان آدرشوں کے پورا کرنے
میں لگے ہیں ہماری اس نئی سنستھا کو اس راستہ پر چلنے میں
سہائیتا دیں گے -

اشتہار

شعلہ طور

(از جگر مرادابادی)

سادگی و پرکاری ' بے خودی و هشیاری ' جو فارسی میں امیر خسرو کے کلام کی مخصوص صفت هے اردو میں جگر مرادابادی کے حصہ میں آئی هے - شعلہ طور جگر مرادابادی کے کلام کا مکمل مجموعہ هے -

کاغذ طباعت ' کتابت اعلیٰ سر ورق خوشنما رنگین جلد نفیس قیمت صرف تین روپیہ -

---

جاپان

مصنفہ چمن لال صاحب - مترجمہ محمود علی خان صاحب (جامعی)

آج سے صرف اسی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن هے بالکل گمنامی میں پڑا تھا - لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں هونے لگا اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے - جس کے متعلق ڈاکٹر جے ' ٹی سنڈر لینڈ (امریکہ) کی رائے هے کہ "مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں هے کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پر از معلومات تصنیف هے ' مجھے یہ دیکھہ کر حیرت هوتی هے کہ کس خوبی سے اسکے صفحات میں تازہ ترین اور دلچسپ معلومات کوٹ کوٹ کر بھری هیں- قابل مصنف نے ایک هندوستانی کی حیثیت سے کتاب لکھتے وقت هندوستان کو پیش نظر رکھا هے"-

ضخامت ۲۵۰ صفحات ' بلاک کی ۳۰ تصاویر مجلد ۲ روپئے غیر مجلد ۱۱ تصاویر ۱ روپیہ ۸ آنہ -

نفرت کا بیج

(ڈراما) از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم - اے

زندگی میں اس سے زیادہ کوئی چیز تلخی پیدا نہیں کرسکتی کہ دوست ناراض ہو کر دشمن بن جائیں ' یا اپنی خود غرضیوں پر دوستی کو قربان کریں - لیکن اس کے باوجود اس سے زیادہ کوئی چیز عام بھی نہیں ہے - ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ خود غرضیاں جو دوستی کو بد دلی میں تبدیل کر دیتی ہیں صرف تعلقات میں کشیدگی تک پہنچ جائیں لیکن کبھی کبھی اِن کی حد سخت نفرت تک پہنچ جاتی ہے - جو اپنے دل میں محبت کی جگہہ نفرت کا بیج بوتے ہیں اس تمثیل کو ذرا غور سے پڑھیں- قیمت ۸ آنہ -

---

خطبات خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیئے تھے - پہلے چار لکچروں میں ترکی کی تاریخ نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے - پانچویں اور چھٹے لکچر میں ترکی ادب ' اِن کی شاعری ' اِن کے ڈرامے اور ان کے صحیح ذوق پر ایک بے انتہا دلچسپ تبصرہ ہے ' ساتویں لکچر میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کی عورتوں نے کس طرح مردوں کے دوش بدوش قومی تعمیر میں حصہ لیا - اور آٹھویں لکچر میں آیندہ کی امیدوں کو پیش کیا گیا ہے - انگریزی' قیمت ۳ روپیہ اردو ' قیمت ۲ روپیہ -

---

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماهی رساله

جلد ۶	اپریل سنه ۱۹۳۶ع	حصه ۲

اردو هندی اور هندوستانی

(از مسٹر کرشن پرشاد کول)

اُردو اور هندی کا جهگڑا پرانا هے - اس جهگڑے کی بنا سیاسی بلکه قومی هے - یه ادبی قضیه نهیں - یہاں اس واردات کی سرگزشت کے سرسری بیاں کا بهی موقع نهیں تاهم احباب کو یه یاد دلانا بےمحل نهوگا که اس قضیه کا شور پہلے پہل اُس کے بعد سننے میں آیا که جب سر سید مرحوم نے کانگرس کی مخالفت اس صوبه میں شروع کی تهی اس جهگڑے کا تانتا بعد میں مسلم لیگ اور هندو سبها کی شکل میں جاری رها اور اب بهی جاری هے - غرض کهنے کی یه هے که اس جهگڑے کی بنا قومی تعصب یا سیاسی اختلاف سے پڑی گو اب هر ایک فریق اسکا دعویدار هےکه "هندوستانی قومیت" کے خیال کو پخته کرنے اور عملی جامه پهنانے کے لئے لازمی هے که اُردو یا هندی سارے ملک کی زبان قرار پائے - اس قضیه کو ختم کرنے کی غرض سے چند صلح پسند اور نیک نیت لوگوں نے اب "هندوستانی" زبان کا مسئله چهیڑ کر یا یوں کهئے که تصفیه پیش کرکے اور اُلجهن پیدا کردی هے - یه تصفیه زیاده تر سیاسی اغراض کی هی بنا پر پیش کیا جاتا هے - گو "هندوستانی" زبان کے حامیوں میں ایسے لوگوں کی بهی کافی جماعت شامل هے که جو

محض ادبی زبان کی اصلاح چاہتے ہیں - اس تمہید سے غرض یہ ہے کہ سیاسی ، قومی اور ادبی پہلوؤں کے خلط ملت ہو جانے سے ایسی کُنجلک پیدا ہوگئی ہے اور قومی جوش کی کشمکش نے اس میں ایسی گتھیاں ڈال دی ہیں کہ معمولی آدمی کے لئے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا اور کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنا اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہو گیا ہے اس قضیے کا فیصل کرنا تو کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں نہ راقم حروف کو اس کا دعویٰ ہے ' البتہ اس بات کی کوشش اس مضمون میں ضرور کی جائیگی کہ مسئلۂ کے مختلف پہلوؤں پر اطمینان سے غور کیا جا سکے اور اس مسئلۂ کے مختلف پہلوؤں کے خلط ملت ہوجانے سے جو کُنجلک پیدا ہو گئی ہے وہ دور کی جا سکے اور بس -

اس مسئۂ کے دو پہلو ہیں ایک محض سیاسی اور دوسرا ادبی - دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں یہاں پہلے سیاسی پہلو سے بحث کی جائیگی اور بعد میں ادبی پہلو سے - کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستانی قومیت کے معیار کو خواب و خیال کی باتوں سے قطع نظر کرکے اصلیت اور حقیقت میں تبدیل کرنا منظور ہے تو لابدی ہے کہ سارے ملک کی ایک زبان ہو - اُردو کے حامی آردو کو سارے ملک کی زبان قرار دینا چاہتے ہیں اور ہندی کے دعویدار ہندی کو - ایک اور جماعت بلحاظ انصاف و صلح " ہندوستانی " زبان کو سارے ملک میں رائج کیا چاہتی ہے - اگر چھوٹا منھ بڑی بات نہ خیال کی جاے تو میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ " ہندوستانی قومیت " یا nationalism کی حمایت میں سارے ملک کی ایک زبان قرار دینے کا خیال ہی خواہ مخواہ کی زبردستی ہے - " قومیت " کے لئے زبان کا عنصر لازم نہیں - " قومیت " کے لئے مذہب کا عنصر بھی لازمی نہیں - وہ زمانۂ پارینہ کی داستانیں ہیں کہ

جب ایسا تھا - موجودہ تہذیب و تمدن کے دور میں " قومیت " کی بنا سیاسی اغراض کی یکجہتی پر ڈالی جاتی ہے اور اس کا خمیر اقتصادی اغراض کی یکسانیت سے گوندھا جاتا ہے تمام مہذب دنیا میں ایسا ہی ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ہندوستان میں بھی یہی ہوگا اس کے آثار آج بھی نمایاں ہیں - برطانیہ اور امریکہ ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم سے ہیں - ایک ہی مذہب ' ایک ہی زبان ' ایک ہی طرح کا رہن سہن لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض کے اختلاف نے ان کو دو جدا قومیں بنا دیا - بعینہ یہی صورت کناڈا ' اسٹریلیا اور نیو زیلینڈ کی ہے - ایک ہی مذہب ' ایک ہی زبان ' ایک ہی نسل ' ایک ہی طرح کا رہن سہن ' ایک ہی حکومت اور سلطنت کے تابع - لیکن آثار ظاہر ہو رہے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اختلافات کی بنا پر وہ زمانہ دور نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تیرہ اینٹ کی مسجد الگ الگ بنائے گا - سوئٹزرلینڈ کی مثال لیجئے - ایک ملک میں تین قومیں بستی ہیں - قومیت اور نسل علحدہ علحدہ ' زبانیں جداگانہ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض کی یکسانیت نے ایک شیرازے میں باندہ رکھا ہے اور ایک قوم کہلاتے ہیں- یورپ کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں کو لیجئے - ایک ہی مذہب . اور ایک ہی لباس ' تقریباً ایک ہی طرح کا رہن سہن ایک زبان نہیں تاہم " ہندوستانی " کی طرح فرانسیسی کم سے کم تقریباً تمام یورپ میں سمجھی اور بولی تو ضرور جاتی ہے لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض نے جدا جدا قومیں بنا رکھی ہیں جو ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہتی ہیں - مجھے اس سے انکار نہیں کہ جذبہ قومیت کے استحکام میں زبان لباس خورد و نوش وغیرہ کی یکسانیت سے مدد ملتی ہے اور جہاں یہ باتیں میسر ہوں بہت اچھا ہے - میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ باتیں موجودہ

زمانہ میں " قومیت " کا لازمی جزو یا لابدی عنصر نہیں - قومیت کا شیرازہ بغیران باتوں کی یکسانیت کے بھی محض سیاسی و اقتصادی یکجہتی کی بنا پر نہایت مستحکم بندھ سکتا ہے - اگر پچھلی چند صدیوں میں ہندو اور مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ نہ رہا ہوتا ' اگر اسلامی اور ہندو تہذیب کے خلط ملت ہونے سے موجودہ ہندوستانی تہذیب نے ایک نئی شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو ممکن تھا کہ پراچین آریہ ورت کی طرح آج بھی ہماری ریتوں اور رسموں ' رہن سہن اور زبان میں کچھ یکسانیت کی کیفیت دیکھنے میں آتی لیکن مقدر کے ہاتھوں ہندوستان کی تاریخ کسی دوسرےھی عنوان سے لکھی گئی - ان تاریخ کے صفحوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا نہ آپکے بس کی بات ہے نہ میرے بس کی بات ہے اور اگر سچ پوچھئے تو مجھے اس کا افسوس بھی نہیں - میری عاجز رائے میں تو ہندو اور اسلامی تہذیب ' ادب اور فلسفہ کے خلط ملت ہونے سے موجودہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کا خزانہ مالا مال ہوگیا یہ صرف میری ہی انوکھی رائے نہیں بلکہ تاریخ چپہ چپہ پر اس کا ثبوت دیتی ہے- اگر جو کچھ گذر چکا اس کا افسوس نہیں تو آنے والے مقدر سے بھی خوف نہیں - میں مانتاہوں کہ آج ملک کی فضا بگڑی ہوئی ہے - ہر طرف تعصب اور نفاق کی آندھیاں چل رہی ہیں بھائی بھائی سے روٹھا ہوا ہے - ہمارے مدرسے اور یونیورسٹیاں الگ الگ کونسلوں اور بورڈوں میں جداگانہ نیابت سے ابتری اور پریشانی ' ہندی اور اُردو کے جھگڑے ' آرتی اور نماز کے قصے ' دنگے اور فساد کے ہنگامے حوصلہ مند سے حوصلہ مند محب وطن کی ہمتوں کو پست کر رہے ہیں - ظاہرا ہمارے اچھے دن نہیں لیکن میرا عقیدہ اور ایمان ہے کہ ہماری خود مختاری اور آزادی یا "ہندوستانی قومیت" کا بیج جو آج سے پچاس برس ہوئے بویا گیا تھا وہ ایک تناور

درخت کی شکل اختیار کرکے بار آور ہوگا - یہ مذہبی اور قومی جھگڑے ' موجودہ تعصب اور اختلافات رکاوٹیں ڈال رہے ہیں - منزل مقصود تک پہونچنے میں ان کی وجہ سے دیر ضرور لگیگی لیکن ہمارا مقدر پورا ہوکر رہیگا اگر آپ اپنی نظر کو روز مرہ کی مکروہات سے بلند اور وسیع کرکے دیکھیں تو آج بھی اچھے آثار نظر آتے ہیں - مسلمانوں میں بھی جو نسل آج تعلیم پا رہی ہے وہ اُس سے جو آج ترکی ' مصر اور ایران میں ہو رہا ہے بےخبر اور غیر متاثر نہیں - اسی ملک میں انقلاب انگیز تحریک کے پچھلے دو ہنگاموں میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسلمانوں نے ہندوؤں کے پہلو بہ پہلو جیل کی مصیبتیں جھیلیں - لاٹھیوں سنگینوں اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر کیا - جنہوں نے اس طرح سے (غلط یا صحیح اس سے بحث نہیں) " ہندوستانی قومیت " اور " آزادی " کی عمارت کی بنیادوں کو پختہ کیا ہے اُن کے لئے اب قدم پیچھے ہٹانا ممکن نہیں - کسانوں یا مزدوروں کے طبقوں کو لیجئے ' جو اصلی معنی میں جمہور کہے جا سکتے ہیں - آج آرتی اور نماز اور گاؤ کشی کے قصے اُنکو ایک دوسرے سے ظاہرا جدا کررہے ہیں لیکن جو قوتیں دنیا میں کام کر رہی ہیں اور جنکے اثر سے ہندوستان بھی زیادہ عرصہ تک بچ نہیں سکتا وہ کل انہیں مجبور کرینگی کہ پیٹ پالنے اور روٹی کے لئے یہ متحد ہوکر اُن لوگوں کا مقابلہ کریں جو دولت و ثروت کے مالک ہیں - ہندو اور مسلمان کا فرق آن واحد میں مٹ جائیگا - زمینداروں اور تعلقداروں کا طبقہ انکی آنکھوں کے سامنے آج بلا تفریق ہندو ' و مسلمان متحد ہو رہا ہے - کل کسان بھی اسی طرح ایکا کرینگے - یہ قوتیں ہیں اور یہ اثرات ہیں جو قومیت کا شیرازہ باندھینگے - مختصر یہ کہ " ہندوستانی قومیت " کے جذبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سیاسی اور اقتصادی اغراض کی

یکجہتی کا احساس کار آمد ہوگا نہ کہ ایک مذہب اور ایک زبان کی شرط -

یہ تو اصولی بحث ہوئی - اب عملی ضرورت کے پہلو سے غور کیجئے - اتنا بڑا ملک، مختلف نسلوں اور مذہبوں کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ' مختلف صوبوں میں بستے ہیں' اگر سارے ملک کی کوئی زبان نہو' تو تجارت اور کاروبار ' عدالتوں کا کام ' کاونسلوں ' کانفرنسوں اور جلسوں کی کار روائیاں اور تبادلۂ خیالات آخر کس طرح ہو - یا دوسرے ملکوں سے ربط و ضبط کس طرح بڑھے - کام کاج کس طرح چلے - اس کے لئے سارے ملک کی ایک زبان ہونا لازمی ہے - سو اسکا بھی فیصلہ سو برس ہوئے ہیں نہ غیروں کے قلم سے ہو گیا اور فیصلہ بھی ایسا کہ جو بمنزلۂ مقدر ہے کہ آپ مٹا نہیں سکتے - هندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان انگریزی قرار پا گئی اور ہم میں سے ہر ایک با دل خواستہ یا ناخواستہ اُسے سارے ملک کی زبان تسلیم کرتا ہے - ہماری تمام سیاسی اور سوشل زندگی کا دار و مدار اسپر ہے - یہ ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور جب تک هندوستان میں انگریزی زبان کے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں اور میرے خیال میں خود مختاری اور آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یہ قائم رہینگے اُسوقت تک انگریزی زبان ہی سارے ملک کی زبان رہیگی - اُردو یا ہندی اسکی جگہ نہیں لے سکتی - محض اسوجہ سے کہ جن ضرورتوں کو جس خوبی اور آسانی کے ساتھ انگریزی زبان پورا کرتی ہے اُسکی اہلیت نہ ہندی میں ہے نہ اردو میں اگر اُردو اور ہندی انگریزی کی جگہیں لے سکتیں تو کیا ممکن ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے ایک بنگالی ' گجراتی ' مرہٹی ' تامل یا تیلیگو کی جگہ لے سکے - ظاہرا تو سمجھ میں نہیں آتا - بنگالی زبان اور

لٹریچر کا مرتبہ تو آج اردو اور ہندی دونوں سے کہیں زیادہ بلند ہے - گجراتی بھی ان دونوں میں سے کسی سے کم نہیں - مرہٹی تامل اور تیلیگو بھی اس مرتبہ پر پہونچ گئی ہیں کہ انکو ہندی اور اردو سے کوئی خاص فرض نہیں پہونچیگا - اور جبکہ انکی تمام سیاسی ' سوشل اور کار و باری زندگی کی ضروریات ملکی ' انگریزی کے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہیں تو بنگال بمبئی اور مدراس کے لوگ اپنی اپنی زبانیں چھوڑ کر ہندی اور اردو کیوں سیکھنے لگے - آپ کو کون سی ضرورت ان زبانوں کے قبول کرنے پر مجبور کریگی ؟ مجھے معلوم ہے کہ مدراس میں آج اس بات کی کوشش بلیغ کی جا رہی ہے کہ ہندی کا پرچار ہو - اور کئی سال سے وہاں ہندی کو فروغ دئے جانے کا چرچا سننے میں آرہا ہے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے - اسی طرح بنگال اور حیدرآباد میں اردو کی تعلیم کی سعی بلیغ ہو رہی ہے - بنگالی مسلمانوں کی اردو دانی کی کیفیت تو ان احباب سے جنھیں ان سے سابقہ پڑا ہے پوشیدہ نہیں - حیدرآباد کے مسلمانوں کی اردو دانی کے بارے میں گذشتہ نومبر کے رسالۂ " الناظر " سے ذیل کا اقتباس بے محل نہوگا - مولوی ظفرالملک صاحب ایڈیٹر " الناظر " حال میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے - آپ ذاتی واقفیت کی بنا پر تحریر فرماتے ہیں - " حیدرآباد کے لئے یقیناً یہ امتیاز کچھ کم نہیں کہ اس نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں کل ملک کی رہنمائی کی لیکن اگر عثمانیہ یونیورسٹی اس بات کا بھی انتظام کرسکے کہ یونیورسٹی سے جو طلبہ سند پاکر نکلیں ' اس زبان میں جو ذریعہ تعلیم بنائی گئی ہے صحت و روانی کے ساتھ اپنے خیالات قلمبند کرسکیں تو عملی حیثیت سے ان طلبہ کے لئے نیز اہل

ملک کے واسطے زیادہ مفید ہوگا - انگریزی ہمارے نوجوانوں کے لئے بالکل غیر زبان ہے اور ظاہر ہے کہ بمقابلہ اُردو کے اُس کی تحصیل میں کس قدر دشواری ہوتی ہے لیکن برطانوی ہند کی یونیورسٹیوں سے سند فراغ لے کر جو اصحاب مختلف محکموں میں جاتے ہیں وہ اگر سیدھی سادی مگر صحیح انگریزی لکھنا نہ جانیں تو کیسے نکو بنائے جاتے ہیں - عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ بھی جب یونیورسٹی سے باہر نکلیں گے تو اسی معیار پر جانچے جائیں گے.. ...اُس وقت اگر اُن کی تحریریں معمولی سیدھی سادی مگر صحیح اُردو میں نہ ہوں گی تو لوگ کس درجہ اُن کی اور خود اُن کی یونیورسٹی کی ہنسی اُڑائیں گے " - مدراس میں ہندی کو فروغ دینے کا خیال اور کوشش یقیناً مذہبی اور قومی جوش کی تازگی کی اچھی مثال ہے - چشم بد دور ایک زمانہ میں " نیشنل ایجوکیشن " اور " نیشنل یونیورسٹی " کا بھی اسی طرح چرچا ہوا تھا لیکن بے ادبی معاف ہو تو عرض کروں کہ اب تو " گاندھی کیپ" بھی مشکل سے نظر آتی ہے - مختصر یہ کہ جو بحث یہاں پیش کی گئی ہے اگر ایک لخت رد کر دینے کے قابل نہیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سارے ملک کو نہ اردو کی ضرورت ہے نہ ہندی کی - نہ صرف یہی بلکہ اُردو اور ہندی کے لئے سارے ملک میں کوئی گنجائش نہیں - ان کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش خواہ‌مخواہ کی زبردستی ہے اورکچھ زمانہ بعد یہ کوشش تھک کے رہ جائے گی - اُردو اور ہندی کا مسئلہ صرف شمالی ہند تک محدود ہے اور محدود رہنا چاہئے - ان کی عملداری صوبۂ سرحدی سے لےکر صوبۂ بہار تک ہے - بہتر ہوتا کہ شمالی ہند میں بھی بجائے دو زبانوں کے ایک ہی زبان ہوتی - لیکن ایسا نہیں ہونا تھا نہیں ہوا -

پچھلے سَوبرس میں اُردو اور ہندی کا جس طرح علحدہ علحدہ نشو و نما

ہوا ہے اُس کو حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جاسکتا - ایک زبان قرار دینے کی کوشش نہ صرف دونوں زبانوں کو اپنی اپنی جگہ زیادہ مستحکم اور ایک دوسرے سے علحدہ کرتی جاتی ہے بلکہ قومی تعصب کے برافروختہ ہونے سے ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد میں بھی فرق پڑتا جاتا ہے چنانچہ ایک صریحی نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ پہلے جو ہندو بہ تعداد کثیر اُردو کی جانب مائل تھے وہ اب ہندی پڑھتے ہیں - اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ اگر شمالی ہند میں اُردو اور ہندی دونوں برابر سے فروغ پاتی رہیں تو ہرج کیا ہے اور محض ایک ہی زبان رائج کرنے کی غرض کیا ہے ؟ - اگر ایک زبان رائج کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں ربط و یگانگت بڑھے دونوں قومیں ایک دوسرے سے قریب آجائیں ' اُن میں معاشرتی میل جول پیدا ہو ' اُن کے ادب اور تہذیب میں فرق باقی نہ رہے تو موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے اور اُس ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے جو بد قسمتی سے اس وقت دونوں فریقوں میں نمایاں معلوم ہوتی ہے یہ غرض ایک زبان رائج کرنے کے اصرار سے بجائے پورے ہونے کے فوت ہوتی نظر آتی ہے - کم از کم پچھلے تیس چالیس سال کا تجربہ تو یہی ثابت کرتا ہے - اس بحث کے سلسلے میں جو مضامین اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں اُن میں ایک ہی معقول تجویز اس مسئلہ کے حل کے متعلق پیش ہوتی ہے کہ جس سے وہ غرض جو ظاہرا ایک زبان رائج کرنے کی بتائی جاتی ہے بخوبی پوری ہوتی ہے لیکن اس تجویز پر افسوس ہے کہ اتنی توجہ نہیں کی گئی کہ جسکی وہ مستحق تھی - تجویز یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں شروع ہی سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پڑھائی لازمی کی جائے - میں اس تجویز کی پوری تائد کرتا ہوں - اگر کوئی طریقہ ممکن‌العمل ایسا ہے کہ جس سے ہندو اور مسلمان

ایک دوسرے کی زبان - لٹریچر - روایات - حسیات و جذبات سے واقف ہو سکیں اور انمیں ایک دوسرے کے طرز معاشرت سے یگانگت پیدا ہو - ایک دوسرے کی روایات و جذبات کا احترام اور رواداری مدنظر رہے تو وہ یہی طریقہ ہے - اسی کو ہندو و مسلم اتحاد کی بنیاد سمجھنا چاہئے - اس طرح ذہنیت کے بدلنے سے دونوں قوموں میں سیاسی و اقتصادی اغراض کی یکسانیت کا حسن باسانی پیدا ہو سکیگا - یہی ایک تجویز ایسی ہے کہ جسپر عمل کرنے میں ہندو اور مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہونا چاہئے - ایسے نصاب تعلیم کی ترمیم کی دقتیں تو یہ ایسی نہیں کہ جو حل ہوسکیں - کم از کم یہ اُن دشواریوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کہ جو اسوقت ایک زبان رائج کرنے کی کوشش میں پیش آرہی ہیں اور جنکا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا - میں تو ایک زبان رائج کرنے کی ضرورت یا اسکے ممکن العمل ہونے کا قائل نہیں تاہم اگر ہمارے سامنے اس معیار کا رکھنا مناسب ہے ' اگر یہ کسی طرح ممکن العمل ہوسکتا ہے ' اگر تاریخ کا ورق پلٹا جاسکتا ہے اور کبھی کسی زمانہ میں جسکا اندازہ ابھی ہم نہیں کرسکتے شمالی ہند میں بجائے اردو اور ہندی کے ایک زبان رائج ہو سکتی ہے تو اس کی داغ بیل اسطرح ڈالی جاسکتی ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ہمارے مدرسوں میں لازمی قرار دی جائیں -

ہندی اور اردو کی بحث سے قطع نظر کرکے اب ہندوستانی زبان کے مسئلہ کو لیجئے - کہا جاتا ہے کہ اگر اردو میں سے فارسی اور عربی لفظ نکالدئے جائیں اور ہندی میں سے سنسکرت لفظ تو ہندوستانی زبان بنکر رائج ہو جائیگی - اس کے ثبوت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اب ہندوستان کے بڑے حصے میں ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے

اور تقریباً تمام ہندوستان میں ہندوستانی سمجھی جاتی ہے - یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے لیکن صرف ایک حد تک یعنی ٹوٹی پھوٹی اردو اور بگڑی ہوئی ہندی ' پنجاب میں پنجابی لب و لہجہ میں اور بہار میں بہاری تلفظ کے ساتھ بولی جاتی ہے - ہمارے صوبہ میں پوربی ضلعوں میں ایک قسم کی ہندی اور پچھمی ضلعوں میں ایک قسم کی اردو بولی جاتی ہے - اسی طرح دیہات میں جو زبان بولی جاتی ہے جو ہندی سے ملتی جلتی ہے اور شہروں میں جس زبان کا استعمال ہے وہ اردو سے ملتی جلتی ہوتی ہے ' تاہم جہانتک بولی کا تعلق ہے آپ اس کو ہندوستانی بولی کہہ سکتے ہیں - اسیطرح صاحب لوگ اور خانساماؤں اور بہراؤں کی بولی بھی ہندوستانی ہوتی ہے ' اس ٹوٹی پھوٹی زبان کو بھی جو بمبئی یا کلکتہ وغیرہ کے اطراف میں مسافر اپنا مطلب نکالنے کے لئے بازاروں میں بولتے ہیں وہ بھی ہندوستانی کہلاتی ہے - اور اس معنی میں یہ کہنا کہ ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ٹھیک ہے - لیکن بولی ایک چیز ہے اور ادبی اور مجلسی زبان بالکل دوسری چیز - جسوقت آپ یہ کوشش کرینگے کہ یہ ہندوستانی زبان ادبی اور مجلسی زبان قرار دی جائے لابدی طور پر وہ یا تو ہندی کی شکل اختیار کرلیگی یا اردو کی - کیونکہ اس ہندوستانی بولی کی جس کو تمام ملک کی زبان قرار دینے کا خیال ہے حیثیت اور مرتبہ ہی زبان کا نہیں اور نہ اسمیں زبان بننے کی اہلیت ہے - پچھلے پچاس برس میں اردو اور ہندی نے جس فضا میں نشوو نما پائی - جس تہذیب معاشرت اور تمدن کی وکالت کے لئے انہوں نے زبان کھولی اس نے انہیں مجبور کیا کہ نئے نئے خیالات اور نازک ترین حسیات و جذبات کے اظہار کے لئے نئے نئے علوم و فنون کی ترجمانی کی غرض سے اردو

فارسی اور عربي سے اور هندي سنسکرت کی مدد سے نئي نئي اصطلاحات ' نئي نئي ترکیبیں اور محاورے گڑھے اور انہیں رائج کرے - انگریزي سے بھی مدد ملی - اس طرح سے دونوں زبانوں میں ارتقا ہوا - اور انکا خزانہ ایک حد تک مالا مال ہوا - اب آپکی کوشش یہ ہے کہ فارسی اور سنسکرت کی یہ اصطلاحیں ' ترکیبیں اور محاورے جو دونوں زبانوں میں رائج ہوگئے ہیں انکو خارج کیا جائے - تو کام کس طرح چلیگا - آپ زبان کو بجائے مالا مال کرنے کے اور کنگال بنائینگے - اس سے زبان کی ترقي ہوگی یا تنزلی؟ کہا جاتا ہے کہ بجائے فارسی اور سنسکرت کے هندوستاني زبان میں انگریزي اصطلاحات اور محاوروں سے کام لیا جائے - غور کرنے کا مقام ہے کہ اردو کا فارسي اور عربي سے اور هندي کا سنسکرت سے تو کچھ واسطہ اور رشتہ بھي ہے ' لیکن هندوستاني زبان سے انگریزي کا کیا رشتہ ہے اور اس طرح جو زبان بنیگی اس کي صحت ' لطافت اور پاکیزگی کا کیا حشر ہو گا - دنیا کي مستند زبانوں کی مجلس میں اس کی کونسی اور کہاں جگہہ ہو گی - جو احباب " هندوستانی " کی حمایت میں مضامین لکھتے ہیں وہ بھی هندي یا اردو سے تجاوز کرکے ابھی تک " هندوستانی " زبان کا کوئی نمونہ پیش نہیں کرسکتے - زیادہ سے زیادہ کوشش یہ ہوئی ہے کہ " ضرورت ایجاد کی ماں ہے " سو اس میں بھی ' ایجاد ' فارسي ہے - مري چھتی اوو " کھري کمیٹی " بھی بعض اخبار والے لکھنے لگے ہیں- مگر یہ تو صاحب زبان کا بنانا نہیں بلکہ خون کرنا ہے- منشي پریم چند صاحب نے رسالۂ زمانہ میں ابھ ایک مضموں میں لکھا ہے کہ جب انگریزي کے محاورے اور اصطلاحات رائج ہو جائینگے اور ہمارے کان ان سے مانوس ہو جائنگے تو وہ انوکھے نہ معلوم ہونگے جس طرح کہ اب پائنجامہ اور اچکن کے ساتھ ہیٹ ' برا نہیں معلوم ہوتا - میں نے بھي بعض

جدت پسند نوجوانوں کو فرارہ دار پائجامہ ' ململ کا کرتہ اوپر سے انگریزی کوٹ اور ھیٹ پہنتے دیکھا ھے لیکن مجھے وہ اتنا پسندیدہ نہیں معلوم ھوتا - خیر - یہ تو اپنے اپنے حس اور شعور کی بات ھے مگر آج تک کم از کم میں نے کسی کو سلجھیدہ گفتگو میں یہ تجویز پیش کرتے نہیں سنا کہ فرارہ دار پائجامہ ' کرتا ' اچکن یا کوٹ اور اس کے ساتھ '' ھیٹ " ھمارا قومی لباس قرار دیا جائے بلکہ ایسی مجلسوں اور مجمعوں میں جہاں آداب مجلس کا لحاظ کیا جاتا ھے ایسی حرکتوں پر اُنگلیاں اٹھتے ھی دیکھی ھیں - رھے تراشے ھوئے بال سو شاید منشی پریم چند صاحب کو معلوم نہیں کہ ولایت میں اب فیشن بدل گیا - اب تو لانبے گیسو اور نیچا سایہ ھی مقبول ھو رھا ھے - اب تک اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا اُس سے غرض یہ تھی کہ اردو یا ھندی کی جگہ '' ھندوستانی " زبان رائج کرنے کا خیال زبان کی ترقی اور نشو ونما کے لحاظ سے مناسب نہیں - دوسرا سوال یہ ھے کہ ایسا کرنا یا ایسا ھونا ممکن العمل بھی ھے ؟ کیا ھندؤں کی کثیر تعداد ھندی کو چھوڑ نے اور مسلمانوں کی کثیر جماعت اُردو کو الوداع کہنے کے لئے تیار ھے ؟ پچھلے چالیس سال میں ایک زبان رائج کرنے کی تحریک نے کس قدر کامیابی حاصل کی ھے ؟ کیا اس تحریک کا یہ اثر نہیں ھوا کہ ھر ایک فریق اپنی ھی زبان رائج کرنے اور اس کو ترقی اور اشاعت دینے پر زیادہ تُل گیا تو اب کس طرح اُمید کی جاتی ھے کہ ' ھندوستانی ' کے رائج کرنے کا خیال ' نقار خانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ اھمیت رکھے گا - بالفرض مان بھی لیا جائے کہ '' ھندوستانی " رائج کرنے پر ایک کثیر جماعت راضی ھو جائیگی تو اس کے لئے رسم خط کون سا تجویز کیا جاتا ھے - فارسی یا ناگری - کیا اُردو والے فارسی رسم خط کو چھوڑ کر ناگری کے اختیار کرنے پر آمادہ ھو جائیں گے یا ھندی والے فارسی پر - اگر نہیں تو کیا روسن یا

لیکن رسم خط کیا جائے گا - کیا یہ ممکن ہے یا ممکن ہے - مجھے معلوم ہے کہ حال میں ترکی میں مصطفے کمال نے حکومت اور قانون کے زور سے پوشاک میں ہیٹ ' اور رسم خط لیٹن لازمی قرار دے کر رائج کر دیا ہے - اول تو معلوم نہیں کہ اس انقلاب کا آگے چل کر کیا حشر ہوگا اسکے علاوہ اس محکوم قوم میں تو کسی مصطفیٰ کمال کا نمودار ہونا بھی گمان غالب نہیں - جہاں تک میری عاجز رائے کام کرتی ہے میرے خیال میں تو اس ملک میں نہ ایک زبان کی ضرورت ہے ' نہ ہندی اور اردو کی جگہ ' ہندوستانی ' کا رائج کرنا مناسب ہے - نہ ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی سارے ملک کی زبان قرار پانا موجودہ فضا میں ممکن العمل ہے -

میں نے اس مضمون کے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں ایک محض سیاسی اور دوسرا ادبی - سیاسی پہلو کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کرچکا - اب مختصراً کچھ ادبی پہلو کے متعلق عرض کروں گا - نئے دور کے تعلیم یافتہ طبقے میں کچھ عرصہ سے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں میں ثقیل اور غیر مانوس عربی اور فارسی اور سنسکرت لفظوں کی بھرمار کرکے انہیں خوامخواہ دقیق بنایا جا رہا ہے گو ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں زبانوں کو عام فہم اور سلیس بنایا جائے - اس لحاظ سے دونو زبانیں فوری اصلاح کی محتاج ہیں - یہ خیال ایسا ہے کہ شاید ہی کسی کو اس سے اختلاف ہو - زبان کو مقبول عام بنانے کی غرض سے یہ تحریک نہایت مبارک ہے اور مجھے اس سے قطعی اتفاق ہے مگر یہ تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ جب اس کو ملک کی ایک زبان رائج کرنے کی تحریک یا ایک رسم خط جاری کرنے کے پروپیگنڈا سے قطعی

علحدہ رکھا جائے اور اس پر سیاسی اغراض اور قومی تعصب کا کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہوسکے - ورنہ اگر اسے اس قومی اور سیاسی جھگڑے میں خلط ملت کردیا گیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اردو ، ہندی یا ہندوستانی کے فقروں کا ہو رہا ہے - اس تحریک کو دو جانب سے مشکلوں کا سامنا ہوگا - ایک تو مولوی اور شاستری صاحبان کی طرف سے جو اردو اور ہندی میں عربی اور سنسکرت لفظوں کو خواہ مخواہ ٹھونس کر انہیں دقیق بناتے ہیں - یہ لوگ بھی اپنی ذہنیت اور وضع سے مجبور ہیں - عمر بھر کی عادتیں چھوڑائی نہیں جاسکتیں دوسرا خطرہ جسکا تذکرہ کم ہوتا ہے انگریزی تعلیم یافتہ نو جوانوں کی طرف سے ہے کہ جن کی زبان پر انگریزی لفظ ، محاورے اور اصطلاحات چڑھ گئے ہیں اور وہ انکا استعمال نہ صرف روزمرہ کی بول چال بلکہ سنجیدہ تقریر و تحریر میں بھی بری طرح کرتے ہیں ایک ہی جملہ میں آدھے لفظ اردو یا ہندی کے اور آدھے انگریزی کے ان کا انداز گفتگو ہو گیا ہے - اگر ہم کو اپنی زبان کو سلیس اور عام فہم بنانا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ادبی اور مجلسی لحاظ سے بھی ہماری زبان کا مرتبہ دنیا کی اور زبانوں سے کمتر نہ رہے تو ان دونوں خطروں سے ہم کو بچنا چاہئیے - انکی تفصیل ذیل میں مختصراً کی جاتی ہے بیسوں لفظ انگریزی کے اب ایسے مستعمل ہو گئے ہیں اور دونوں زبانوں میں کھپ گئے ہیں کہ ہر کس و ناکس انکو سمجھتا ہے مگر ہمارے یہاں کے ادیب انکے لئے خواہ مخواہ عربی اور سنسکرت لفظ ڈھونڈھکر نکالتے ہیں اور انکے رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں - اڈیٹر کے لئے مدیر ، نوٹس کے لئے شذرات یا ملاحظات ، تھرمامیٹر کے لئے مقیاس الحرارت وائرلس کے لئے لاسلکی، تار برقی ایسی اینچ پیچ باتیں ہیں کہ جلسے زبان کو بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے - اسی طرح

سیدھے سادے اردو اور ھندی لفظوں کو جو مدتوں سے رائج ھیں اور جو زبان میں کھپے ھوئے ھیں اب رد کرکے انکی جگہ فارسی ' عربی یا سنسکرت کے نئے نئے لفظ گھڑے جارھے ھیں مثلاً " ارتحال " فوت ھونے کے معنی ھیں - طالب علموں کی جگہ طیلسانیں - ھوائی جہاز کی بجائے طیارہ وغیرہ - ایسی اختراعوں سے زبان کو گر انبار کرنا کیا نفع پہونچا سکتا ھے - یہ صرف اردو کے ادیبوں کا ھی قصور نہیں - ھندی والے بھی یہی کرتے ھیں - جلدی کی جگہہ شگرھ - پانی کی جگہہ جل - آدمی کی بجائے منش - عرضی کی جگہہ پرارتھنا وغیرہ مروج کئے جارھے ھیں - جہاں کسی نئے خیال یا اصطلاح کے لئے معمولی لفظ نہ ملے وھاں تو نیا اور ثقیل لفظ بھی مجبوراً استعمال کرنا ھی پڑیگا مگر یہ زبر دستیاں جنکا اوپر ذکر کیا گیا ایسی ھیں کہ جنکے لئے کوئی عذر نہیں - اردو کے معمولی جمع بنانے کے طریقے کو ترک کرکے عربی یا فارسی ترکیب سے کام لینا بھی کم قابل اعتراض نہیں - اسی طرح ھمارے پرانے املا کا طریقہ بھی اصلاح طلب ھے - یہ اصلاح مشکل سے جاری ھوگی لیکن میری رائے عاجز میں ھمارا پرانا طریقہ اصلاح طلب ھے - مثال کے طور پر دو تین لفظوں کا حوالہ دیا جاتا ھے - " مسالا " نہایت روز مرہ کا لفظ ھے اس کو ' مصالح ' لکھنا کم از کم آجکل کے زمانے میں تو خواہ مخواہ کی زبر دستی ھے - معمولی آدمی کے لئے تو لفظ کا سمجھنا ھی مشکل ھوجائیگا - اسی طرح " زمانہ " کی جگہ " زمانا " اور ' بالکل ' کی بجائے ' بلکل ' کیوں نہ رائج کیا جائے - اگر چند ذی مرتبہ احباب جو زبان کی اصلاح کے جایز طور پر حامی سمجھے جائیں یکجا ھو کر اس کے لئے قواعد ترتیب دیدیں تو املا کی اصلاح کا راستہ بھی کھل سکتا اور صاف ھوسکتا ھے

[illegible] یاد آتی ھے جسکا تذکرہ [illegible]

دیکھنا بھی بھیجا نہوگا - ہندوستانی اکیڈیمی کے تماہی رسالہ کے جاری ہونے پر اس کے لفظ تماہی کے استعمال پر اردو کے ادیبوں کے حلقوں میں اس کی بڑی لے دے ہوئی لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کیوں دربار اکبری میں مولانا محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے تماوہ کا لفظ ایک جگہہ نہیں غالباً دس جگہہ استعمال کیا ہو گا - کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ لفظ یا ترکیب غلط ہے - تو پھر آخر تماہی' میں کیا قیامت برپا ہوتی ہے- اسکے علاوہ چھہ ماہی کا لفظ اردو میں بلاتکلف جاری ہے میرے خیال میں ایسی بحثوں سے علاوہ وقت ضائع ہونے کے اردو کا نام بد نام ہوتا ہے - اسی کے ساتھ یہ بھی کم قابل اعتراض نہیں کہ اردو یا ہندی میں لفظوں کے ہوتے ہوئے انکی جگہہ خواہ‌مخواہ ان لفظوں کے لئے انگریزی لفظ تھونسے جائیں یا انگریزی کے محاوروں اور اصطلاحوں کا ایک لفظی ترجمہ کیا جائے جو زبان میں کسی طرح نہ کھپ سکے محترمی پنڈت منوہرلال زتشی صاحب کے اس مضمون کا آخری حصہ جو انہوں نے حال میں ہی رسالہ 'زمانہ' کانپور میں شائع کیا ہے یہاں پر نقل کرنا بے محل نہو گا - پنڈت صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ——"مجھکو اس رائے سے اتفاق ہے کہ یورپ کی نئی نئی ایجادوں کے ساتھ جو فرنگی الفاظ ہماری زبان میں آرہے ہیں اُن سے بھاگنا خلاف مصلحت ہے - اور ان کی جگہ ان سے زیادہ ثقیل اور غیر مانوس عربی یا سنسکرت الفاظ تھونسنا زبان کے حق میں اچھا نہیں - تھرما میٹر کو مقیاس‌الحرارت سے زیادہ لوگ سمجھتے ہیں اور زیادہ سہولت سے اس کو ادا کرسکتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں عربی کا بڑا زور ہے اور وہاں کی کتابوں میں اردو کو معّرب کیا جا رہا ہے - اگر یہ صحیح ہے تو یہ کوشش قابل تحسین نہیں - اس سے بھولنا

چاهئے هاں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروري هے وہ یہ کہ انسان کی طرح زبان کا بھی مزاج ہوتا ہے - ذوق سلیم اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے خلاف عمل نہیں کرتا - Standing Congress Committee کا ترجمہ کھڑی کانگرس کمیٹی یا Dead letter office کو مری چٹھی کا دفتر کہنا زبان کی گردن کو کند چھري سے ریتنا ہے - بعض الفاظ ایسے ہیں جو بجنسہ غیر زبان سے لے لئے جاتے ہیں جیسے کوٹ - بعض ایسے ہیں جن میں جزوی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جیسے پتلون - جو لوگ زبان دانی کا دعویٰ کرتے ہیں اور زبان کی ترقی اور اصلاح کے واسطے کوشاں ہیں انکو اسبات کا پورا لحاظ رکھنا چاهئے - زبان کو وسعت ضرور دیجائے اختراع کا دروازہ ضرور کھلا رہے - نئی لفظیں ضرور قبول کی جائیں مگر جو کچھ ہو ذوق سلیم کے ماتحت ہو - کج فہمی ' ضد اور فرقہ بندی کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہئے " -

اس کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ چاہئے تو یہ تھا کہ زبان کے مسئلہ پر محض ادبی حیثیت سے نگاہ ڈالی جاتی اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اصلاحیں پیش کر کے زبان کو ترقی دینے کی کوشش کی جاتی لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اس مسئلہ کو سیاسی جھگڑوں میں ڈالکر فرقہ دارانہ جوش اُبھارا جاتا ہے جس سے اُردو اور ہندی کی اشاعت تو ضرور ہو رہی ہے لیکن ادبی زبان کی اصلاح اور ترقی میں شبہ ہے - جہانتک " متحدہ قومیت " کا سوال ہے یہ تو صحیح ہے کہ جن ملکوں میں مذہب ' زبان ' لباس اور خورد و نوش کی یکرنگی میسر ہوتی ہے وہاں " متحدہ قومیت " کے ارمانوں کو پورا کرنے میں اس سے مدد ملتی ہے لیکن یہ خیال غلط ہے کہ یہ عناصر " متحدہ قومیت " کے خیال کی تکمیل کے لیے لازمی اور

ضروري هيں - موجودہ تهذيب و تمدن کے زمانے ميں سياسی و اقتصادي اغراض و ضروريات هی در اصل قوموں کی شيرازہ بندی کرتی هيں - تمام دنيا ميں يہی هوا هے اور هو رها هے - يہی هندوستان ميں بهی هوکر رهيگا - اس کے لئے اُردو يا هندی کو سارے ملک کی زبان قرار دينے کا خيال نہ ضروری هے نہ فائدہ مند - اس سے تو ملک کی موجودہ بگڑی هوئی فضا ميں اور بهی زيادہ الجهن پيدا هوتی هے - هندو اور مسلمانوں ميں ربط اور اتحاد پيدا کرنے کی اس سلسلہ ميں اگر کوئی صورت هو سکتی هے تو وہ يہ هے کہ همارے مدرسوں ميں شروع هی سے اردو اور هندي کی پڑهائی لازمی قرار ديجائے اور جهاں تک ادبي زبان کي اصلاح و ترقي کا تعلق هے اردو اور هندی دونوں کو بجائے دقيق بنانے کے سليس اور عام فهم بنانے کي کوشش کي جائے - ميرے خيال ميں يہ اهم کام همارے صوبہ کي "هندوستانی اکيڈيمی بہ خوش اسلوبی ادا کر سکتی هے - يہی ايک انجمن ايسي هے جو ادبي حيثيت سے اس کي اهل هے اور اس ميں قومي تعصب اور فرقہ دارانہ جوش کا شبہ بهي نهيں هوسکتا - ميں اُميد کرتا هوں کہ اس اکيڈيمی کے ذمہ دار احباب اس جانب توجہ مبذول فرمائينگے - ميں نے جو کچهہ اس بحث کے سلسلہ ميں عرض کيا هے مجهے معلوم هے کہ اکثر احباب کو وہ خوش گوار نہ معلوم هوا هوگا - ميں اُس کی معذرت چاهتا هوں اور اميد کرتا هوں کہ يہ سمجهکر کہ جو کچهہ کہا گيا محض نيک نيتی سے کہا گيا هے وہ مجهے معاف کرينگے -

---

سلاطین دکن کی هندوستانی شاعری

(از مولوی نصیرالدین هاشمی)

سلطنتوں اور حکمرانوں کے قیام و زوال کے سیکڑوں درد ناک مناظر هندوستان کی سر زمین نے دیکھے هیں ' اس کے متعلق اس وقت کوئی بحث پیش نظر نہیں ہے ' لیکن اس شکست و ریخت سے جہاں مصیبت و فلاکت کا آسمان غریب اور ناکردہ گناہ رعایا پر ٹوٹ پڑتا ہے وهاں کسی نہ کسی خیر و برکت کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے -

یہی حال دکن میں بہمنی سلطنت کے قیام کا ہے' محمد تغلق کی شہنشاهیت پسندی اور اس کی ناروا سخت کوشی کا رد عمل امیران صدہ کی بغاوت پر ہوا ' اس بغاوت میں بیسوں فرزندان وطن خاک و خون میں آلودہ ہوگئے ' اور سارے هندوستان میں ایک هی حکومت کی نوبت بجنے میں جو سطوت اور طنطنہ تھا اس میں زوال آگیا ' لیکن بغاوت و جنگ آزمائی کے بادل چھٹ جانے کے بعد ضبط و نظم اور آئین و ضابطہ کا نیا آسمان اور نئی زمین پیدا ہوئی -

تقریباً دو صدی تک دکن کی طویل اور عریض پہنائی میں بہمنی سلطنت کی قوت و سطوت سے امن و امان اور خوش حالی و فارغ‌البالی کا دور دورہ رہا - یوں کسی امیر کی خیرہ سری یا کسی راجہ و مہاراجہ کی غیر اطاعت پسندی کی وجہ سے فوج و لشکر کو حرکت میں لانا ضروری ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ سے ملک کا عام امن و امان کسی طرح

تہ و بالا نہیں ہوجاتا ' اس ضبط و انتظام کی کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ کچھہ کم دو صدیوں کے بعد بہمنی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور صوبہ داروں نے خود مختاری کی نوبت بجا دی لیکن مزید دو صدیوں تک دکن میں نہ تو پنڈارے پیدا ہوے اور نہ ٹھگی اور ڈکیتی کا نام سننے میں آیا -

بہمنی سلطنت کے نظم و نسق کی اس شاندار کامیابی کی کوئی تاریخ مجھے بیان کرنی نہیں ہے ' میں صرف یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اس امن و امان کی بنیاد پر جس تمدن کی بنیاد قائم ہوئی وہ دنیا کے کسی اور تمدن کے سامنے کسی طرح شرمندہ نہیں ہے ' تہذیب و شائستگی اور علم و ہنر کے کیسے جگمگاتے روایات دکن کی سر زمین پر قائم ہوے اس کی مفصل تاریخ افسوس ہے کہ اب تک لکھی نہیں گئی -

تمدن کا ایک اہم جزو زبان کی ترقی بھی ہے ' زبان کی ترقی تمدن کے ارتقاء اور اس کے نشو و نما کا پیمانہ ہے : زبان کی ترقی کے اتار چڑھاؤ سے ہی تمدن کے عروج و زوال کا اندازہ ہوتا ہے -

سلطنت بہمنی نے دکن کے لیے ایک مشترکہ زبان کی حیثیت میں " دکھنی " کو فروغ دینا پسند کیا یا نہیں اس کے متعلق اس وقت کوئی بحث منظور نہیں ہے ' لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں ان حکمرانوں کے ساتھہ شمال سے آئی ہوئی زبان نے دکن میں نئے برگ و بار پیدا کر لیے ' اس کے بعد اس نے ارتقاء اور ترقی کے جو زینے طے کیے وہ اس زمانہ کے پر شان و شکوہ تمدن کے گواہ ہیں -

دکھنی زبان کی مفصل تاریخ پر ابھی تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے لیکن جیسے جیسے اس پر روشنی پڑتی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ راعی اور رعیت دونوں نے اس کی پرداخت کی ہے -

آج کی اس محترم مجلس میں اس مقالہ کے پڑھنے کی غرض یہ ہے کہ اس امر کو نمایاں کیا جائے کہ دکھنی حکمرانوں نے دکھنی یا اُردو یا ہندوستانی زبان میں نظم کو اظہار خیالات کا آلہ بنانے میں اپنے کیا روایات قائم کیے ہیں -

دکھنی زبان میں نظم کی ابتداء کا زمانہ ابھی متعین نہیں کیا جا سکا ہے ' خیال یہ ہے کہ سنہ ۸۲۵ ہجری کے قبل ہی نظم نگاری نے اپنا جلم لے لیا تھا' مگر بہ تحقیق یہ امر قرار دیا جاسکتا ہے کہ نظامی نے سلطان احمد شاہ بہمنی کے زمانہ سنہ ۸۶۳ ہجری میں اپنی مثنوی مرتب کر لی تھی -

اگرچہ نظامی کے بعد ایک صدی تک کسی دوسرے ہندوستانی گو شاعر کا نام دستیاب نہیں ہوا ہے ' مگر اس کے ایک صدی بعد کا جو کلام دستیاب ہوا ہے وہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اس سے پہلے ترقی کے اور بھی مراتب طے ہو چکے تھے -

بہمنی سلطنت کے کسی حکمران کا کوئی ہندوستانی دیوان یا کلیات ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے ' سب سے پہلے بہ لحاظ تقدم زمان جو حکمران "ہندوستانی" نظم نگار کی حیثیت سے روشناس ہوتا ہے وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے -

بیجا پور کے عادل شاہی خاندان کے بانی یوسف عادل شاہ نے فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر اور ایک ماہر موسیقی کی حیثیت سے بھی اپنا نام یادگار چھوڑا ہے ' اس کے بیٹے اسمعیل کو بھی فارسی شعر گوئی میں امتیاز حاصل تھا ' وفائی اس کا تخلص ہے ' علی عادل شاہ اول کا نام علم و ہنر کی سرپرستی کے لحاظ سے یادگار رہ گیا ہے اس کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ ہر وقت سفر میں بھی چار سو صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے ساتھ رہا کرتے تھے ۔

علی کا جا نشین ابراهیم ثانی هے ' اس کا دور حکومت تو ترقی علم و فن کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر هے ' اس نے علم و هنر کی جس طرح سرپرستی کی اس کی وجه سے بیجا پور علم و فضل کا مرکز بن گیا ۔

اسلامی خلافت کی همه گیری سے اندلس و مصر کی الگ وحدت قائم هونے سے تمدن میں جو نئی بہار آئی ' بعینه اسی طرح دکن میں سلطنت بہمنی کا شیرازہ برهم هوجانے کے بعد بیجا پور ' احمد نگر ' گولکنڈہ نے دکھنی تمدن و شایستگی کو چار چاند لگا دئیے ' لیکن یه امر بلا شبه صحیح هے که سلطنت بہمنی کی جیسی عظمت و بختیاری اب خواب و خیال هوگئی - دکن کی ان نئی سلطنتوں کے بانیوں کے اوصاف و خصائل کا موازنه علاءالدین بہمنی سے کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا ' عیش پسند سوسائٹی میں اب فاتحانه عظمت و جلال' نیک و پاکیزہ جذبات اور سادہ زندگی کا کال هوگیا ' خیر تو یه ایک علحدہ بحث هے لیکن ان سلطنتوں نے بہمنی سلطنت کی علمی روایات کو خوب نبھایا ۔

ابوالقاسم فرشته ' رفیع الدین شیرازي ' خواجه علاءالدین محمد شیرازي ' ملا عبدالرشید ' خواجه سعدالله ' جیسے ارباب علم و فضل نے تاریخ و ادب ' حکمت و فلسفه ' ریاضی و مہندسی کا جو چراغ اس کے زمانه میں جلایا اس کی روشنی اب تک زائل نہیں هوئی هے ' نورالدین ظهوري ' ملا ملک قمی ' حکیم آتشی ' مرزا محمد مقیم ' ملا شکیبی ' عبدالقادر نورسی جیسے شعراء نے شعر و سخن کا بازار جس طرح گرم کر رکھا تھا اس کی گرمی اب تک سرد نہیں هوئی هے ۔

ابراهیم کی قدر دانی نے بیجا پور کو ارباب کمال کا قبله آمال بنا دیا تھا ' خود بادشاہ نے شعر گوئی ' موسیقی اور خطاطی میں خاصه کمال

حاصل کر لیا تھا ' اس کے خصائل محمود نے اس کو " جگت گرو " بنا دیا تھا -

لفظ " نورس " سے ابراھیم کو عجب انس تھا ' قلعہ بنایا تو نورس نام رکھا ' شہرآباد کیا تو نورس پور سے اس کو موسوم کیا ' شاھی مہر پر نورس کا لفظ کندہ کرایا ' درباری شاعر عبدالقادر کے لیے تخلص تجویز ھوا تو نورسی ' ھر سال جشن منایا جاتا تو نورس کے نام سے اور اپنی تصنیف کا نام رکھا بھی تو نورس -

اس امر کا پتہ چلتا ھے کہ ابراھیم کو فارسی کے علاوہ دکھنی اور ھندی میں بھی طبع آزمائی کی مشق تھی ' مگر افسوس ھے کہ اب تک دکھنی کلام دستیاب نہ ھوسکا ' البتہ ھندی کلام کا مجموعہ " نورس " اب گوشہ گم نامی میں نہ رھا ' چند نسخے حیدرآباد میں موجود ھیں ' سب نسخوں میں سرآمد ' کتب خانہ دفتر دیوانی و مال (سرکار نظام) کا نسخہ ھے جو نہ صرف سلطان کے استاد عبداللطیف کی خطاطی کا ایک دل آویز شہ کار اور مشرقی ذوق حسن کاری کا ایک بہترین نمونہ ھے بلکہ اس پر خود ابراھیم کے شاھی دستخط اور شاھی کتب خانہ کا داخلہ بھی موجود ھے ' دوسرا نسخہ حیدرآباد کے عجائب خانہ میں ھے -

نورس مجموعہ ہے ایسی نظموں کا جو بعض راگوں کے تحت لکھی گئی ھیں -

مقام بھیرو

دنیــا گھیرا بـــھرے چلـــدنا دود

اوپـــر نرمل مسکا سو چـــاند سود

لال موســون نکـــر کہـــسی ھـــت

[illegible]

اس فراقوں هوا تکرے تکرود ۹

سمن کیتی سب لے چوں چوں ۱۰

تھرا دماں امرت اب مونا مشکل

نا چھوڑیا جاوے دھیاں جو جھو دیسکوں

کون پلدت بود و بدیکی داکھوں

ابراهیم ملیں یوسب مشکل اکھوں

در مقام نوروز نورس

سید محمد پتی پیرا   جیوں رتن میں اتم هیرا

محل محل صدر سلواری   اس نمونے بہشت اپاری

انند هونا هے سدا بہاری   ارتی لیائے انبر بهر ساری

کدم کستوری جو اچلدر لای   بادل کاں سی هر رنگ دس پرساری

شمامی عنبر بتیاں پهرائی   شربت گهول امرت پلائی

بادل دمامے بجلیاں بجاوے   باجی خالو آشنابی آنے پاوے

سہلا نورس کلیاں بدھاوے

ابراهیم گرکلی گاوے

علی عادل شاہ ثانی بیجا پور کا آٹھواں حکمراں ہے سنہ ۱۰۶۷ ھجری میں اورنگ حکومت پر جلوہ گر ہوا اور سنہ ۱۰۸۳ ھجری میں سولہ سال کی حکمرانی کے بعد بعمر ۳۵ سال عین عالم جوانی میں انتقال کیا -

خوش قسمتی سے سلطان کو اس کے زمانہ شاهزادگی میں نگرانی اور تربیت کے لئے خدیجہ سلطانہ شہربانو جیسی خاتون دست یاب ہوئی -

سلطانہ شہر بانو گولکنڈہ کے محمد قطب شاہ کی دختر نیک اختر تھی ' جس زمانے میں سلطانہ شہر بانو نے ہوش سنبھالے ہیں گولکنڈہ اپنے عہد زریں سے گزر رہا تھا ' اس کے دادا سلطان قلی اور بھائی سلطان عبداللہ اور خود اس کے والد نے اپنی ذاتی دلچسپی اور انہماک سے جو علمی فضا پیدا کر دی تھی وہ ہر صاحب ذوق کے لئے مسد حیات تھی ' سلطانہ شہر بانو نے اس فضا میں رہ کر وہ سب کچھ حاصل کیا جس کی ایک زیرک شاہزادی سے توقع کی جا سکتی ہے ' شادی کے بعد جب وہ بیجا پور آئی تو یہاں اس کے خسر جگت گرو کی پیدا کی ہوئی وہ علم آموز اور دانش بیز ہوا چل رہی تھی جو ارباب علم کے لئے مفرح ذات تھی ' خود سلطان محمد عادل شاہ کی ذات میں سلطانہ شہر بانو نے ایک ایسا شوہر پایا تھا جس کی گھٹی میں علم پروری نے بھی بڑا حصہ پایا تھا -

اس سراپا علمی فزا میں جس ہستی نے زندگی بسر کی ہو اور جو خود بھی بذاتہ شوق و ذوق علم کا مجسم پیکر ہواوسنے علم و ادب کے لئے کیا کیا نہ کیا ہوگا ' رستمی کا مایۂ ناز شہ کار خاور نامہ جو چوبیس ہزار شعر کی اردو رزمیہ مثنوی ہے اور ملک خوشنود کی ہشت بہشت اور یوسف زلیخا خدیجہ سلطان شہر بانو کی سر پرستی کی زندہ یادگاریں ہیں -

اس علم دوست اور ادب نواز سلطانہ کے دامن عافیت میں جس تعلیم و تربیت کا انتظام ہوا اس کے بوجوہ کامل احسن و بہتر ہونے میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا ' لائق معلم اور قابل ترین مودب شہزادے کی تعلیم و تربیت پر مامور کئے گئے ' آگے چلکر شہزادے نے ایک نامور ادیب' بلند پایہ شاعر ' قابل مدبر اور نبرد آزمائی میں آزمودہ کار جنرل اور

ایک شاہ سرآمد روزگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا تو وہ نتیجہ تھا ایک ایسی تربیت کا جو شاہی خاندانوں کے ارکان کو اقبال مندی کے عین زمانہ شباب میں شاذ و نادر ہی میسر ہوتی ہے -

انیس سال کے عین زمانہ شباب میں علی نے جب حکمرانی کی باگ ہاتھ میں لی تو اس نے اپنی سلطنت نہ صرف بیرونی مخالفوں میں گھری پائی بلکہ خود ارکان حکومت اور امراء ملک میں بغض و عناد کی تباہ کن آگ شعلہ زن دیکھی ' مغلیہ شہنشاہت کی پالیسی اب اس امر کی مقتضی تھی کہ دکن میں بھی عظیم‌الشان مغل سلطنت کا خطبہ و سکہ چلنے لگے ' شاہجہاں صاحب قراں کی جانب سے اورنگ زیب خلد مکاں نے عادل شاہی قلمرو پر تاخت کی اور بیدر و کلیانی پر شاہجہانی علم لہرا دیا ' علی عادل شاہ کے مصائب نے خاتمہ کی کوئی صورت نہیں دیکھی ' عادل شاہی حکومت اعدا کے نرغے میں تھی ' غریب سلطان کی عمر کا بہترین زمانہ میدان جدال و قتال میں بسر ہوا ' تیغ و تفنگ اور تیر و نیزہ کے ہزاروں کھیل تماشے دیکھے' کبھی مغلوں سے معرکہ ' کبھی مرہٹوں سے آویزش اور کبھی صلابت خاں سے پیکار ' یہ سلطان علی کا ہی دل و دماغ تھا کہ اپنی فراست و دانشمندی کے بل بوتے پر ان مشکلات پر غالب آنے کی لگاتار کوشش کی اور کامیابی بھی کچھ نہ کچھ حاصل کی اور بہر صورت سلطنت کا بھرم قائم رکھا - ۱

یہ وہ زمانہ تھا کہ عادل شاہی فرماں روائی کے قیام پر تقریباً دو صدیوں کا طویل عرصہ گذر چکا تھا اور شیرازہ حکومت میں درھمی کے آثار پیدا ہوچکے تھے گو یہ صحیح ہے کہ ملیبار اور بدنور کے علاقوں پر عادل شاہی اثر قائم ہوگیا لیکن جو درھمی پیدا ہوچکی تھی اس کا ازالہ کسی طرح نہ ہو سکا -

سلطان علی نے جب حکمرانی کی عنان اپنے ہاتھ میں لی تو بیجاپور اس مرحلہ سے گزر رہا تھا جس سے ہر حکومت کو ترقی کے بعد گزرنا لازمی ہے ' اور جو در اصل اختتام و زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے ' اس وقت بیجا پور کی عام معاشرت میں سادگی ' بلند مشربی ' اور عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا ' تمدن اور رسمی شایستگی میں پیچیدگی اور تکلف بیجا نے اپنی جگہ پیدا کرلی تھی ' عالی شان عمارات کی زیبایش اور آراستگی میں سونے کو پانی کی طرح بہایا جاتا تھا ' زاہد فریب رانیوں اور گل رخسار حرموں نے عیش و طرب کے وہ سامان مہیا کر دئے تھے جن سے انسانی زندگی اپنے اس جوش اور انہماک کو بالکلیہ فراموش کرچکتی ہے جو قوموں اور حکمرانوں کی روح ہے ' سلطان علی نے آنکھ کھولی تو اس ماحول میں اور ہوش سنبھالے تو اس ماحول میں اور زندگی ختم کی تو اس ماحول میں ' لیکن اس کے باوجود اس نے کوشش و سرگرمی کا جو حق ادا کیا وہ عجوبہ ہے -

ذاتی حیثیت سے بادشاہ نے علم و فن کی خاص قدر افزائی کی اور کیوں نہ کرتا جب کہ خود بھی صاحب علم اور صاحب ذوق تھا -

نامور اصحاب علم و فضل اس کے پاس بھی جمع تھے ' قاضی نوراللہ ' علامہ فتح‌اللہ شیرازی ' ملا احمد ' شاہ ابوالمعانی جیسے اصحاب بے فکری سے خدمت گزاری علم میں سرگرم تھے ' شاعری کا تو اب گھر گھر چرچا تھا ' شعر کہنا اس وقت گویا فیشن میں داخل تھا - سخن فہمی ' سخن سنجی ' سخن دانی کے بغیر کوئی شخص سوسائٹی میں نہ تو نام و نمود پیدا کر سکتا تھا اور نہ کوئی اثر و رسوخ حاصل کر سکتا ' فارسی شاعری کے علاوہ خود دکھنی شاعری نے بھی اس وقت خوب بال و پر

حاصل کئے ' نصرتی ' ہاشمي ' مرزا ' شغلي وغیرہ جیسے ارباب فکر و تخیل صدیوں میں جاکر کہیں پیدا ہوتے ہیں -

اس فضا میں اگر بادشاہ خود بھی شعر نہ کہتا تو بہت تعجب کی بات ہوتی بحیثیت سوسائٹی کے صدر کے اس کو شعر گوئی کا ملکہ پیدا کرنا ضروری تھا -

یہ بات تاریخي شہادت سے ثابت تھی کہ سلطان علي عادل شاہ نے دکھنی یا ہندوستانی میں بھي طبع آزمائی کي ہے ' اور اس کے کلام کے جمع و ترتیب کا کام شاہ ابوالمعالی ایک صاحب ذوق فرد کے ذمہ کیا گیا تھا ' سلطان کے تخلص شاہی سے بھی آگاهي تھی ' لیکن اصل کلام پردہ خفا میں تھا - تحقیق و تلاش میں ناکامی ہو چکی تھي ' خدا کا شکر ہے کہ اب یہ گوہر گم گشتہ دستیاب ہو چکا ہے ' دفتر دیواني و مال حیدرآباد کے کتب خانہ میں دوسرے بیش قیمت نوادرات کے ساتھ یہ گوہر نایاب بھی مخزوں ہے -

سلطان علی کو طبعاً خوش مزاجی رنگین طبعي اور بذلہ سنجي سے حصہ وافر نصیب ہوا تھا ' مصوری موسیقی میں بھي مہارت تامہ حاصل تھي ' ایسے فرد کا شعر کہنا قدرتي ہے ' طبیعت کا بہاو خود اس جانب لے جاتا ہے - زمانہ تعلیم میں ملک خوشنود ' اور رستمي وغیرہ نے بھي بادشاہ کي افتاد طبیعت پر اثر ڈالا تھا اور شعر گوئي کا خاصہ ملکہ پیدا ہوگیا ' ابتدائی اثرات کا اس کی شاعری کے ہر ہر جزو سے صاف صاف اظہار ہوتا ہے -

شاہی کا کلام سب اصناف سخن پر شامل ہے ' نامناسب نہ ہوگا ' اگر کلیات شاہی کے ہر صنف کلام پر مختصر روشني ڈالی جائے -

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے جہاں تک ہمارے معلومات کی

مثنوی

رسائی ہے یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ دکن میں کسی اور صنف کلام کا رواج ہونے سے پہلے مثنوی کا آغاز ہوچکا تھا ، جتنے قدیم شاعروں کا اب تک کھوج لگا ہے ان سب کی کوئی نہ کوئی مثنوی دستیاب ہوئی اور اُن کے کمال کا معیار قرار پائی ہے -

مقیمی کی چندر بدن و مہیار ، ضعیفی کا قصۂ تمیم انصاری ، ملک خوشنود کی ہشت بہشت ، رستمی کا خاور نامہ ، نصرتی کی گلشن عشق ، علی نامہ اور تاریخ اسکندری ، ہاشمی کی یوسف زلیخا ، جیسی مثنویاں جو ہر زبان کے ادب کے لیے سرمایۂ امتیاز ہوسکتی ہیں یہ سب مثنویاں بیجا پور میں لکھی گئی ہیں -

شاہی کی ایک مثنوی بدیع الجمال نظر سے گزر چکی ہے ، افسوس ہے کہ وہ اب دستیاب نہیں ہو سکتی ، کلیات شاہی میں تین مثنویاں ہیں ان میں سے ایک مثنوی خیبر نامہ کے نام سے موسوم ہے ، اس کے (۷۲) شعر ہیں ، دوسری مثنویاں سات سات شعر کی ہیں -

خیبر نامہ میں جنگ خیبر کے واقعات بلا مبالغہ ، سید ہے سادے اسلوب میں قلم بند کیے ہیں یہ مثنوی شاہی کی واقعہ نگاری کی ایک اچھی مثال ہے ، بعض شعر ملاحظہ ہوں -

اول حق کی توحید سوں کر سخن　　پچھیں خوش ادا سوں بیاں کر بچن
تجھے ہے سزاوار حمد و ثنا　　ترے حکم سوں ہے نہنا ہور بڑا
اتا ایک قصہ سنو جنگ کا　　کہ وہ جنگ تھا دین کے ننگ کا
اتھا ایک خیبر کا قلعہ بکل　　بڑے بھر کلاں پر اکل تے اتل
پھتر تے برج کے بجر سے کھڑے　　اتے سخت وہ سب نہنے ہور بڑے

....　　.................................

سلیم ظاہری باطنی سوں سنوار عنایت کیے شاہ کوں ذوالفقار
روانہ ہوے جنگ کوں نام دار وہ شاہ ولایت ادھک کام گار

.... · ....

تیرا یاد دن رات شاہی کا کاج تیرے فیض سوں ہے اسے تخت وتاج

قصیدہ نگاری کے متعلق واضح ہو کہ اُس وقت رستمی اور نصرتی

قصیدہ

نے قصیدہ لکھنے میں خاص امتیاز حاصل کر لیا تھا ' ان کے قصائد کیا بہ لحاظ فن اور کیا بہ لحاظ مضمون شہرت اور قبولیت حاصل کرتے جاتے تھے ' شاہی کے قصائد اپنے ہم عصروں کے قصائد کے ساتھہ ہم رتبہ ہیں ' آسان اور سنگلاخ ہر قسم کی زمینوں میں اس نے قصیدے لکھے ہیں ' اور لکھنے کا حق ادا کیا ہے ' زور بیان شوکت لفظی اور شاہانہ طمطراق کا ان قصیدوں سے کافی اظہار ہوتا ہے ' اس میدان میں اس کے تخیل نے بہت کامیاب پرواز کی ہے ' قصیدہ نگاری نے اس وقت اپنا جو معیار قائم کر لیا تھا اس کی پوری پابندی شاہی نے کی ہے ' ان قصائد کا موضوع حمد و نعت و منقبت ہے یا کسی محل و باغ کی تعریف ہے ' چند شعر ملاحظ ہوں -

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل
عقل معلم اپن قصہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے
عقل کا جاسوں ہو مکھہ پہ اچھے یو کرن
عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بھتر
خوب دساوے جھلک درجک دُرّعدن

....

....

خاک کی پتلی بنا روح لے تن میں بھرا
چال چلا کر اول آپ سکھایا مکن
آب و آتش ملا خاک و ہوا نے کلا
چار عناصر لگا دھے سلواریا ھمن

ارے کلال مجکوں پیالا پلا میا کا
تامست ہو کے دیکھوں مکڑا علی پیا کا
....
....
شاہ نجف ولی ہے تس نام سو علی ہے
وہ راز دان احمد سلطان اولیا کا

سارے جہاں میں نہیں ہوا تیج سار کا شمشیر زن
جس پر کیا یک وار توں دو دھڑ برابر ہو پڑے

دسے مج نین میں اس حوض پہ چلند نا پونجھل
دھر یا ہے چاندنی جیوں سکہ اپس مکہ لے اگل

پریاں اچرج ہو کہیاں دیکھہ کر اس حوض کتھیں
اچھے امرت نے بھریا حوض یو سمندر تے ڈکل

پایا اچھے اس قصر کا پاتال تلک
طاق کسروں ہوے معراج اسے زہ کے اگل

سعدی و حافظ کی فارسی غزل خوانی کے بعد ہندوستان میں

غزل — غزل نگاری نے جو رنگ اختیار کیا ' اور ظہوری و کلیم نے جو زمزمہ خوانی کی ' اس کی آواز بازگشت میں

وسنمی ' نصرتی وغیرہ نے اپنا زور قلم صرف کیا ' اسی طرح شاہی کا کلیات بھی غزلوں سے خالی نہیں ہے -

محل سراؤں اور شاہی کوشکوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کوئی کمی نہیں تھی ' رخساروں کی گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آنکھوں پھر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا ' اس لحاظ سے شاہی کی غزلیات میں حقیقت کی بھی جھلک نظر آ جاتی ہے ' ساتھ ہی رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی میں شاہی بہت کامیابی سے اپنے تخیل کو کام میں لایا ہے -

جس دن تے تمن سات لگیا من را ہمارا
اس دن تے پرت کا ہوا مج تن میں پکارا

ابرو کمانا کھیچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لا گیا نشان تج ہاتھ کا

بولے جہاں کے پیار کہے ہمنا نہ آوے بولتا
تمنا سہانا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو

مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کو بہتر کہو

تج نین کی نرمی کلے ملکتے ھیں موتی آبرو
یسا روپ کی تو کان ھے یا حسن کی سمدرر ھے

تج گال پرنگ کا نشان دستا ھے مج اس ھاتھہ کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

مظفر علی شاہ کے ھات کا اچگ تہولا گیا نشانی کے پگ

تمارے حسن کی خوبی مقابل جب چلدر سوں ہوئی
تداں تے میں کلیلکے کوں کدھی نرمل نہیں دیکھا

جس زلف و گال کے آگیں شام و سحر کو ھو
تس روپ کے پر کلے کوں حد بشر کو ھو

عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ریختی کی ایجاد کا سہرا رنگین

ریختی

اور انشاء کے سر بندھا ہوا ھے لیکن اب تحقیق یہ ہوئی ھے کہ دکھنی زبان میں اس نے بھی رواج پالیا تھا، فی‌الوقت ہاشمی کو اس کا موجد قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ھے، شاھی کے قلم نے اس میدان میں بھی جولانی دکھائی ھے کلیات میں ایک غزل ایسی موجود ھے، جس کے بعض شعر یہ ھیں :—

پیوست ریج رہنا لذت اسے کتے ھیں
آپ ریج پھر رجھانا صنعت اسے کتے ھیں
گل ہو گلاب میانے نہیں کچھ فرق ازل تے
یوں پیوں سوں مل رھی ہوں الفت اسے کتے ھیں

روں روں رسن کری میں شاهی کے نام لیلے
پهر پهر وہ ناؤں لینا راحت اسے کتے هیں

اس کا ایک مخمس زور بیان کی بہت اچھی مثال هے '

کوئی جاؤ کہو میج سا جن سات   میں نہہ بلدی تو کیتا گہات
پیو مورت دیکھوں سپلے میں
جب جاگوں تب رهوں تپلے میں
لا دیپک بـــرهـــا اپے میں
تن جالے جھک جھک جپلے میں
آرام اچھے میج کھپلے میں
کوئی جاؤ کہو میج سا جن سات   میں نہہ بلدی تو کیتا گہات
تبج یاد کر تل ملتی هوں
لہو تیل ملے دل تلتی هوں
تن موم بتی هو چلتی هوں
اس جلنے سوں نا ٹلتی هوں
سب رین برہ میں کلتی هوں
کوئی جاؤ کہو میج ساجن سات   میں نہہ بلدی تو کیتا گہات
جو برها جا لیا تن کوں اب
پو دو که کھنپر آ گھر یا تب
جیو هستونت جا لیا لنکا سب
اب کے سوں سوسوں میری رب
میں مکرا دیکھوں پیوں کا کب
کوئی جاؤ کہو میج ساجن سات   میں نہہ بلدی تو کیتا گہات
کوئی آو سلورے میرا حال
پیو کہا میج سوں جو کو تال

میں جگ تے نت اٹھہ انجود ھال
کل پلی آنسو موتی مال
سج یک یک پل ھے لک لک سال

تاریخ کی کتابوں سے یہ بات معلوم ھوتی ھے کہ شاھی نے مرثیے بھی کہے تھے ' لیکن فی‌الوقت کلیات کا جو نسخہ پیش نظر ھے اس میں کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ھوا -

اس موقع پر ایک بات کی وضاحت کر دینی بہت ضروری ھے ' واضح ھو کہ جس زمانہ کا ذکر ھو رھا ھے ' یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسلامی علوم و ادب میں انحطاط پیدا ھو چکا تھا اور اصابت فکر و رائے کا ٹوٹا پڑ چکا تھا ' لفظی مباحث کی دار و گیر نے اپنا پورا غلبہ حاصل کر لیا تھا ' شرح و حاشیہ کی بھول بھلیاں نے ارباب علم کو سرگرداں کر رکھا تھا ' قومیت یا اخلاق کے بلند اور اعلی جذبات کی نشو و نما اس زمانے کی شاعری کی دست رس سے بالکلیہ باھر تھی ' نہ صرف فارسی بلکہ دکھنی شاعری نے بھی اس وقت یہی روپ اختیار کر رکھا تھا ' اس لحاظ سے شاھی بلکہ اس وقت کے سب شاعروں کے کلام میں اس امر کی تلاش کہ انھوں نے زندگی کے سدھار ' اخلاق عامہ کی بھتری اور زندگی کے کوئی اعلی نصب‌العین مقرر کرنے میں کیا نقطہ نظر قائم کیا محض فضول ھے -

اس زمانے میں کسی شاعر کو بلند پایہ قرار دینے کا معیار غالباً صرف یہ ھوسکتا ھے کہ اس نے اپنی اس محدود چار دیواری میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اور فن کے پرکھنے کے جو ظاھری اور رسمی قواعد مقرر ھو گئے تھے ان پر اس کا کلام کس حد تک پورا اترتا ھے -

اس لحاظ سے شاھی کا کلام بلا شبہ اقران و امثال میں بہت بلندی پر ھے ' البتہ چونکہ دکھنی شاعری کا ابھی گویا ابتدائی دور تھا ' سادگی اور سادہ اسلوب اس کے کلام کی خاص خصوصیت ھے -

اب ہم بیجاپور کے پر شان و شوکت مرکز سے آگے بڑھتے اور گولکنڈہ میں پہونچ جاتے ھیں- گولکنڈہ گو شان و شوکت میں بیجاپور سے آگے نہ بڑہ سکا لیکن اطمینان اور امن و امان میں بیجاپور اس پر رشک کر سکتا ھے ' اصل یہ ھے کہ بیجاپور بہ لحاظ موقع مغلیہ شہنشاھی پالسی کا پہلے ھدف بن گیا ' گولکنڈہ تلنگانہ میں واقع تھا ' یہاں وقت بے وقت کی تبدیلی کا خطرہ ھر زمانہ میں کم رھا ھے ' تلنگانہ کا محل وقوع ھی ایسا ھے کہ اسلامی حکومتوں کی زد بہت کم تھی آس پاس جو ھندو راجہ مہاراجہ حکمرانی کر رہے تھے وہ اپنے خانگی نزاعوں میں گھرے ہوے تھے ' ان کو یہ فرصت نہیں تھی کہ مرھٹوں کی طرح قطب شاھی حکومت کو دق کریں -

گولکنڈہ

قطب شاھی سلطنت کا بانی بھی ان خوش قسمت روزگار آزما آفاقیوں میں ھے جو اپنی قابلیت کے بل بوتے پر دنیاوی اعلی ترین مدارج کو دیکھتے دیکھتے طے کر جاتے ھیں-

قطب شاھی حکمرانوں نے بھی اپنے معاصر رؤسا کی طرح جہاں بانی کے ساتھ ساتھ علم و فن کی سرپرستی کے بھی ایسے روایات قائم کئے ھیں جو ھر حکومت و سلطنت کے لئے مایۂ ناز و نازش ھو سکتے ھیں ' قطب شاھی حکمران بھی زیور علم سے آراستہ تھے ' ادب و شعر کی اقلیم بھی ان کے زیرنگین تھی -

قطب الملک کی عمر اپنی حکومت کے استحکام میں پوری ھوئی ' بریں ھم ''آھی خانہ'' میں شعرا اور ادیبوں کے جمگھٹے اس کے دور حکمرانی کی یاد تازہ رکھیں گے -

قطب الملک کے دوسرے بیٹے ابراهیم کا نام آج چار سو سال کے بعد بھی زندہ ھے ' اس نے رفاہ عام کے کار و بار میں جو وسعت دی اس کے قطع نظر اس نے ارباب علم کی بھی جو سر پرستی کی ھے وہ تاریخ کے صفحات سے کسی طرح محو نہیں ھو سکتی ' امیر شاہ محمد انجو ' عمادالدین محمود شیرازی ' شاہ تقی نے ابراهیم کے زمانے میں اپنے علم و فضل سے گولکنڈہ کا نام روشن کیا -

دکھنی زبان کے ادب نے بھی اس کے زمانہ میں خوب برگ و بار پیدا کئے - فیروز ' اور محمود دکھنی شاعری کے آفتاب و مہتاب تھے ' وجہی اور ابن نشاطی جیسے اساتذہ فن نے ان کی بزرگی کا لوھا مان لیا ھے -

ابراهیم کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں گولکنڈہ فارغ البال تھا ' امن و امان جو قائم ھوچکا تھا اس کی بدولت ترقی و سربلندی کے زینے اس کامیابی سے طے ھوے کہ دنیا میں گولکنڈہ کا نام روشن سے روشن تر ھوگیا ' حیدرآباد کا شہر اس کی نزاکت طبع کی یاد گار ھے ' چار مینار کی نادرۂ روزگار عمارت تمدن کے علو کی گواہ عادل ھے ' اس کے ساتھ علمی رونق اور چھل پھل کی بھی ایک دوسری بستی آباد ھوگئی ' میر محمد مومن استرآبادی مدارالمہام وقت ' قاضی محمد سمنانی ' میرک معین الدین سبزواری ' مرزا محمد امین سیستانی وغیرہ نے اپنی اعلی قابلیت کا جو مظاہرہ کیا وہ سلطنت قطب شاھی کے استحکام اور کامیابی کا ذریعہ قرار پا گیا ' دکھنی زبان نے تو اب پھل پھول کر ایک تناور درخت کی شان حاصل کرلی ' ملا وجہی نے قطب مشتری لکھ کر دکھنی زبان کی وسعت اور لوچ کا ایک تازہ ثبوت فراھم کر دیا ' اس مثنوی میں خود سلطان کی محبت و الفت کے سچے واقعہ کو جس استادی سے زندگی دی گئی ھے وہ دکھنی ادب کی سحرنگاری کا ایک درخشاں

کار نامہ ہے ' غواصی اور احمد جیسے باکمال ارباب شعرا نے آگے چلکر شہرت و نام آوری کا جو آوازہ بلند کیا وہ دراصل ثمرہ تھا اس فضا کا جو محمد قلی کے زمانہ میں پیدا ہو چکی تھی -

فارسی میں نظم لکھنا تو خیر اس زمانہ کی اعلی سوسائٹی کا تمغاء امتیاز ہی تھا ' بادشاہ نے تلنگی میں بھی اتنی دست گاہ حاصل کرلی تھی کہ شعر کہنا آسان ہو گیا تھا ' دکھنی ادب کو اس کے زمانہ میں یہ عروج حاصل ہوا کہ خود بادشاہ کو بھی اس زبان میں شعر کہنا پسند خاطر ہوا ' اور کبھی قطب شاہ اور کبھی معانی اس نے اپنا تخلص قرار دیا -

یوں تو دنیاے علمی سلسلہ آصفیہ کی تاریخ دکن اور عبدالجبار خاں ملکاپوری کی تحقیقات کے ذریعہ اس امر سے آگاہ تھی کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ دکھنی زبان میں صاحب دیوان تھا ' لیکن یہ امر مولانا عبدالحق صاحب کے حصہ میں تھا کہ سلطان کے دیوان کو خالص علمی معیار پر روشناس کرائیں ' رسالۂ اردو میں اس موضوع پر مولانا کا جو مقالہ شائع ہوا وہ ادب اردو کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے ' جس شرح وبسط سے مولانا نے محمد قلی کے کلام کا تعارف کرایا ہے اور جو نکات بیان کر رہے ہیں اس پر کسی مزید اضافہ کی مطلق کوئی گنجایش نہیں ہے -

مختصراً یہ کہ محمد قلی کا دیوان بھی اُس وقت کے رواج کے مطابق ہر قسم کے صنف سخن پر مشتمل ہے ' سلطان محمد قلی نے یہ کامیاب کوشش کی ہے کہ مناظر قدرت ' ہر وقت نظر آنے والی اشیاء اور روزمرہ پیش آنے والے معاشرتی واقعات وحالات کو ایک اچھے اور دل آویز اسلوب میں نظم کر دے ' باقی وہی قصہ ہے جس سے اس وقت کے دوسرے ارباب سخن کے دواوین و کلیات بھرے پڑے ہیں :—

محمد ناؤں تھے بستا محمد کا اے بن سارا

سو طوباں سوں سہاتا ہے جلت نملے چمن سارا

دسے فانوس کے درمیانے تھے جوں جوت دیویکا

سو بتوں دستاد والا میں تھے میواں کا بدن سارا

بھی دم عیسوی دائم چمن میں گل لگانے تیں

ہرے نہالاں کے جلوے تیں مشاطا ہو پوں سارا

سڑک سے باغ کوں دیکھت کھلے ملنچ باغ کے غنچے

سو اس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ گگن سارا

چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکھیاں کا مکھ یاد آیا

سہاتا تھا محمد پھل نمن ان کا نین سارا

....

....

اناراں میں سہے دانے سوجوں یاقوت بٹلیاں میں

ہر اک پھل اس اناراں پر سہے سکے نمن سارا

کھجوراں کے دسین جھون کے جوں مرجان کے پلنچے

سپاریاں لعل خوشے جوں دسین دن ہورین سارا

دسین ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں

ہور اس کے تاج کوں کھتا ہے پیالا کر دکھن سارا

دسین جاموں کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم

نظر لاگے یتول میویاں کوں راکھیا ہے جتن سارا

---

* غزل *

اب مست اچھے دایم ہمیں مست اچھلے کا ہنگام ہے

ساقی صراحی نقل ہور پیالے سو ہمنا کام ہے

عاشق اول تے ھیں ھمیں سرمست ازل تے ھیں ھمیں
نا آج کل تے ھیں ھمیں زاھد کونیں یہ فام ھے
ملکتا ھے مدمستاں کنے مدباج نیں سکتا رھنے
مے خانے کے کوچے ملے تو متقی بدنام ھے

اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ھیں مے پرستاں
مکھ نور پرد سے بھوں میچ خط عنبریں او
جوں سور ابر ھے بادل ریحان سوں گلستاں
روزی ھوا ھے قطب شہ تج عشق کا پیالہ
بھر لے ھیں ھر طرف توں جم شوق کے خمستاں

رکھ ایک ھے ھر ٹیک کدھن لاکھ چمن ھے
لکھ جوت ھے ھر ھتارولے ٹیک رتن ھے
منج عشق گری آگ کا یک چنگی ھے سورج
اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ھے

محمد قلی کا جا نشین محمد قطب شاہ ھوا ' پرھیز گاری اور پاکیزہ زندگی کی جو حیرت انگیز مثال اس نے پیش کی ھے وہ گویا ایک عجوبہ ھے ' مکہ مسجد جیسی بلند پایہ عمارت تمدنی ارتقاء کا ایک نمونہ ھے ' اس کا سنگ بنیاد تہجد گزار بادشاہ نے رکھا تھا ' اس بادشاہ کا عہد قطب شاھی دور حکومت کا نقطۂ عروج ھے ' اصحاب فضل و کمال کو گولکنڈہ کی کشش اس طرح کھینچ لائی تھی کہ پھر وہ اس سر زمین

کے ہو رہے تھے ' غواصی ' راضی ' ابن نشاطی ' جنیدی وغیرہ نے دکھنی ادب کو بام عروج پر پہونچا دیا تھا ' خود بادشاہ نے بھی مشق سخن کی ہے ' ظل‌اللہ اس کا تخلص ہے ' اگرچہ اس کا دیوان ابھی عام دسترس سے باہر ہے ' بریں ہم عبدالجبار خاں ملکا پوری نے اپنے مولفہ تذکرہ میں اس کے کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ اس امر کا بخوبی گواہ ہے کہ بادشاہ نے زبان پر کافی طور سے قدرت حاصل کر لی تھی ' اور سب قسم کے میدان ہائے سخن میں اس کی طبیعت نے جولانی دکھائی ہے -

هوا آئی ہے لیکے بھی تھلق کالا
پیا بن سدکا نا مدن بالی بالا
رهن ناسکی میں پیا باج دیکھے
ہووے تن کوں سکھ جب ملے پیو بالا
سجن مکھ شمع باج اوجالا نہ بھاوے
بھلایا ہے ملنج جیوں کوں او اجالا
جو رات آوے چندنی کے میج کون ستاوے
کہ چندنا ملجے نیں نیں سوز لالا

خدا داد محل کوں محمد سنوارے
تو اس میں جنت کے نگاراں لگارے
بلندي محل کا ہے آسماں جیسا
سورج چاند تارے سوں اس تھے سنگارے
نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسے محل کوں
مگر دهرت پر قدسیاں لیا کے ہتارے

میرا دل ہے زر الفت کا کارخانہ
نہیں منج کسوں بازار والا کا حاجت

عشق کی پتلی ہے گوری رنگیلی
چتر ناریاں میں دستی ہے چھبیلی

اب ہم عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں پہونچ جاتے ہیں، یہ زمانہ گولکنڈہ کے امن و امان کا آخری دور تھا، حیدرآباد کو سارے دکن میں ایک دارالعلوم کی حیثیت سے نام و نمود حاصل ہو چکا تھا، مشہور فارسی لغت برہان قاطع اسی زمانہ کی تالیف اور سلطان عبداللہ کے نام سے ہی منسوب ہے، تاریخ و ادب، حکمت و فلسفہ، منطق و ریاضی اور طب کی اس وقت جو شمع جلی اس کی روشنی کبھی ماند نہیں ہوسکتی -

سلطان عبداللہ کے زمانہ میں اعلیٰ حلقوں میں شعر و سخن کا چرچا بڑھ گیا، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ رات رات بھر خود بادشاہ کی موجودگی میں مشاعرہ ہوتا تھا، سہ شنبہ کے دن جو عام تعطیل کا دن تھا، بادشاہ کا مشغلہ صرف یہ تھا کہ شعر و سخن سے لطف اندوز ہوا کرے، اور قدما کے کلام پر نقد و تبصرہ عمل میں آئے -

اس ماحول میں دکھنی ادب کا بول بھی بالا سے بالا تر ہوگیا، سب رس، سیف الملک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، ماہ پیکر، پھول بن، بہرام و گل‌اندام کو لکھنے والے دماغوں نے تخیل کی پرواز، زبان کی سلاست، اور اسلوب کی روانی کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے، مرثیہ نگاری نے بھی اب بہت اہمیت حاصل کر لی، اور ماہ محرم میں عزاداری کی مجلسوں میں دکھنی مرثیہ اور بیان کا عام رواج ہو چکا تھا -

اس فضا میں خود بادشاہ کو بھی سخن گوئی کا شوق پیدا ہونا لازمی تھا ، اور پھر شاعری اس کے باپ دادا کی سنت تھی ، فارسی کے قطع نظر دکھنی زبان میں بھی نظم نگاری کا اس کو بہت اچھا ذوق تھا ، عبداللہ اس کا تخلص ہے ، اس کا کلیات بھی مرتب ہو چکا ہے لیکن افسوس کہ یہ بھی عام دسترس سے اب تک باہر ہے -

عبدالجبار ملکا پوری نے کلام کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کے معائنہ سے وہی امر ظاہر ہوتا ہے جو دوسرے بادشاہوں کے کلام کے متعلق اوپر بیان کیا گیا ہے ، البتہ بہ لحاظ عصر و ماحول لفظی شان و شوکت کو بہت دخل حاصل ہو گیا ، اور زبان نے جو ترقی پائی تھی اس کے لحاظ سے بادشاہ کا کلام زیادہ شستہ اور صاف ہو گیا ہے :—

بول دلکشا عشرت محفل مطبوع اوتارا ہوا
جوتی زمیں کی پیت جیوں مشتری مارا ہوا
انکھیاں سور چندر سور کے دیکھ آسماناں دور کے
عاشق ہیں اس کے نور کے کیا خوب پوتھارا ہوا
صدقے نبی کے پا اماں اس محل میانے ہر زماں
جم عبداللہ شہ تر کماں ہوگی کمدارا ہوا

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب   دیکھتا ہوں تو رہے نا ملنچ میں تاب
شاہ عبداللہ نبی صدقے تجے   خوب رویاں میں کیا ہے انتخاب

آج زہے بخت جو آئی سعادت کی رات
چاند سوں میری ملا غم تھی ملنچ دے نجات
روپ میرے لال کا آئے نہ تحریر میں
چاند عطارد اگر ہوویں قلم ہور دوات

کام مرداں کے نکو جان تو اے خام عبث
کہ جکوئی مرد ھیں کرتے نہیں وہ کام عبث

آخری قطب شاھی تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں قطب شاھی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا اور ہر طرف شورش و بے اطمینانی پیدا ہوگئی ' بریں ہم شعر و سخن کا چرچا سرد نہ ہوا ' لطیف کا ظفر نامہ ' غلام علی کی پدماوت ' سیوک کا جلک نامہ ' سب اس زمانہ کی پیداوار ہیں ' سلطان نے بھی شعر کہے ھیں لیکن افسوس کہ کوئی مرتب یا مسلسل مجموعہ دستیاب نہ ہو سکا ' سب کو وہ شعر معلوم ھے جس کو گلشن ھندی میں مرزا علی لطف نے بیان کیا ھے -

---

عادل شاھی اور قطب شاھی سلطنتوں کے انقراض کے بعد مغلیہ شاھنشاھی کا چلند دن سکہ چلتا رھا ' شاہ خلد مکاں عالمگیر کے بعد جو افراتفری پیدا ہوئی اس نے ایک مدت تک دکن کو تہ و بالا کر رکھا تھا ' آخر آصف جاہ اول کی فولادی قوت نے دکن میں امن و امان کا نیا دور پیدا کر دیا -

آصف جاھی سلطنت نے شروع سے علم کے پھیلانے اور اھل علم کی سر پرستی کرنے میں اپنے نہایت ھی شاندار روایات قائم کیے ھیں ' حضرت آصف جاہ کا بنا کردہ مدرسہ فاروقیہ اورنگ‌آباد میں نشر و اشاعت علم کا مرکز تھا ' آزاد بلگرامی ' اور ان کے ساتھ اور بیسوں اصحاب فضیلت اورنگ آبادی میں جمع ہو گئے تھے ' شعر و سخن کے کئی استادوں نے اس کو اپنا مسکن بنا لیا تھا ' ولی کا اگرچہ انتقال ہو چکا تھا بریں

ہم ان کے شاگرد ' استاد کی روشن کی ہوئی شمع جلائے چلے جا رہے تھے ' شاہ سراج کا حلقہ درس برابر جاری تھا ' وجدی ' فراقی ' اعظم ' ذوقی ' روحی ' خاکی وغیرہ جیسے شعرا ' شعر و سخن کی متاع قائم کی حفاظت میں پورے انہماک سے مشغول تھے ' خود آصف جاہ اول کو بھی شعر سے پوری مناسبت تھی ' فارسی کلام بہ تمام و کمال موجود ہے اور خوش قسمتی ہے کہ وہ چھپ بھی گیا ہے ' یہ بھی ثابت ہے کہ اردو میں آپ نے مشق فرمائی ہے بعض تذکروں میں آپ کا ایک اردو شعر ملتا ہے ' مرزا بیدل سے آپ کو تلمذ حاصل تھا۔

آصف جاہ اول کے دوسرے صاحبزادے نواب ناصر جنگ نے بھی اپنے پدر گرامی قدر کی طرح نہ صرف اہل علم اور شعرائے نامور کی سر پرستی کی ہے بلکہ مشق سخن پر بھی توجہ فرمائی ' اس کے ساتھ موسیقی اور مصوری میں بھی کمال حاصل تھا ' اس طرح آپ نے شعر کہنے کے سارے لوازم قدرت کی جانب سے ہی فراہم کرلئے تھے ' آپ کے دو فارسی دیوان طبع ہو چکے ہیں - اردو کلام کے نمونے مختلف تذکروں میں پیش کئے گئے ہیں ' آپ کے اس کلام کو زبان کی سادگی اور اثر پیدا کرنے میں امتیاز حاصل ہے :—

نین تیرے شکار کرتے ہیں　　دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں　　آرسی پر بہار کرتے ہیں
کسی بیداد سوں چمن میں آج　　پھول سارے پکار کرتے ہیں
اہل دل گریۂ ندامت سے　　سیر ابر بہار کرتے ہیں
چشم بد دور دلبراں سارے　　اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں

یار خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
ذرے ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سلاطین آصفیہ کے تاجدار شعرا کی تیسری کڑی نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سابع ہیں ' آپ کا زمانہ علم و ہنر کی ترقی اور شعر و سخن کی قدر دانی کے لیے ہمیشہ یاد گار رہے گا ' اب وہ زمانہ آیا کہ فارسی کا زور بالکل ختم ہو گیا ' سرکاری دفاتر میں فارسی کے بجائے اردو رائج کر دی گئی ' دہلی ' لکھنو ' رامپور کے شعرائے نامدار حیدرآباد میں جمع ہو گئے ' داغ ' امیر ' ظہیر ' میکش سب اس دور میں حیدرآباد چلے آئے ' انیس اور ان کے شاگرد ہر سال محرم میں آتے رہے -

ایک طرف شمالی ہند کے اساتذہ معہ اپنے شاگردوں کے بازار سخن گرم کیے ہوے تھے تو دوسری طرف خود حیدرآبادی شاعر حضرت فیض اور ان کے تلامذہ باقی ' عصر ' یاس ' فیاض وغیرہ کی گرم بازاری الگ نقشہ جمائے ہوے تھی ' قدیم شاعری نے اب اپنا چولا بدلنا شروع کر دیا تھا ' اس کی آواز بازگشت خود حیدرآباد میں بھی پوری قوت سے بلند ہونے لگی -

آصف جاہ سابع کو شاعری کا خاص مذاق تھا ' داغ سے اصلاح سخن لی جاتی تھی اور ان کو فصیح‌الملک بلبل ہندوستان جہاں استاد کے خطاب کے ساتھ دوہزار روپیہ ماہوار مقرر کی ' آصف جاہ سابع کا تخلص آصف تھا ؛ آپ کی غزلیات استاد کی غزل نگاری کا چربہ ہیں ' وہی لطف زبان ' ترکیب کی خوبی ' فصاحت مضمون ' محاورہ ' روز مرہ ' عاشقانہ مضمون آفرینی سے آپ کا کلام مملو ہے -

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہات
واہ واہ دزد حنا کیا ہات کا چالاک تھا

فاتحہ پڑھتے ہوے اس نے سمیٹے دامن
جب مرا دست ہوس قبر سے باہر نکلا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف
وہ شاہ حسن سہی شہر یار ہم بھی ہیں

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قربان
جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا

لائے تھے وہ رقیبوں کو ٹھہرے مزار پر
اڑ کر غبار سامنے دیوار ہو گیا

وصل میں تلخ بھی دشنام مزا دیتے ہیں
کوسنے والوں کو ہم دل سے دعا دیتے ہیں

مقابل یوں ملے جب حسن کی داد
ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

یہ کافر حسین ایک جا جمع ہونگے
جہنم میں بھی اک طرح کا مزہ ہے

نشان اہل نشاں ہو گئے بہت معدوم
ظہور قدرت پروردگار باقی ہے

بے تاب دل کے ساتھ سے ہے میری لاش بھی
اندر مزار کے کبھی باہر مزار کے

غزلیات کی طرح آپ کی اخلاقی نظمیں بھی مشہور ہیں ' رعایا کے مختلف سپاسناموں کے جواب میں آپ نے اپنی سالگرہ کے موقع پر نہایت ہی عمدہ نظمیں اکثر و بیشتر سنائی ہیں جو تعلیم ' فوج اور اصلاح قوم ' وفاداری ' علم و عمل وغیرہ مختلف عنوانوں پر لکھی گئی ہیں -

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر اس کے اختتام کو حضرت عثمان کے اسم گرامی سے زینت نہ دی جائے ' چھ صدیوں سے اردو ادب کی ترقی و ارتقاء کے جو مدارج طے ہو رہے تھے اس کے سلسلہ کی ایک سنہری کڑی حضرت بندگان عالی نواب میر عثمان علی خاں کی ایک کشش قلم سے وجود پذیر ہوئی ہے -

جامعہ عثمانیہ اردو زبان کی ترقی کی وہ منزل ہے جہاں یہ کارواں صدیوں کے مراحل طے کرنے کے بعد پہونچا ہے ' جامعہ عثمانیہ کے عالم وجود میں آجانے کے بعد حیدرآباد پر جو علمی فضا چھائی ہوئی ہے وہ اردو ادب کے لئے ایک نہایت پرشان و شکوہ مستقبل کی کفیل ہے ' جامعہ عثمانیہ میں مشرقی اور مغربی علوم میں جو آموزش دی جا رہی ہے اس سے ایک ایسے مرکب کے تیار ہونے کی پوری توقع ہے جو ہمارے قویٰ کی درماندگی کے ازالہ کے لئے سریع‌الاثر اور حقیقی طور سے مقوی ہو -

اس سے قطع نظر اردو کی اقلیم شعر و سخن بھی حضرت عثمان کے زیرنگین ہے ' حضور نے جس سلاست اور برجستگی سے افکار دقیق اور خیالات عالیہ کا اپنے کلام میں اظہار فرمایا ہے وہ اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے -

انتہا جور و ستم کی ستم ایجاد بھی ہے
خاک عشاق کی پامال بھی برباد بھی ہے
ہمہ تن گوش ہیں گل نغمہ بلبل کے لیے
سننے والا کوئی آہ دل ناشاد بھی ہے
ایسے گلشن میں کہاں چین میسر عثماں
جس میں گلچیں بھی ہے صیاد بھی جلاد بھی ہے

نہاں نظر سے ہوا روے یار مشکل ہے
اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے
نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کے لئے
یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے
غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی
ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے

آج ہے داخل مسجد پے طاعت عثماں
ساتھ زہاد کے اک رند قدح خوار بھی ہے

زمین شعر میں ہم دام فکر سے عثمان
شکار طائر مضموں کا کر کے لاتے ہیں

گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی

سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یاران رفتہ کا
غنیمت ہے کہ ہے اب تک نشان کارواں باقی

اس مقالہ کی سماعت سے اب آپ پر یہ امر واضح ہوا ہوگا کہ اردو ادب کی تخلیق اور ارتقاء میں اگر ایک طرف معمولی شہریوں نے اپنی کوشش کا حق ادا کیا ہے تو دوسری طرف خود شاہان وقت نے بھی برابر سعی کی ہے ' ان کی سعی اور سرپرستی نے ہی اردو کو آج اس قابل کیا کہ خود سر زمین دکن میں اس کی پہلی جامعہ کھولی جائے۔

افسوس ہے کہ ادب اردو کے یہ جوہر گراں بہا چند مخصوص کتب خانوں کی زینت ہیں ' ان کی طباعت و اشاعت کا جو فرض ہم پر عائد ہے اس سے سبکدوشی کا سامان جلد سے جلد مہیا ہو جانا بہت ضروری ہے فقط -

ھندی اور اردو کو قریب ترلانے کے لئے
رومن خط نہایت ضروری ھے

(از مولوی اجمل خاں صاحب (شانتی نکیتن - بنگال)

آج سے چھ سال پہلے ھندستانی اکیڈیمی کے سالانہ اجلاس میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی جمع کی ھوئی فلسفہ کی اصطلاحوں کے متعلق میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اگر ھم اردو اور ھندی کو قریب لانا چاھتے ھیں تو ھمارا فرض ھے کہ علمی اصطلاحوں کو اتنا آسان بنا دیں کہ عام لوگ اُن سے فائدہ حاصل کرسکیں - میری پوری تنقید گذشتہ سال "الناظر" میں چھپ گئی ھے - لیکن اب تک کسی علمی سوسائٹی نے نہ میری موافقت کی نہ مخالفت - اس کا مجھے افسوس ھے - اس لئے کہ بظاھر ترقی زبان کے لئے بہت شور مچایا جاتا ھے - لیکن جب کوئی کام کی بات پیش کی جاتی ھے تو قوت عملی کی کمی کی وجہ سے ذرہ برابر بھی توجہ نہیں ھوتی کاش کہ میری تجویز کی مخالفت ھی ھوتی تاکہ میں غالب کی طرح یہ کہ سکتا کہ—

قطع کیجئے نہ تعلق ھم سے
کچھ نہیں ھے تو عداوت ھی سہی

آج جو چیز آپ کے سامنے پیش کر رھا ھوں - درحقیقت یہ میرا پرانا خیال ھے - جسے نئے لباس میں ظاھر کر رھا ھوں اور اگرچہ بعض حضرات اسے پسند نہ فرمائیں گے لیکن مجھے پورا بھروسہ ھے کہ اس معزز جماعت کی زیادہ تعداد میری تائید کرے گی - اس لئے نہیں کہ میں آپ کے جذبات سے اپیل کروں گا - بلکہ محض

اس لئے کہ آپ کی عقل سلیم : جذبات قدامت پرستی پر غالب آئے - اور آپ قومی تعلیم اور قومی زبان کو رسم خط کی قربان گاہ پر بھینٹ نہ چڑھائیں -

جب کبھی ھندی اور اردو کو ملا کر ھندوستان کی ایک مشترک زبان یعنی "ھندوستانی" بنانے کا خیال پیدا ھوتا ھے تو یکا یک رسم خط ' لپی یا Script کی ایک دیوار بیچ میں آ جاتی ھے - اگر یہ پردہ اُٹھ جائے تو تھوڑے دنوں میں ھماری زبان صاف اور با محاورہ ھو جائے اور راستے سے دو اور مشکلیں بھی ھٹ جائیں - یعنی -

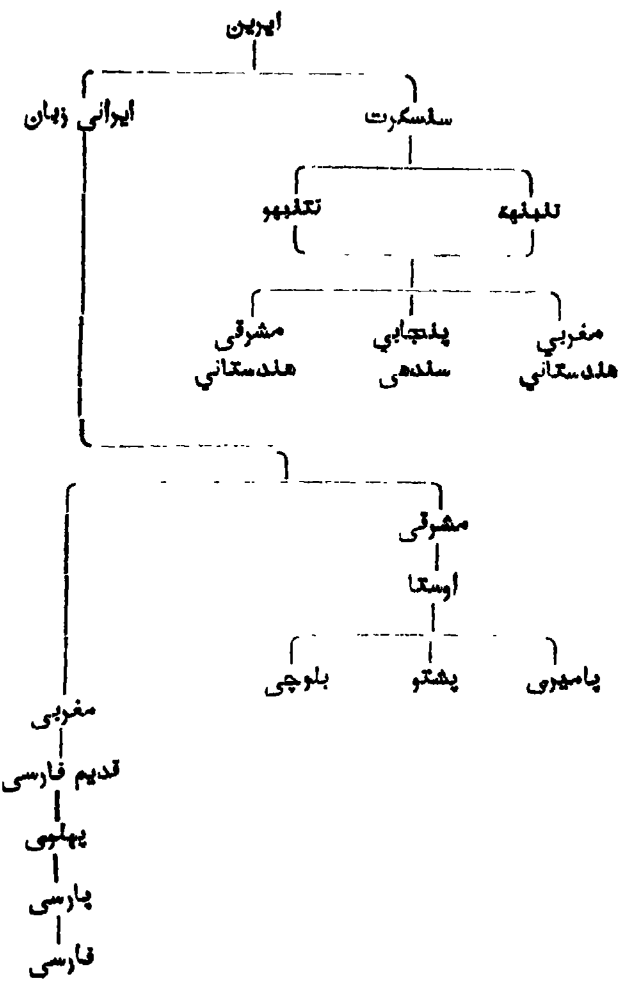
(۱) یہ سوال بھی حل ھو جائے کہ ھمیں اپنے لٹریچر کے لئے کون سی پوشک بھاشا ' امدادی زبان یا Feeding language اختیار کرنی چاھئے - اور

(۲) ھمیں کس تمدن یا کلچر کو اپنا نمونہ یا Ideal بنانا چاھئے؟

یہ دونوں عملی سوال ھیں - جو رسم خط کے طے ھوتے ھی خود بخود حل ھو جائینگے - اگر ھم ایسا کرسکے تو گویا ھم نے اپنی قومی تعلیم کے مسئلہ کی آدھی مشکلات ایک آن میں ختم کر دیں - غرضکہ میں صرف یہ عرض کرنا چاھتاھوں کہ اردو خط یا ھندی لکھائی کے بدلے آپ رومن خط یا رومن لپی استعمال کرنا شروع کردیجئے- اور میں آپ کو یقین دلاتا ھوں کہ ایک سال کے اندر ھندی اردو کا جھگڑا مٹ جائے گا - ممکن ھے کہ کوئی یہ کہے کہ جس طرح ایک سال میں سوراج نہیں ملا اُسی طرح یہ جھگڑا بھی جلد مٹنے والا نہیں - تو میں جواب میں یہ عرض کروں گا کہ ھم ھندی اردو کو اتنا قریب تو ضرور لے آئینگے جتنا اب ھمارا ملک سوراج سے قریب ھے -

هندوستان کی زبانیں

آب و ہوا ' پیداوار اور نسلوں کے اعتبار سے جس طرح ہمارا ملک ایک چھوٹا سا براعظم ہے ' اُسی طرح یہاں بہت سی زبانیں اور سیکڑوں بولیاں رائج ہیں - لیکن سوائے جنوبی ہند کی تامل ' تلنگی ' کنڑی اور ملایلم کے باقی جتنی زبانیں ہیں وہ سب ایرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں - اور زیادہ تر سنسکرت کی پراکرتوں سے ترقی کرکے اس درجہ پر پہنچی ہیں - ان زبانوں میں سے جو زبانیں مغربی ہندوستان میں بولی جاتی ہیں اُنھیں بندیلی ' قنوجی ' برج بانگرو اور ہندوستانی کہتے ہیں - اور جو پورب میں بولی جاتی ہیں اُن کو اودھی - بگھیلی - چھتیس گڈھی (اُڑیہ اور مرھٹی) کہتے ہیں - مغربی پنجاب کی زبانوں کو پشاوری ' پشتو ' ملتانی ' شاہ پوری ' سندھی ' راجستھانی ' گجراتی لاڑی ' بلوچی اور پامیری میں تقسیم کیا گیا ہے - اور مشرقی پنجاب کی زبان کو پنجابی کہتے ہیں - ان زبانوں میں سے پامیری ' پشتو اور بلوچی کی ماں اوستا ہے - یہ زبان مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی اور اسی میں حضرت زرتشت کے وہ الہامی گیت ہیں جنھیں گاتا کہتے ہیں - اور اوستا خود ایرانی زبان سے نکلی ہے - اصل ایرانی زبان سے قدیم فارسی بنی تھی جسمیں بمقام بہستن دارا کے کتبے پائے گئے ہیں - فارسی سے پہلوی (ساسانی بادشاہوں کی زبان) بنی پھر پارسی (ھزاروش یا پازند) ہوئی - جو آخر کار فارسی ہو گئی - خود سنسکرت اور قدیم ایرانی زبانیں ایک ہی مرکز سے چل کر اس قدر علیحدہ ہو گئی ہیں کہ بعض دفعہ پہنچاننے میں دقت ہوتی ہے -



موجودہ هندوستانی زبان سنسکرت اور ایرانی زبانوں کی پراکرتوں سے بنی هے - اسے هندوستانی اس لئے کہتے هیں که صرف همارا صوبه هندوستان مانا جاتا تها - یه خود ایک ملک تها اسی طرح بهارت ورش کے دوسرے صوبوں کو بهی الگ الگ ملک سمجه کر مختلف ناموں سے موسوم کہا جاتا تها - یه تقسیم زیادہ تر قوموں کے نام سے تهی - مثلاً جهاں بنگالی

قوم آباد تھی اور اُس کی ایک خاص زبان اور طرز معاشرت تھی اُسے ملک بنگال کہتے تھے- تلنگوں کے ملک کو تلنگانہ' راجپوتوں کے ملک کو راجپوتانہ' روھیلوں کے ملک کو روھیلکھنڈ اور بگھیلوں کے ملک کو بگھیل کھنڈ کہتے تھے - چونکہ ھمارا صوبہ ھندوؤں کی قدیم تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اس لئے اس کا نام ھندواستھان تھا - اور یہاں کی زبان ھندستانی - ھندی ریختہ اور اردو کے مختلف نام پا چکی تھی - فارسی میں لکھنے والے اسے ھندی ھندوی یا ریختہ کہتے تھے - اور چونکہ یہ علمی زبان نہ تھی بلکہ عام لوگوں کی بول چال کے لئے مخصوص تھی لہذا اس میں صرف وھی لوگ لکھتے پڑھتے تھے جو یا تو سیدھے سادے مضامین پر قلم اُٹھاتے تھے - یا امیر خسرو کی طرح فارسی اور ھندی کلچر کو ایک بنا کر ھندوستان والوں کو سچی روحانی تعلیم دینا چاھتے تھے - اور یہ صرف اس طرح ممکن تھا کہ ملکی زبان اور ملکی استعاروں اور تشبیہوں میں اُس چیز کو سمجھایا جائے جو صرف اُس وقت کی درباری زبان تک محدود تھی -

ھندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد قدرتی طور پر ھندو مسلمانوں میں اتحاد بڑھنے لگا - حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی پیدا ھوگئے جو خالص توحید کی تعلیم دیتے تھے - ترک رسوم کی جو تعلیم کبیر نے دی تھی اسے غالب نے اس طرح ادا کیا ھے -

هم موحد ھیں ھمارا کیش ھے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ھوگئیں

اسی اتحاد عمل اور یکجہتی کی تعلیم دادو نے دی - ڈاکٹر کے - ایم سین نے (جو صدر ودیا بھون - شانتی نکیتن ھیں) اپنی معرکۃالآرا کتاب دادو میں بتایا ھے کہ یہ دادو صاحب مسلمان تھے - ان کا نام داؤد تھا اور آج جو ھزاروں ناگے گنگا اشنان کے لئے پریاگ میں براج رھے ھیں یہ سب ان

ھی دادو کے ماننے والے ھیں - لیکن اب ھم حقیقت سے اتنا دور ھوگئے ھ
کہ ھندوستان کی قدیم معصبت و رواداری کی داستانیں بھول ھی نہ
چکے ' بلکہ اگر انہیں دھرایا جاتا ھے تو ھمیں تعجب ھوتا ھے - اگر کس
صاحب کو یقین نہ ھو تو کسی تانگے سے جاکر اتنا کہہ دیں کہ دادو مسلم
تھا - اور پھر اُس کے خوفناک چمٹے کی کرامات نہ نظر آئے تو میرا ذمہ -

غرضکہ مسلمانوں نے فارسی زبان کو ایسے زمانہ میں چھوڑ دیا
جبکہ اُن کی حکومت باقی تھی - حالانکہ ھم جانتے ھیں کہ کل
انڈو یوروپین زبانوں میں فارسی ھی سب سے زیادہ آسان اور شیریں
زبان ھے - اور فرانسیسی زبان کی طرح عرصہ دراز تک ایشیا میں سیاسی
(Political) معاھدوں کی زبان تھی - خود ھندوستان میں آٹھ سو سال
تک درباری زبان رہ چکی ھے - ریختہ یا ھندوستانی زبان کو
مسلمانوں نے اُسی طرح ترقی دی جس طرح ھندی کو نور محمد '
ملک محمد جائسی ' خانخاناں ' اور امیر خسرو نے دی تھی - اور آخرکار
اردو کا ایک ایسا زمانہ آگیا کہ بازار اور لشکر سے نکل کر بادشاھوں کے
درباروں اور شرفا کی مجلسوں میں اس کی رسائی ھوگئی - سنہ ۱۸۵۷ع
سے کچھ پہلے کا واقعہ ھے کہ جب غالب نے بادشاہ کے استاد کے متعلق
بہادر شاہ کے سامنے معذرت نامہ پیش کیا تو اُس میں یہ بھی عذر تھا
کہ " میں درحقیقت فارسی کا شاعر ھوں اور ریختہ زبان میں محض
حضور والا کو خوش کرنے کے لئے شعر کہہ دیا کرتا ھوں " -

میں کون' اور ریختہ ھاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

اس سے ثابت ھوتا ھے کہ اردو یا ھندوستانی صرف ھندستانیوں ھی
کی زبان تھی - اور غالب بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ میں اردو کا

شاعر ہوں - بلکہ بادشاہ کی قدردانی زبان کے خیال سے ریختہ میں کچھ کہہ دیا کرتا تھا -

بہر حال ہندو مسلمان کبھی اس قسم کے ہندو مسلمان نہ تھے کہ کہ وہ بات بات پر جھگڑتے یا محض زبان کے لئے زبان لڑاتے - دونوں نے مل کر ہندوستانی زبان کو ترقی دی تو تو میں میں کی کبھی نوبت نہیں آئی - لیکن سنہ ۱۹۰۱ع میں یا اس سے کچھ پہلے ہمارے صوبہ میں ہندی اردو کا سوال اُٹھایا گیا - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی چیز دو مختلف خطوں میں لکھی جانے لگی - عدالت کی زبان اردو ہندی قرار پائی اسکولوں میں ایک ہی مضمون دو خطوں میں پڑھایا جانے لگا - اور اس تحریک کو اتنی ترقی دی گئی کہ ہماری متحدہ قومیت اور متحدہ کلچر یا تمدن خطرہ میں پڑ گیا - واللہ جس کو یہ بات سوجھی ' اچھی سوجھی نہ توپ کی ضرورت ہوئی نہ بندوق کی- مسلمان اور ہندو ایک ہی زبان کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد الگ الگ اپنا اپنا راگ الاپنے لگے - ہندؤں سے کہلوایا گیا کہ اردو رسم خط مسلمانوں کی چیز ہے مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ بھلا ہندی کو تم کیا جانو خبردار اس کے قریب نہ جانا اور اپنے تمدن کو نہ مٹانا - اس کا نتیجہ گو بہت خراب ہوا - لیکن ایک فائدہ ضرور ہوا - کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اردو ہندی میں لاکھ چھپی ہوئی گالیاں دیں لیکن چونکہ دونوں خط بہت کم جانتے ہیں اس لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کی بھی کم نوبت آتی ہے -

ہندی اُردو خطوں کا موازنہ

ایک ہی زبان کے لئے جب سے دو خطوں کا استعمال شروع ہوا تو اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور سنسکرت جاننے والوں نے اردو ہندی

میں ایسے ثقیل الفاظ داخل کرنا شروع کئے کہ ایک ہی زبان دو زبانوں میں تقسیم ہوگئی - اور عام لوگوں کے لئے ان زبانوں کا سمجھنا مشکل ہوگیا - گریرسن نے Linguistic Survey of India V. I. 1. p. 152 میں پنڈتوں کی زبان کی نقل اس طرح انگریزی میں کی ہے کہ ہر ایک اسم کی جگہہ لیٹن ترجمہ دے دیا ہے - یہ عبارت انجیل کی Parable of Prodigal son سے لی گئی ہے -

A certain vir had two filuses. And the junior filuse medio* of them said to his pater "Pater! give me the pars of substantia that falleth to me". And he made divisi unto them of his proprius facultas. And not multus dies after, the junior filuse made omnis substantia collectus, and became peregre profectus into a regio longinquus.

اس کا ہندی ترجمہ محض اس لئے آسان ہے کہ یہ کوئی علمی مضمون نہیں تھا ورنہ یقیناً سمجھ سے باہر ہوجاتا - ملاحظہ ہو -

کسی منش کے دو پُتر تھے - ان میں سب سے چھوٹے نے اپنے پتا سے کہا "سمپت کا وہ بھاگ جو نیہتہ مجھے ملنا چاھئے - مجھے گرھنو کیجئے - اور اُس نے اپنی سمپت کو اُن میں وبھاجھت کر دیا - تھوڑی ہی اوستا میں پتر نے سب کچھ ایکتر کر لیا - اور پردیش کی یاترا کی - وہاں اُس نے اپنی ساری سمپت بلاسِتا کے جیون میں نشٹ کر دی -

---

بلیغ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا :—

ایک شخص کے دو جگر گوشے تھے - پسر خورد نے اپنے پدر بزرگوار سے درخواست کی کہ جائداد کو تقسیم فرما دیجئے - لہذا اُسنے دولت مذکورہ کو

توزیع کردیا - زمانۂ کثیر نہ گذرا تھا کہ پسر مزبور نے متاعِ خویش کو جمع کرکے ملک بعید کا سفر اختیار کیا اور عیاشی میں کل دولت برباد کردی -

اسی سلسلہ میں اردو هندی کا ایک ایک شعر بھی سن لیجئے :—

ایک شاعر کہتا ھے—

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُردیک ساغر غفلت ھے چہ دنیا و چہ دیں

دوسرا فرماتا ھے—

جوگیلی بہوت پیوا چی مستک میں سمرتی سی چھائی
دردن میں آنسو بہ کر وہ آگ برسانے آئی

اگرچہ اس قسم کی زبان لکھنے والے اب بھی موجود ھیں - لیکن خوشی کا مقام ھے کہ ایسی زبان عام طور پر اچھی نہیں سمجھی جاتی - بنگال میں رابندرا ناتھ ٹیگور نے اور ھمارے صوبہ میں شرر اور اکبر کے بعد ھندوستانی اکیڈیمی کے ذریعہ سے آسان زبان کی تحریک جاری ھے - بنارسی پنڈت اور حیدرآباد دکن کے اھل قلم بھی اپنی روش بدل رہے ھیں لیکن با وجود ان سب باتوں کے نہ ھندی لکھنے والے اردو انشا پردازوں سے واقف ھیں اور نہ اردو جاننے والے ھندی لکھکوں سے فائدہ اُٹھاتے ھیں - عام لوگوں کا تو ذکر ھی نہیں میں یہ پوچھتا ھوں کہ خاص لوگوں میں کتنے اصحاب ملینگے جو اردو اور ھندی کے انشا پردازوں سے یکساں دلچسپی لیتے ھوں - اگر وہ تلسی داس ' ملک محمد اور رحیم سے واقف ھیں تو ولی ' میر اور سودا کو نہیں جانتے - اور اگر حسرت ' عزیز ' اقبال فانی اصغر ' جگر ' ابوالکلام ' جیراج پوری اور صدیقی کا نام جانتے ھوں تو پریم چند کو اس لئے بھول گئے ھیں کہ انہوں نے اردو

تحریر کو چھوڑ دیا ہے - اور شمترانندن پنت ' شکل ' سدرشن ' ورما اور بچن ' کا شاید نام بھی نہ سنا ہو حتیٰ کہ ایک ہی شہر کے رہنے والے ایک دوسرے سے نا آشنا ہیں - چنانچہ میرا ذاتی واقعہ یہ ہے کہ چند مہینے ہوئے جبکہ ہندوستان کی مشہور شاعرہ مہیلا ودیا پیٹھ الہ آباد کی ہڈ مسٹرس شریمتی مہادیوی ورما ' شانتی نکیتن تشریف لے گئی تھیں - اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک شہر میں رہنے کے باوجود مجھے ان کا علم نہ تھا - وہیں مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہندی زبان کے چوٹی کے شاعروں میں ہیں اور صرف تحریر کے پردے کی وجہ سے نظر سے اوجھل تھیں -

یہ سب خرابی بیگانگی اور مغائرت اس لئے نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے - "یا گنگا پار بستے ہیں" - یا ایک دوسرے سے پردہ کرتے ہیں - اس بیسویں صدی میں اخبارات اور پریس کی وجہ سے گنگا پار رہنے والے کو دور بسنے والا نہیں کہتے - یہاں ایک شاعر کا قصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - یہ صاحب اکبر مرحوم کے یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے -

کل راہ میں جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

ایک کالج کا شریر طالب علم بھی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا - اُسے ایک دن یہ سوجھی کہ اس نے خود انہیں کا ایک شعر ہندی میں لکھ کے ان کے سامنے پیش کیا - وہ ہندی تو جانتے نہ تھے لیکن دھاک باندھنے کے لئے جھوٹ موٹ پڑھنے لگے - اور یہ رائے ظاہر کی کہ شعر

مہمل ہے - بندش سست ہے - کسی اناڑي شاعر کا ہے - لیکن جب اس نے بلند آواز سے ان کا شعر انہیں سنایا تو وہ بہت خفیف ہوئے اور پردہ کی حقیقت سے واقف ہوئے کہ پردہ عورتوں ہي تک محدود نہیں ہے بلکہ رسم خط کی وجہ سے مرد بھی پردے میں رہتے ہیں -

منشا عرض کرنے کا یہ ہے کہ هندي اور اردو دونوں زبانیں علحدہ کی گئی ہیں - پہلے یہ دونوں زبانیں ایک ہی تھیں - اس علحدگی کی وجہ دو خطوں کا استعمال ہے - جس کی وجہ سے عام فہم الفاظ کی بجائے نا مانوس اور مشکل الفاظ رائج ہوگئے ہیں - اور چونکہ دونوں کو اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتي کہ ایسے الفاظ استعمال کریں جو سادہ ہوں لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود هندي یا اردو کے آسان الفاظ چھوڑ کر اپنا علم یا کم علمی اس طرح دکھائي جاتي ہے کہ تھوس کے لئے جامد - سخت کے لئے شدید - بھاری کے لئے ثقیل اور پانی کے لئے جل - نوٹس کے لئے سوچنا - کپڑے کے لئے وستر - اور اسي طرح کے لفاظ استعمال ہونے لگے ہیں - اگر تحریر یا لکھائي کا یہ پردہ اٹھا دیا جائے تو یقیناً کچھ دنوں میں یہ اختلاف مٹ جائے گا - اور ہم هندوستان کے لئے ایک ملکي زبان پیش کرسکیں گے - چونکہ اس نظریہ (Theory) سے کسي کو اختلاف نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے - لہذا اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے - کہ :—

کس رسم خط کو اختیار کیا جائے؟

قدرتاً هندي لکھنے والے هندي کي تعریف کریں گے - اور کہیں گے هندوستاني زبان کے لئے هندي سے بہتر کوئی خط نہیں ہو سکتا - اس کے وجوہ درجہ ذیل ہیں :—

ا—دیوناگری نہایت مکمل ابجد ہے - اور اس کی ترتیب تحریر علمي (Scientific) ہے - یعنی پہلے لب سے ادا ہونے والے حروف لکھے جاتے

هیں جیسے پا - پھا - با - بھا - ما اس کے بعد دانت سے ادا ہونے والے
جیسے تا تھا - دا - دھا - نا پھر کا - کھا - گا - گھا وغیرہ -

اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے - اگر رومن حروف کی ترتیب بھی اسی طرح کر دی جائے تو وہ بھی مخارج کے اعتبار سے دیوناگری بن جائے گی - اور پھر کسی کو شکایت کا موقع نہوگا - اسی طرح رومن حروف کی آوازیں بھی متعین کی جاسکتی ہیں - یعنی یہ ہوسکتا ہے a کی آواز آ ہی ہو - بخلاف هندی یا اردو کے انگریزی میں a چھہ مختلف طریقوں سے پڑھا جاتا ہے - مثلاً cat, call, animal, face, far, وغیرہ ہیں -

۲— دوسری وجہ یہ ہے کہ دیوناگری رسم میں ہمارے مذهب و اخلاقیات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے - اسی خط میں سنسکرت کی مقدس کتابیں چھاپی جاتی ہیں - اس خط کو چھوڑ کر هم اپنے مذهب اور اخلاقیات سے دور ہو جائیں گے -

اس کا جواب تو نہایت ہی مختصر اور سادہ ہے - کہ ہم آپ سے اس بات کی درخواست نہیں کرتے کہ آپ اپنے مذهب یا اخلاق کو ترک کردیں حتی کہ یہ بھی نہیں کہتے کہ سنسکرت کو چھوڑ دیں - بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنی زبان کو قائم رکھئے صرف تحریر یا لکھائی بدل دیجئے - اس لئے کہ دیوناگری مقدس تحریر نہیں ہے - بلکہ اصلی خط برهمی ہے جو بائیں سے داھنے لکھا جاتا تھا - یا خروشٹھی ہے جو اردو کی طرح داھنے سے بائیں طرف لکھا جاتا تھا - برهمی خط موجودہ دیوناگری خط سے زیادہ سادہ اور آسان ہے - دیوناگری کو سنہ ۱۸۴۹ع میں میکس ملّر (Max Muller) نے بہت کچھہ شش و پنج کے بعد رگ وید کے لئے استعمال کیا تھا - جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ هندوستان میں عام طور پر دیوناگری ہی میں سنسکرت لکھی جانے لگی - حالانکہ پہلے

زمانہ کے ہندو اول تو سروتی کو زبانی ہی یاد رکھنا پسند کرتے تھے اور اسے سمرتی نہیں بنانا چاہتے تھے - لیکن جب مجبوراً مقدس لٹریچر کو لکھا جانا شروع کیا گیا تو اس کے لئے کوئی خاص خط نہیں تھا حتیٰ کہ آجکل بھی سندھ کے ہندو ' گیکری اردو یا فارسی خط میں لکھتے ہیں - اور سندھیا کی کتابیں بھی اردو انچھروں میں لکھتے ہیں -

لہذا میں یہ عرض کرونگا کہ یا تو اُن پنڈتوں کی پیروی کیجئے جو اپنی پرانی چیزوں سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اول تو وہ ویدوں کو لکھنا ہی نہیں چاہتے تھے - لیکن جب کاغذ پر لکھنے کی تجویز پیش کی گئی تو اُنہوں نے بھوج پتر ہی کو ترجیح دی - لیکن جب یہ غضب کیا جانے لگا کہ پرانے رواج کو چھوڑ کر بجائے لکھنے کے پوتر لٹریچر کو چھاپنے کی تجویز پیش ہوئی تو اُنہوں نے اس کی سختی سے مخالفت کی -

بالکل اسی طرح ہندوستان میں سرسید مرحوم نے جب انگریزی پڑھنے کی تحریک شروع کی تو مسلمانوں نے اسے پسند نہیں کیا بلکہ بعض نے تو کفر کا فتویٰ بھی دے دیا - مصر والوں نے جامع ازہر Azhar University میں جغرافیہ کو رائج کرنا چاہا تو وہاں ایک ہنگامہ ہو گیا - اسی طرح شیخ سنوسی نے جب امام مالک کے مسلک میں تھوڑی سی چھان بین کی اور خود اجتہاد کرنا چاہا تو اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جامعہ ازہر کا شیخ Chancellor of Azhar University اُنہیں قتل کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوا - اور اگر وہ طرابلس نہ چلے گئے ہوتے تو معلوم نہیں کیا ہوتا -

ہندی کی کمزوریاں :— جو لوگ دیوناگری رسم خط کی کمزوریوں اور خرابیوں سے واقف ہیں ان میں ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹر جی قابل ذکر ہیں - وہ Journal of the Department of letters vol. 27 (1935) میں لکھتے ہیں کہ ؛—

۱—دیوناگری خط بمقابلہ رومن کے زیادہ پیچیدہ ہے -

۲—اس میں اجزائی Syllabic طرز تحریر ہے - الفبائی (alphabetical) خط نہیں - یعنی اس کے حروف میں آخری میں آ یا زبر لگا ہوا ہے مثلاً منو لکھنا ہو تو U N A M الگ الگ ہندی میں نہیں لکھ سکتے- یا شیکسپیر لکھنا ہو تو "شے- کسا پی - یا - را" ہو جاتا ہے اور ہر برت "ہا - وبا - رتا" پڑھا جاتا ہے -

۳—تیسرے یہ کہ الفبائی تحریر نہونے کی وجہ سے مخلوط حروف کا استعمال کیا جاتا ہے - جس سے نہ صرف آنکھ پر برا اثر پڑتا ہے بلکہ اس قسم کے باریک نوک پلک کا ٹائپ مشکل سے بنتا ہے اور جلد خراب ہو جاتا ہے - (مثلاً رتسنا - کشوا شلنتر وغیرہ) -

۴—ان تین خرابیوں پر میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ دیوناگری لکھنے میں بھی بہت مشکل ہے اس لئے کہ رومن کی طرح اس کی کشش ہمیشہ بائیں سے داھنی طرف نہیں ہوتی بلکہ اکثر داھنے سے بائیں طرف بھی قلم کو گھمانا پڑتا ہے -

۵—ماتروں کی خرابی کی وجہ سے لکھی ہوئی چیز کا پڑھنا خود لکھنے والے کے لئے مشکل ہوجاتا ہے - میرے خیال میں تو یہ قصہ سچا ہے کہ دلّی میں محض اس تحریر کی وجہ سے ایک دفعہ ماتم بپا ہوگیا - بچارے مہاجن نے " لالہ آجمیر گئے - بڑی بہی کو بھیج دو " کی بجائے یہ پڑھ لیا کہ " لالہ آج مر گئے - بڑی بہو کو بھیج دو " -

اردو رسم خط

اب ذرا اردو خط کی طرف توجہ فرمائیے -

اردو خط کے حامی بھی دیوناگری والوں سے پیچھے نہ رہینگے - وہ کہیں گے کہ :—

۱—اس خط کی پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ اجزائی Syllabic نہیں ہے بلکہ الفبائی ہے -

۲—اس میں لمبے حروف علت کے لئے الف - واؤ اور یا کا استعمال ہوتا ہے اور چھوٹے حروف علت (Short Vowels) کے لئے زبر ، زیر ، پیش کی علامتیں ہیں - ساکن اور مشدد حروف کے لئے بھی علامتیں ہیں - جن کا یہ فائدہ ہے - جو شخص لکھنا سیکھ جاتا ہے اسے ابتدا میں تو کچھ دقت ضرور ہوتی ہے لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد حرکات (Short Vowels) کے لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی اور جو تحریر دنیا کی کسی زبان میں ایک صفحے میں لکھی جائیگی وہ اردو میں صرف نصف یا اس سے بھی کم جگہ میں لکھ سکتے ہیں -

اس کا جواب یہ ہوگا - کہ جس چیز کو آپ اچھا کہتے ہیں یعنی حرکات (Short Vowels) ان کے لکھنے اور چھاپنے میں اکثر دقت کا سامنا ہوتا ہے - اور اگر حرکات کو چھوڑ دیجئے تو جو لوگ زبان پوری طور پر نہیں جانتے وہ اکثر ان الفاظ کو صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے - مثلاً ب ن کو بَن بِن بُن اور ک ر م کو کَرم کرم کِرم اور کُرم بھی پڑھ سکتے ہیں - صرف وہ لوگ جو زبان کے پورے ماہر ہیں سیاق عبارت یا Context سے ایسے الفاظ کو پڑھتے ہیں -

اس کی مختصر نویسی ضرور قابل تعریف ہے لیکن اس میں یہ خرابی ہے کہ ایک ہی حرف پانچ پانچ چھ چھ طریقوں سے لکھا جاتا ہے - اور بچوں کو حروف پہچاننے میں مہینوں لگ جاتے ہیں -

۳—اردو کی تیسری خوبی یہ بتائی جا سکتی ہے کہ اس خط میں اسلامی معلومات کا بہت کافی ذخیرہ ہے - لیکن مسلمانوں

کے لئے رسم خط مذہبی چیز نہیں ہے - قرآن خود خط نسخ میں لکھا گیا تھا - جسے مسلمانوں نے اتنی ترقی دی یا اتنا بدلا کہ اب اس خط کے پڑھنے والے مشکل سے ملیں گے - اس کے علاوہ چونکہ مصوری کو مذہباً حرام سمجھ لیا گیا تھا لہذا نقاشی اور خطاطی میں اتنا کمال حاصل کیا گیا کہ نسخ کے بجائے ایک درجن سے زیادہ خط ایجاد ہوگئے ' جس میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت نستعلیق کی ہے - لیکن سوائے ہندوستان کے اور کسی ملک میں یہ خط رائج نہیں ہے - مولانا ابولکلام ' جامعہ ملیہ ' علی گڈہ انسٹیٹیوٹ پریس اور انجمن ترقی اردو نے عملاً نستعلیق کے خلاف جہاد شروع کردیا ہے - یہ سب چھاپے کی آسانی کے خیال سے سیسے کے ٹائپ کا عربی خط رائج کرنا چاہتے ہیں - ان کا منشا غالباً یہ ہے کہ عام طور پر ممالک اسلامیہ میں جو ٹائپ استعمال ہوتا ہے وہی زیادہ اچھا اور آسان ہے اور لیتھوگرافی میں نہ صرف وقت ' روپیہ اور محنت کا زیادہ صرف ہے بلکہ چھپائی کا نتیجہ اکثر خراب ہوتا ہے - لہذا جہاں تک حروف کے لکھنے کا تعلق ہے ہندوستان کے مسلمانوں کو نستعلیق اس لئے ناپسند ہے کہ اس میں چھپائی مشکل ہے -

اب ترتیب حروف پر غور کیجئے تو بھی یہی نتیجہ نکلے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا ترتیب حروف سے کوئی تعلق نہیں - آج سے پانچ سو سال پہلے حافظ جلال‌الدین سیوطی نے (878. A. H.) کعب بن اخبار کے حوالے سے اتقان میں لکھا ہے - کہ سب سے پہلے جس نے عربی سریانی اور دوسرے خطوں کی ایجاد کی وہ آدم تھے - انہوں نے اپنی موت سے پہلے تین سو کتابیں گیلی مٹی پر لکھیں پھر ان کو آگ میں پکایا - پھر طوفان نوح آیا اور زمین میں غرق ہو گئی لیکن طوفان کے

بعد مختلف قوموں کو مختلف کتابیں ملیں اور حضرت اسمعیل کو عربی کتاب ملی - اس طرح عرب میں عربی خط رائج ہو گیا -

البلاذری کا قول ہے کہ عربی خط شاہان لخم کے زمانے میں ایجاد ہوا - ابن خلدون اور ابن خَلّکان اسی کی پیروی کرتے ہیں - الندیم (صاحب‌الفہرست) کہتا ہے کہ عربی سب سے پہلے ابوجاد ہواز حطی ' کلمون ' صعفص ' قریسات نے لکھی - یہ مدائن کے بادشاہوں کے نام ہیں (مدائن وہی ملک ہے جہاں نبطی لکھی جاتي ہے) -

(مراکش) مغربی الفابت - قدیم نبطی اور جدید عربی حروف میں بہت مشابہت ہے - یہ سنہ ۳۰۰ ھ سے زیادہ پرانی نہیں ہے - وہو هذا—

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز ط ظ ک ل م ن ص ض ع غ ف ق س ش ہ و ي لا -

ابن عباس سے ایک روایت ہے :—

کہ " سب سے پہلی تحریر جو اللہ نے نازل کی وہ ابو جاد تھی " -

لیکن سب جانتے ہیں کہ اگرچہ یونانی اور انگریزی زبان میں ابجد ہی کی ترتیب پر Alpha ' Beta ' Gamma ' Delta ' کلمن کے بجائے Kappa ' Lambda ' Mu ' Nu وغیرہ ابتک رائج ہے - لیکن عربی میں بجائے ابجد کے الف ' با ' تا ' ثا ہو گیا - فارسی میں پ چ ژ گ کا اضافہ ہو گیا اور اردو میں ٹ ' ڈ ' ڑ کے علاوہ ہائے ہوز سے ملکر جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی شامل ہوگئیں مثلاً بھا - پھا - کھا ' ڈھا ' ٹھا وغیرہ -

اب اگر کوئی نہ جاننے والا یہ سمجھے کہ اردو حروف کی ترتیب وہی ہے جو عربی کی ہے تو یہ اس کی غلطی ہے اس لئے کہ خود عربی کی بھی کوئی مقررہ ترتیب نہیں ہے - اور مغرب (یعنی مراکش وغیرہ) میں تو صدیوں سے مختلف ترتیب رائج ہے - اور یہ اتنا وسیع علم بن گیا

ہے کہ عربی کی صرف ایک کتاب صبح الاعشی انسائکلو پیڈیا برٹانکا کے برابر ہے -

۴ـــاردو خط کی چوتھی خوبی یہہ ہے - اور یہہ واقعی خوبی ہے - کہ نستعلیق کا تعلق صرف لکھنے سے ہے - اس کا ٹائپ نہیں بن سکتا - اور اگر بنایا بھی جائے - جیسا کہ حیدرآباد والوں نے بنایا ہے - تو اُسمیں اتنے جوڑ ملانے پڑینگے کہ خدا یاد آ جائیگا - انگریزی ٹائپ کیس میں ۱۵۲ خانہ ہیں - بنگالی میں ۵۵۴ خانہ ہیں جو نا کافی سمجھے جاتے ہیں - دیوناگری میں ۷۰۶ خانہ ہیں اور ان میں بھی ترقی کی ضرورت ہے -

نستعلیق کی یہہ خوبی کیوں سمجھی جاتی ہے - محض اس لئے کہ یہہ ایسا خط ہے جس سے فن خوشنویسی یا آرٹ آف caligraphy باقی ہے - موجودہ مشینوں کے زمانہ میں جس طرح تار کشی کا کام مشین سے نہیں ہو سکتا اور بنارس کی صنعت زر بافی قائم ہے اسی طرح ٹائپ نہ بن سکنے یا اس میں بہت زیادہ دقت پیدا ہوجانے کی وجہہ سے یہہ فن بھی زندہ ہے اور ہزاروں کاتبوں خوشنویسوں اور پتھر بنانے والوں کی روزی کا ذریعہ ہے -

لیکن وہ لوگ جو علوم و فنون میں تیزی سے قدم بڑھانا چاہتے ہیں اُن کی رائے میں نستعلیق ہی کو چھوڑ دینا ضروری ہے - اور جب آپ اس پر تیار ہیں تو کیا وجہ ہے کہ بالکل ہی اس خط کو نہ چھوڑ دیجئے اور رومن خط اختیار کر لیجئے -

اردو خط کی کمزوریاں

اردو خط کی چند خرابیاں اور کمزوریاں اوپر درج کی جا چکی ہیں - لیکن ڈاکٹر چٹرجی کی رائے میں دو خرابیاں ہیں -

۱۔۔۔اول یہہ کہ یہہ تحریر جب غیر عربی زبانوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے تو بالکل ناکافی ثابت ہوتی ہے - یہہ بالکل سچ ہے - اس لئے کہ وہ عربی فارسی خط کے متعلق لکھہ رہے ہیں - لیکن اگر اردو خط کے متعلق وہ غور فرمائیں تو اُنھیں معلوم ہوگا کہ اس میں نہ صرف فارسی عربی کے وہ حروف ہیں جو ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کی زبانوں کے بھی تقریباً سب حروف موجود ہیں - اور اگر اس زبان کی یہہ خرابی ہے تو یہی خرابی رومن میں بھی پیدا ہوگی -

۲۔۔۔دوسری خرابی یہہ ہے کہ بہت سے حروف ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ ہیں اور صرف نقطوں سے پہچانے جاتے ہیں - یہہ بیشک بہت بڑی خرابی ہے اور مشابہ حروف کو پڑھنے میں سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے - لیکن سب سے بڑی مصیبت جو اُن نقطوں کی وجہہ سے مسلمانوں پر نازل ہوئی اُس کے متعلق یہہ روایت بیان کی جاتی کہ حضرت عثمان خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں جب مصر کے بلوائیوں کو مصر واپس کیا گیا تو انھیں راستہ میں ایک ناقہ سوار ملا جس کے پاس ایک خط برآمد ہوا جس میں نئے گورنر مصر کے متعلق فاقبلوہ کی جگہہ فاقتلوہ لکھا ہوا تھا - یعنی بجائے اس کے کہ وہ قبول کیا جائے اُس کو قتل کر دینے کا حکم تھا - بہر حال ایک نقطہ کے ہیر پھیر سے جو تلوار مسلمانوں میں چلی اُس کا اثر یہہ ہوا کہ کئی مستقل جماعتیں بن گئیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنا برا نہیں سمجھتی تھیں - خدا بھلا کرے اتاترک مصطفیٰ کمال کا کہ اُس نے حمداللہ صبحی بے سابق وزیر تعلیمات کے مشورہ پر عمل کیا (اور با وجود بیرونی ممالک کی مخالفت کے) لیٹن خط کو ترکی میں رائج کر دیا - اس کا

پھر اثر ہوا کہ ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی نے بھی فارسی تحریر کو لیٹن خط میں تبدیل کرنے کا اعلان کر دیا ہے -

باوجودیکہ نقطوں نے اتنی خرابیاں پیدا کی ہیں لیکن اس کی حمایت میں اب بھی کچھہ لوگ ملیں گے - مثلاً مذہب کے ماننے والے نقطہ کے سخت حامی ہیں - اس مذہب کے بانی کا نام مرزا علی محمد اور لقب باب تھا - کچھہ عرصہ بعد باب کو چھوڑ کر اُنھوں نے نقطہ کا لقب اختیار کر لیا - اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک ضعیف حدیث ہے جو حضرت علی سے منسوب کی جاتی ہے کہ اُنھوں نے فرمایا - کہ جو کچھہ قرآن میں ہے اُس کا نچوڑ سورۂ فاتحہ میں ہے - سورۂ فاتحہ کا عطر بسم اللہ الرحمن الرحیم میں ہے اور بسم اللہ کا پورا مفہوم ب میں ہے - اور آخرکار سب کچھہ ب کے نقطہ میں ہے -

نقطوں کے متعلق دو قصے مجھے بھی معلوم ہیں ایک تو پولیس آفسر کا قصہ کہ اُس نے رپٹ اول (first information report) میں چوری کو چھری میں تبدیل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے آلۂ دھاردار کے صرف معمولی مارپیٹ کا مقدمہ رہ گیا - دوسرا قصہ علی گڑہ کالج کے زمانۂ طالب علمی کا ہے جب امداد حسین خان صاحب بریلوی کو ریلوے پارسل کے ذریعہ سے اُن کے ایک دوست نے پیڑے روانہ کئے - لیکن اُنھوں نے پیڑے کو بتھیرے پڑھا - اور یہ سمجھہ کر کہ اتنے دن میں بتھیر مرگئے ہونگے - وہ ریلوے رسید یاران طریقت کے حوالہ کردی - جنھوں نے پارسل منگوا کر خوب مزے لے لے کر پیڑے کھائے لیکن اتنی عنایت کی کہ امداد حسین خانصاحب کو بھی اس میں شریک کر لیا - اسی طرح بعض لوگ حضور کو حصلور اور سند متروک کو سہد مروک پڑہ سکتے ہیں -

پوشک بھاشا یا امدادی (معاون) زبان
(Feeding Language)

اردو ہندی خطوں کی بھلائی برائی دیکھنے کے بعد آخری چیز یہ باقی رہ جاتی ہے کہ جب ہم فلسفہ، مذہب تاریخ اور ادبیات کے لئے علمی الفاظ کا استعمال کرنا چاہتے ہیں؛ تو یہ مشکل ہوتی ہے کہ عام بول چال میں وہ الفاظ یا اصطلاحیں نہیں ملتیں - مجبوراً کسی دوسری زبان سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے - جو لوگ سنسکرت جانتے ہیں وہ سنسکرت سے مدد لیتے ہیں - جو لوگ عربی جانتے وہ عربی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں - جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ہماری علمی زبان دو رنگی ہو جاتی ہے - لہذا اگر رومن خط اختیار بھی کر لیا جائے تو اس پردہ کو کیسے اُٹھایا جائے گا -

لیکن اس سے پہلے کہ ہم پوشک بھاشا یا امدادی زبان کی تلاش کریں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کن کن علوم و فنون کے لئے ہمیں نئی اصطلاحیں بنانے کی ضرورت ہے :—

علوم کی تقسیم

موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے ہم سب علموں اور فنون کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں - ایک عملی (Practical) دوسرے نظری (Theoritical) -

۱—عملی شاخ میں ہر قسم کی سائنسیں داخل ہیں مثلاً فزکس، کیمسٹری، ریاضی، بوتانی، جانوریات، ہوا بازی، کھیتی اور ان سے جو صنعتیں پیدا ہوتی ہیں مثلاً مشین سازی، انجنئری، شکر سازی، کاغذ سازی وغیرہ حتیٰ کہ اکنامکس کا وہ پہلو جو ہماری عملی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور تجارت، مہاجنی اور صرافہ سے تعلق رکھتا ہے وہ بھی

اسی شاخ میں شامل ہے - اور موسیقی ' مصوری وغیرہ بھی اسی م
داخل ہیں -

۲ـــنظری شاخ میں مذہب ' فلسفہ ' تاریخ ' اور ادبیات کا شہ
ہو سکتا ہے -

میں یہ عرض کروں گا ' کہ دنیا کے کار بار کے لئے اور ہماری روزہ
زندگی کے لئے زیادہ تر عملی علوم کی ضرورت ہوتی ہے - ان میں سے اک
چیزیں اپنی مستقل اصطلاحیں رکھتی ہیں - جن کے لئے ہمیں نئ
اصطلاحیں بنانے کی ضرورت نہیں - کسان ' راج ' بڑھئی ' ملیہار ' لوہا
باغبان سب کی ایک زبان ہے - انجنئری اور مشین سازی کے متعل
آپ لاکھ اصطلاحیں بنائے لیکن جو اس فن کے ماہر ہیں گے وہ
آپ کو ماننا پڑے گا - ابتدا میں موٹر کو ہوا گاڑی اور بائسک
کو پیر گاڑی کہتے تھے لیکن پھر یہ اصطلاحیں منسوخ ہوگئیں
کلچ ' کاربریٹر ' ڈائنامو ' بیٹری ' اُورھال ' ٹیوب ٹائر ' سپوک رنچ
بولٹو وغیرہ کے لئے الفاظ مل سکتے ہیں - مگر بازار کا آدمی ا
لوگوں کی پروا نہیں کرتا جو فلسفہ کی عینک سے عملی دنیا پر نظ
ڈالتے ہیں - اسی طرح وہ سائنٹسٹ ہماری بنائی ہوئی اصطلاحوں ؛
سننا بھی پسند نہیں کرتا جسے روزانہ اُن نئی نئی بین‌الاقوامی
(International) اصطلاحوں اور ایجادوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ہماری زبا
میں پانچ سال کے بعد ترجمہ ہوکر چھاپی جاتی ہیں- حالانکہ اس درمیا
میں اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ خود وہ نظریہ Theory یا تو بدل جاتا
ہے ' اور ہماری ترجمہ کی ہوئی کتاب سانپ کے منھ کی چھچھوندر ہوک
رہ جاتی ہے - لہذا ہم مجبور ہیں کہ بین‌الاقوامی یا International
اصطلاحوں کو استعمال کریں - اسی طرح فنون لطیفہ (Fine Arts) کی

اصطلاحیں زبان اور خط بھی بین‌الاقوامی یا International ھے - اس کے ترجمہ کی نہ ضرورت ھے ' نہ ترجمہ کسی کام آ سکتا ھے -

اب ذرا نظری شاخ کی طرف توجہ فرمائیے - اس میں دو چیزوں یعنی مذھب و فلسفہ کے متعلق میری یہ رائے ھے کہ ان کے لئے اصطلاحوں کی ضرورت نہیں خود ھر ایک مذھب و فلسفہ اپنی اپنی اصطلاحیں رکھتا ھے صرف ان کے ترجمہ کا سوال ھے - لہذا اگر آپ اپنا مذھب یا فلسفہ کسی کو سمجھانا چاھیں گے تو مجبوراً آپ اُسی زبان میں سمجھائیں گے جس کو وہ سمجھتا ھو - آپ کو اختیار ھے کہ انگریز یا جرمن سے یا سنسکرت میں بات کریں یا عربی میں - تھوڑی دیر کے بعد آپ کو خود معلوم ھوجائے گا کہ وہ آپ کی زبان نہیں سمجھتا - اب صرف تاریخ اور ادبیات کے متعلق غور کرنا باقی رہ جاتا ھے لہذا کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ھم عربی اور سنسکرت پر سرسری نظر ڈالتے ھیں -

عربی

ڈاکٹر تار پور والا اپنی کتاب Elements of Science of Language کے صفحہ ۱۱۲ میں لکھتے ھیں کہ " انڈو ایرین خاندان کے بعد جس زبان نے سب سے زیادہ ترقی کی ھے وہ سامی خاندان ھے - ان زبانوں کے بولنے والوں کے پاس عظیم‌الشان سلطنتیں تھیں - اور انہوں نے دنیا کا نہایت عمدہ مذھبی لٹریچر پیدا کیا ھے - سوائے ھندوستان اور چین کے ان زبانوں نے دنیا کی بہت زیادہ قوموں کو ابجد اور لکھنے کا فن بتایا ھے - اور محققین کا یہ قطعی فیصلہ ھے کہ ھندوستان کی سب سے پرانی ابجد یعنی برھمی بھی سامی زبانوں سے نکلی ھے " -

تکیر کہتا ھے " کہ سامی زبانوں کی یہ خوبی ھے کہ حروف اصلی (consonants) سے لفظ کے معنی معلوم ھوتے ھیں اور اعراب (vowels) یا

حروف علت سے اُس لفظ کی نحوی حالت (Syntax) معلوم ہوتی ھے - اسی وجہ سے یہ زبانیں ہزارہا سال سے اپنی اصلی حالت پر قائم ھیں اور لکھنے میں بھی بہت کم جگہ کی ضرورت پڑتی ھے " - (Tucker op. cit. p. 165)

عموماً عربی میں مادہ سہ حرفی ہوتا ھے اور ان ھی تین حرفوں کے ھیر پھیر یا گردان سے بہت سے معنی پیدا ہو جاتے ہیں - بخلاف دوسری زبانوں کے اس میں مرکبات حقیقی بھی نہیں ھیں صرف ترکیب سے مرکبات توصیفی و اضافی وغیرہ بنتے ھیں - اس زبان کی مزید خوبی یہ ھے کہ عرب سے باہر جن ملکوں میں گئی وہاں اتنی چھائی کہ ملکی زبان ہوگئی - مثال کے طور عراق ' شام ' فلسطین ' شرق اردن ' مصر ' طرابلس ' تونس ' الجزائر اور مراکش میں بالکل عربی رائج ھے - اور زندہ زبان ھے -

جہاں انڈو ایرین زبانیں رائج ھیں وہاں عربی کے متعلق یہ دقت محسوس کی جاتی ھے کہ اس میں واحد اور جمع کے علاوہ تثنیہ یا Dual بھی ھے اس کے علاوہ تذکیر و تانیث Gender میں بھی کسی قدر دقت ھے -

اگرچہ " عربی[1] خط رومن خط کے بعد جغرافی وسعت کے اعتبار سے دنیا میں اول درجہ رکھتا ھے - چین کی مغربی سرحد سے شمالی افریقہ کے مغربی ساحل تک اور قسطنطنیہ سے جزائر ملایا تک یہ خط پھیلا ہوا ھے - دنیا کے باقی حصوں میں بھی اسے جانتے ھیں اور اس کا کم و بیش استعمال کیا جاتا ھے " -

ہندوستان میں عربی کے رواج سے ایک نئی خرابی پیدا ہوگئی ھے - اور یہ خرابی ہر ملک میں رائج ہوتی ھے جہاں نئی زبان رائج کی

---

[1]—Houtsma : Encylcopaedia of Islam Vol. p. 381 -

جاتی ہے - وہ یہ ہے کہ اکثر عربی الفاظ کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے - مثلاً ترکیب کے معنی چالاکی - حضرت کے معنی بدمعاش - جن کے معنی بھوت - زحمت کے معنی تکلیف اور خود تکلیف کے معنی بدل گئے ہیں - ان وجوہ کی بنا پر قرآن کے اتنے غلط ترجمے ہوگئے کہ مذہب ہی بدل گیا - اور جو لوگ زبان کے ماہر تھے اُنھیں غریب‌القران کی تشریح کرنی پڑی -

اسی لئے میں عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں پرانی مثل ہے کہ نیم ملا خطرۂ ایمان نیم حکیم خطرۂ جان - ایسی غلط عربی استعمال کرنے سے بہت بہتر ہوگا اگر ہم قطعی نئے الفاظ عربی سے نہ لیں - البتہ جو الفاظ رائج ہوگئے ہیں اور جو اپنے معنی بدل چکے ہیں اُن کے لئے مجبوری ہے - مسلمانوں کے لئے سب زبانیں مقدس ہیں - اس لئے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ہر قوم میں ایک رسول ضرور بھیجا گیا ہے اور سب آدم کی اولاد ہیں -

سنسکرت

اب تھوڑا سا سنسکرت کا حال سن لیجئے - پنڈتوں کے عقیدہ کے مطابق صرف سنسکرت دیوبانی یا خدا کی زبان ہے - لیکن اُن ہی کے عقیدے کے مطابق کسی مقدس تحریر کو لکھنا نہ چاہئے - بہر حال سنسکرت لکھی جاتی ہے - لیکن ہر قسم کے خط میں لکھی جاتی ہے - چند روز سے دیوناگری عام طور پر اس کے لئے مخصوص ہوگئی ہے اس زبان میں عربی کی طرح تثنیہ یا Duel form of verb ہوتا ہے - جو اب کسی انڈو ایرین زبان میں رائج نہیں -

ڈاکٹر تارپور والا (صفحہ ۲۵) لکھتے ہیں کہ سنسکرت ہندوستان کی زبان صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ پانی‌نی کی تمام گرامریں غرقاب کردی جائیں - یہی رائے گوند شاستری پردیسی کی بھی ہے - ان کی مزید رائے یہ بھی ہے " کہ سب پنڈتوں کو جلا وطن کر دیا جائے"

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ زبان بڑی دوسرے جانداروں کی طرح بڑھتی رہتی ہے - لیکن پانی نی نے اس کی ترقی کو روک دیا اور سنسکرت کو ٹھوس قوانین کا پابند کرکے مردہ بنا دیا ہے - اور اس میں تبدیلی کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں رہی - قدیم زمانہ کے برہمنوں نے اس کی اتنی حفاظت کی کہ عام لوگوں سے اِس زبان میں بولنا پاپ سمجھے - جس طرح وہ خود اچھوت تھے یعنی اُنہیں کوئی چھونے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا - اسی طرح اپنی زبان کو بھی اچھوت بناکر مار ڈالا - اس بیسویں صدی کی یہ کرامت ہے کہ اب برہمن اچھوت نہیں رہے بلکہ غریب آدمی اچھوت سمجھے جاتے ہیں -

موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کا تجربہ اسپرانٹو کے متعلق ہو چکا ہے - اس کے موجد ڈاکٹر زامن ہاف (Dr. Zamenhof) نے سولہ نہ بدلنے والے اصول بنائے تھے - ترقی اور زندگی کے لئے ایک اصول کو بدلنے کی ضرورت ہوئی - انہوں نے بدلا اور آخر کار ایک نئی زبان آیڈو (Ido) ایجاد ہوگئی -

لہذا سنسکرت کو دوبارہ زندہ کرنا اگر ضروری ہے تو ضرور کیا جائے - لیکن اس میں پرشک بھاشا یا امدادی زبان بننے کی صلاحیت نہیں ہے -

مذہب بنائے فساد نہیں ہو سکتا

ڈاکٹر چٹرجی (صفحہ ۱۳۷) کا خیال ہے کہ '' بد قسمتی سے عربی فارسی رسم خط ایک ایسے مذہب اور تمدن کا نشان بن گیا ہے جو ہندو مذہب کی ہر چیز کے خلاف سمجھا جاتا ہے " میری رائے میں علمی مباحث میں مذہب کی آڑ پکڑنا سخت نادانی ہے اگر ہندو اتنے ہی تنگ نظر ہوتے تو ہرگز پدماوتی کے نمونہ پر تلسی داس اپنی رامائن نہ لکھتے - نہ نور محمد ہندی میں اندراوتی تصنیف کرتے - کبیر ' کمال

وجہ اور دادو کو ہندو اپنا ہم مذہب سمجھتے ہیں - اور ان کے خیالات کو ترقی دینے میں ہندو ہی پیش پیش ہیں - خود فارسی میں ہندوؤں نے اچھے اچھے ادیب اور شاعر پیدا کئے ہیں - حتیٰ کہ سلطنت مغلیہ کے دفاتر پر انہیں کا قبضہ تھا - اردو کو ہندو مسلمان دونوں اپنی زبان سمجھتے ہیں - اور ہندو مسلمان دونوں اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہر ایک اچھی چیز کو اپنے ملک میں رایج کریں خواہ وہ ان کے رسمی اور روایتی مذہب میں ہو یا نہ ہو -

ہندستان کے باہر عراق و مصر اور جنوبی افریقہ میں ہندو مسلمانوں میں کوئی مذہبی جھگڑا نہیں ہے - خود مسلمانوں کی عقلوں پر جو پردہ پڑ گیا تھا وہ دور ہو گیا ہے - حتیٰ کہ ایک دوسرے کو برا کہنے پر اب لڑائی نہیں ہے - بلکہ جھگڑا اس قسم کا ہے کہ حضرت زر تشت ترک تھے یا ایرانی - دونوں قومیں ان پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں -

واقعہ یہ ہے کہ ترکوں نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت زر تشت پیغمبر ایران کہن در حقیقت ترک ہیں - بھلا ایرانی نوجوان یہ سننا کب گوارا کر سکتے تھے - لہذا میرزادہ عشقی شاعر ایران نے استنبول میں ترکوں کو وہ ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ سننے سے تعلق رکھتا ہے -

خود ہندوستان میں گوتم بدھ کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ خدا کے قائل تھے - اور بدھ گیا پر ہندو اور بدھ دونوں اپنا حق جتا رہے ہیں - اگر مسلمانوں کو بھی موقع ملے تو وہ بھی اپنا دعویٰ پیش کرنے کو تیار ہو جائیں -

حالانکہ ایک دور ایسا بھی گزر چکا ہے جب مسلمان حرف حرف نقطہ نقطہ پر لڑائی جاتے تھے - ایک محقق نے کہا حرف ضاد (دواد)

ھے دوسرے محقق نے کہا نہیں یہ (زاد) ھے - جھگڑا بڑھا - دونوں عرب گئے معلوم ہوا کہ پہلا محقق سچا تھا اسلیے کہ عرب میں (داد) بولا جاتا ھے - اور آخر کار موجودہ زمانہ کی تحقیق نے بھی اسے بالکل صاف کر دیا کہ (داد) دوسری زبانوں میں بھی ھے - مثلاً ارض کے لئے جرمن اردے Erde انگریزی Earthen - مرض کے لئے فرنچ Malade (مالاد) انگریزی Malady وغیرہ ہیں - اسی طرح خود ہندستانی اکیڈیمی میں ایک لفظ کے متعلق اسی قسم کا معاملہ اخبارات تک پہونچ چکا ھے -

نتیجہ

غرض کہ ہمیں بھی وہی کرنا چاھئے جس میں آسانی ہو - علم کی ترقی اور اختلاف کم ہو - عربوں نے جب یونانی سے عربی میں ترجمہ کئے تو سیکڑوں الفاظ بجنسہ عربی میں داخل کر لئے - مثلاً جغرافیہ (Geography) ' تلغراف (Telegraph) ' غاز (Gas) ' سیجارہ (Cigar) اس کی جمع تک سجائر بنالی ھے - حتیٰ کہ ناموں تک پر عربی زبان قبضہ کر لیتی ھے مثلاً Euclid ' سے اقلیدس Montague سے منتاغو وغیرہ - اسی طرح سائنسوں کے لئے ہمیں بین‌الاقوامی اصطلاحیں لے لینا چاھئے - ترجمہ نہ کرنا چاھئے اس طرح ہمارا آدھے سے زیادہ لٹریچر (یعنی Sciences) زندہ قوموں کے دوش بدوش چلے گا - رہ گیا مذہب و فلسفہ اس کے لئے نہ خط بدلنے کی ضرورت ھے نہ زبان ' تاریخ اور ادبیات کے لفظ کو روزمرہ کی بول چال میں لکھنا چاھئے -

اور جتنے الفاظ عربی یا سنسکرت کے آگئے ہیں اور ہندستانی بن گئے ہیں اُن کے علاوہ نئے لفظ ہرگز نہ داخل کرنا چاھئے - البتہ اگر سخت ضرورت ہو تو -

فارسی سے مدد لینی چاہئے

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ایرانی اور سنسکرت سگی بہنیں ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ سنسکرت ذرا مرگئی ہے اور ایرانی نے ترقی کرکے موجودہ فارسی کی شکل اختیار کرلی ہے - اگر آپ اوستا کے ایک ۲ تہا کا سنسکرت گیت میں ترجمہ کریں صرف "ہ" اور "س" کا فرق ز - ج معلوم ہوتا ہے - مثلاً :

اوستا = ہا وَ نِم آ وَ تِوم آ — بوقت صبح صادق -

سنسکرت = سا وَنِم آ دِ تو آ

اوستا = ہؤ مو اُ پَئیت زَ راتُھسَترَم — ہوما زردشت کے پاس آیا -

سنسکرت = سُو مو اُ پَئیت جَسرا راتُھسَترم

اوستا = آ تِرِم پَھسری یو ز دَ تِھلتَم — جو آگ کے ارد گرد صفائی کر رہا تھا -

س = آ تِرِم پَھسری یو س دَ دَھلتَم

اوستا = گا تھا س چا سَرا وَ یَلستم — اور گاتھا سرائی کر رہا تھا -

س = گا تھا س چا آپی وَ یَنستم

اوستا = آ دِ م پِرِسات (ز رَا تھشترو) - کو نَرے اَ ھی ؟ — اس سے پوچھا زرتشت نے تو کون ہے ؟

س = اَ تَم پرِ پچھات (جسرا تھشترہ) کو نَر اَ سی ؛

اوستا = یم آ زِم وِ شہاہِ آنگھِلُش — جسے میں دیکھتا ہوں -

س = یَم آ ھَم وِ شوآسیھہ آسُوہ

اوستا = اَست وَ تو سَوَ نِشتِم دَ دَ وِ شا ـــ کل دنیا سے زیادہ شاندار -

س = اَستھی وَ تَہ شرِ شتّھم دَ دَ وَ شا

یہ تو اوستا کی مثال تھی - فارسی کے متعلق غور کیجئے کہ تو ہزاروں الفاظ بالکل سنسکرت کے مشابہ ملیں گے صرف تلفظ کا فرق ہوگا - لہذا - نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ :ـــ

۱ـــایران آریوں کا پرانا آریہ ورت ہے -

۲ـــایران کا پارسی مذہب اور ہندو دھرم ایک ہی سر چشمہ سے نکلے ہیں - اور مسلمانوں کی آمد سے پہلے کشمیر ' پنجاب اور گجرات تک میں ایرانی آبادیاں قائم ہو چکی تھیں - انہیں سکادیپیہ برہمن کہا جاتا تھا - اور باوجودیکہ سورج اور اگنی کی پوجا کرتے تھے - لیکن یہاں کے ہندوؤں میں ایسا مل جل گئے تھے کہ بالکل ہندی ہو گئے تھے -

(Cambride History of India Vol. I)

۳ـــایران سے ہندو مسلم تمدن کی بنیاد پڑی ہے اور دونوں قومیں فارسی زبان کو عرصہ تک استعمال کر چکی ہیں -

۴ـــفارسی زبان میں تثنیہ (Dual) نہیں ہے - نہ اس میں تذکیرو تانیث (Gender) کی دقت ہے لہذا یہ موجودہ ہندوستان کی زبانوں سے بمقابلہ سنسکرت کے زیادہ قریب ہے - اور اس کی گرامر دنیا کی تمام انڈو ایرین زبانوں سے زیادہ سادہ اور نیچرل ہے یہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ یہ بہترین زبان ہے - اور بغیر دوسری زبانوں کی مدد کے ' خالص سنسکرت سے ترقی کر کے اس درجہ پر پہنچی ہے -

فارسی کے جو الفاظ سنسکرت سے الگ نظر آتے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ بولی کی تبدیلیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ انسان قدرتاً مشکل الفاظ

کو آسان بنا لیتا ہے - مثلاً اوستا (وفر) سے برف بن گیا پنجابی کیچو اور چاقو سے چیکڑ اور کاچو ہوگیا انگریزی (سکول اور سٹیشن) سے اسکول اور اسٹیشن بن گیا ' جانور سے جناور ہو گیا فارسی شرم ماندہ سے شرمندہ - زود تر سے زو تر آب آوند سے آوند - پیہن نائے سے پیہنا - یک گانہ سے یگانہ بن گیا -

ہندی جیبھہ انگ سے زبان پھر زَبان ہو گیا - تن کاکا سے تلکا بن گیا - خورشید سے خور ہوا پھر حور ہوا اس میں یائے نسبتی لگی تو حوری یا ہولی بن گیا -

اسی طرح ہزاروں الفاظ بتائے جا سکتے ہیں جو تلفظ کی آسانی کی وجہ سے سنسکرت سے فارسی اور فارسی سے ہندوستانی بن گئے لہذا امید ہے کہ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ فارسی ہی پوشک بھاشا یا امدادی زبان بننے کی قابلیت رکھتی ہے -

کس تہذیب (کلچر) کو نمونہ بنانا چاہئے

آخر میں صرف ایک سوال رہ جاتا ہے - کہ کس تمدن کو نمونہ بنایا جائے میرا مختصر جواب یہ ہے کہ لکھنؤ کے تمدن کو -

یہی وہ شہر ہے جہاں ہندو مسلم تمدن مل کر معراج کمال کو پہنچا تھا - اور اب بھی اس شہر کی وضع قطع ' تراش خراش ' بات چیت روزمرہ اور محاورہ ہندوستان کے لئے قابل تقلید ہے - قیصر باغ کا بسنتی رنگ آج بھی نوروز اور بسنت کی یاد دلاتا ہے - امام باڑوں میں ہندو مسلم تعداد یکساں نظر آتی ہے - میلہ ' تہواروں میں بھی اسی شہر میں (چشم بد دور) کامل اتحاد کی شان نظر آتی ہے - اگر لکھنؤ کی عمارات کے ناموں مثلاً فرنگی محل ' موتی محل ' قیصر باغ

مچھی بھون ' چھتر منزل ' امام باڑہ وغیرہ پر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ ہندی اردو کس طرح لکھنؤ میں مل کر ہندستانی بن گئی -

رومن خط کی خوبیاں

اب صرف ہمیں یہ دیکھانا ہے کہ رومن خط میں کیا کیا خوبیاں ہیں -

۱—اول یہ کہ اس کے حروف بہت سادہ ہیں اور ہر آواز کے لئے الگ الگ مقرر کئے جا سکتے ہیں اور آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں -

۲—سائنٹفک اصطلاحوں کے لئے ہمیں بین الاقومی خط (Inter-national Script) کی ضرورت ہے اور وہ رومن خط ہے -

۳—اس کے سیکھنے میں بہت آسانی ہے اور ہندوستان کا ہر ایک پڑھا لکھا آدمی اسے جانتا ہے -

۴—ترکی اور ایران کے علاوہ جزائر جاوا اور ملایا کے تقریباً آٹھ کروڑ باشندے (جو زیادہ تر مسلمان ہیں) ۱۵ سال سے رومن خط استعمال کر رہے ہیں -

۵—ٹائپ وائٹر مشینوں کے علاوہ سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ ہر جگہہ اس ٹائپ میں اچھا خوبصورت اور سستا چھپائی کا کام ہوسکتا ہے -

یہ مان لیجئے کہ بعد کہ رومن خط ضروری ہے - اب ہمیں حروف کی آوازوں کو متعین کرنا ہے - اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ یہ کام صرف ایک آدمی کو نہ کرنا چاہئے - بلکہ اس کے لئے ہندستانی اکیڈیمی ' انجمن ترقی اردو ' جامعہ ملیہ ' ناگری پرچارنی سبھا اور کاشی ودیا پیٹھ کے ماہرین کی ایک جماعت کا تقرر ہونا چاہئے - جو مشترک ہندوستانی زبان کے لئے رومن

کس قسم کا ہونا چاہئے

حرف کي آوازوں کو مقرر کریں - اس کے لئے مندرجہ ذیل چند اصول کار آمد ہو سکتے ھیں -

۱—چونکہ رومن تحریر سے ھمارا منشا اردو اور ھندی کو قریب تر لانے کا ھے لہذا جہاں تک ممکن ہو مخلوط حروف کو چھوڑ دیا جائے اور ایک حرف کے لئے ایک ھی آواز مقرر کی جائے - جو الفبائی اصول پر ھو -

۲—سوائے سخت ضرورت کے کوئی نیا حرف نہ بنایا جائے - تاکہ دنیا کے جس پریس میں چاھیں ' یا جس مشین پرٹائپ کرنا چاھیں آسانی سے ممکن ھو -

۳—اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہم صرف چھاپے ھی کے لئے نئے حروف نہ بنائیں گے - بلکہ چھاپے سے پہلے اُنھیں لکھنے کی بھی ضرورت ھوگی - لہذا جہاں تک ممکن ھو نیا حرف نہ ایجاد کریں -

۴—صرف اُن آوازوں کے لئے حروف بنائے جائیں جو ھندستانی زبان میں رائج ھیں - اس لئے کہ جو آوازیں ھماری زبان میں نہیں ھیں اُن کے نئے حروف کا ایجاد کرنا اپنی قابلیت کا تو ضرور ثبوت ھوگا لیکن ملک کو کوئی فائدہ نہ ھوگا -

اس لئے عربی کے حروف ص اور س کے لئے صرف S کافی ھے اور ذ-ز-اور ظ کے لئے z کافی ھے - سنسکرت ڑان کے لئے N کافی ھے اور کشتری کے کشا کے لئے صرف چھ ھو سکتا ھے - ترکوں نے ث اور ص کے لئے S ' ق کے لئے K ض ظ ز کے لئے Z د اور ت کے لئے T اور ط کے لئے T̄ ح خ کے لئے H رکھا ھے (دیکھو یتی ترکی گرامر مطبوعہ ۱۹۳۰ع ترکیہ) ھندوستان میں آل انڈیا رومن سکرپٹ کی تجویز بھی ملک کے سامنے ھے جسکا منشا یہ ھے کہ انڈو جرمن ' سامی ' اور دراوڑ کی جتنی

قسمیں ہندوستان میں رائج ہیں سب کے لئے ایک رومن خط (سکرپٹ) بنایا جائے - انمیں سے ایک تجویز ڈاکٹر اس - کے چٹرجی ایم - اے - ڈی-لٹ - پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کی ہے - جس میں اُنہوں نے چند اُلٹے حروف بڑھائے ہیں - مثلاً c e f h j k w v کو اُلٹا لکھا ہے - اور ذ کے لئے ง اور ث کے لئے 8 کا اضافہ کیا ہے - اس کے علاوہ d u r s t z ترچھے یا Italics بھی ایجاد کئے ہیں - چھاپے میں تو ان حروف کا استعمال ممکن ہے - لیکن ٹائپ کرنے یا لکھنے میں دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے - دشوار تو یہی ہے کہ کہ ہے دشوار بھی نہیں "

دوسری تجویز مسٹر اے - لطیفی - سی آئی ای - آئی ای اس - ایم-اے ایل ایل بی بیرسٹر-ایٹ-لا کی ہے - انہوں نے اس کا نام لطیفی الفابٹ رکھا ہے - اور یہ تجویز ہز ہائی نس مہاراجہ بڑودہ کے حکم سے افسران ریاست کے سامنے رائے طلب کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے - اسمیں بھي بہت سے نئے حروف بنائے گئے ہیں اور نقطوں اور ماتروں سے کام لیا گیا ہے - آ (a ह) کے لئے اُلٹا j اور ∧ ہے - غ کے لئے اُلٹا K ہے - ژ کے لئے الٹا f (ɟ) ہے ع کے لئے X اور نو تک کی گنتی بھی ابجد میں شامل کرلی گئی ہے - مثلاً شیرشاہ لکھنا ہو تو 5 er 5 ah ' چکھ 2 a 4 شبھ 56 وغیرہ - ان حروف کے لکھنے اور پڑھنے دونوں میں دقت ہے - حروف کے اندر اعداد (Numerals) کے داخل کر دیئے اور بہت سے نئے قسم کے حروف بنالینے کی وجہ سے لطیفی الفابٹ بالکل نئی الفابٹ معلوم ہوتی ہے - اور وہ لوگ جو رومن خط سے واقف ہیں اُنکے لئے بیکار ہے - اسکے علاوہ یہ خط عام پریسوں میں نہیں چھپ سکتا - لہزا ہماری تجویز سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے -

ڈاکٹر گریرسن اور مہ'مہوپادھیائے سدھا کر دویدی نے ملک

محمد جائسی کی تصنیف پدماوتی کے دیباچہ کے پہلے صفحہ میں لکھا ہے کہ " جائسی نے پدماوتی فارسی خط میں لکھی - اور پنڈتوں کی اُن مخصوص ترکیبوں کو چھوڑ دیا کہ ہندوستانی زبانوں کو اس طرح درست کرنا چاہتے تھے ' کہ ہجے تو سنسکرت میں کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اُن کو سنسکرت کی طرح بولتے نہیں تھے - ملک محمد کے فارسی خط نے اس جھوٹی قدامت پرستی کا ساتھ نہیں دیا جیسا لوگ بولتے تھے ویسا ہی اُس نے لکھ دیا " -

اگر اس معیار کو ہم سامنے رکھیں کہ جس طرح لوگ بولتے ہیں اُسی طرح ہم لکھیں تو بہت آسانی سے رومن حروف میں ہم ہندوستانی زبان کو منتقل کرسکتے ہیں - البتہ یہ معیار وہی ہونا چاہئے جو لکھنؤ والوں کے نزدیک درست ہو - اس لئے کہ بنگالی زے کو جیم اور س کو ش - زبر کو پیش بولنے کا عادی ہے - پنجابی عموماً قاف کو کاف کہتا ہے اور عرب گاف کو کاف کہتا ہے - دکن میں خدا کو قدا اور قسم کو خسم کہتے ہیں - ایرانی کتاب کو چتاب - کنار کو چنار احمق کو احمغ اور اقا کو آغا کہتا ہے - لہذا ہندوستانی زبان کے لئے صرف ہندوستان (یعنی یوپی) اور وہ بھی لکھنؤ کی زبان کو معیار بناکر ' اس سے رومن خط بنانا چاہئے -

رومن خط کو کس طرح رائج کرنا چاہئے

میں اپنا مضمون اُن تجاویز پر ختم کرتا ہوں جو رومن خط کے جاری کرنے کے لئے میرے ذہن میں ہیں -

۱ — عدالتی اور سرکاری کاغذات سب رومن خط میں کردئے جائیں اور استغاثے اور نالشیں اسی خط میں داخل کی جائیں -

۲ — چند اخبارات و رسائل اس میں جاری کئے جائیں اور کچھ عام پسند کتابیں ابتدا میں شائع کی جائیں - اس کا تھوڑے ہی دنوں

میں یہ نتیجہ ہوگا کہ ہندی اردو کے اخبار جب اپنا تجارتی فائدہ دیکھیں گے تو فوراً یہی خط اختیار کر لیں گے -

۳—کالجوں اور اسکولوں میں بجائے ہندی اردو کے رومن سکرپٹ میں کتابیں رائج کی جائیں - اور یونیورسٹیوں میں زبانوں کے پرچوں میں ایک پرچہ رومن خط اور ہندستانی زبان کا ضرور ہو -

۴—کوشش کی جائے کہ سنیما والے اپنے اشتہارات اور هیڈنگ رومن خط میں جاری کریں - اس سے عام طور پر یہ خط مقبول ہوجائیگا -

۵—ایک ہندستانی گرامر اور ایک لغت اسی خط میں شائع کیجائے -

اب میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری تجاویز کو پسند فرمائیں گے اس لئے کہ متحدہ ، قومیت بغیر ایک زبان اور ایک خط کے ناممکن ہے -

طبقۂ اُمراء عہد سلطانی میں

از ڈاکٹر بنارسی پرشاد ایم - اے - پی ' ایچ - ڈی

قرون وسطی کے سیاسی نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تین طبقوں پر مشتمل تھا - اول سلطان اور اس کی اولاد ' دویم امرا ' سوم حکام اعلیٰ و ادنیٰ - ان تینوں طبقوں میں دوسرا بلحاظ وقعت و ثروت کے اہم ترین تھا - حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت دہلی کی تاریخ میں سلاطین اور خاص کر ایسے جو اس خطاب کے فی الواقع شایاں ہیں ' اُن چمکدار ستاروں اور سیاروں کے مثل ہیں جو طلوع ہوکر تھوڑی دیر کے لئے لوگوں کو حیرت میں ڈال کر غایب ہو جاتے ہیں - اس میں کلام نہیں کہ قطب الدین ایبک ' شمس الدین التمش ' غیاث الدین بلبن ' علاالدین خلجی ' محمد تغلق ' سکندر لودی وہ مشہور و معروف ہستیاں ہیں جن کے کارنامے حشر تک کا لعدم ہونے والے نہیں - مگر تین سو سال کے طول طویل عرصہ میں یہ پانچ یا چھ نام ستون راہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے - اس کے علاوہ یہ لوگ بھی تو امیری سے ہی ترقی کرکے تاج داری تک پہنچے تھے - پس اگرچہ سلسلۂ سلطنت کو قائم رکھنے کا سہرا ان کے سر ہے لیکن اس معنی میں نہیں کہ وہ سلطان تھے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ امیر تھے اور ایسے امیر کہ جنھوں نے کارہائے نمایاں کر دکھائے ' یہاں تک کہ لقب سلطانی کے اہل ثابت ہوئے -

موجودہ دور کے مبصرین کا از منہ وسطی کے تواریخی کتب پر یہ اعتراض ہے کہ یہ عوام الناس کے حالات سے خالی ہیں - جمہوریت کی اٹھتی ہوئی لہر کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراض کسی حد تک جایز تصور کیا جاسکتا ہے

مگر قرون وسطی کی فضا کے لحاظ سے غیر ضروری ہے - جب کہ سیاسی امور میں عوام‌الناس کا کوئی دخل نہ تھا - جب کہ ہر قسم کے قوانین کی پابندی کرنا ان کا فرض تھا اور حاکم کی فرماں‌برداری کرنا ان کا شیوہ' پھر بھلا اگر مورخین نے ان کے حالات کو نظر انداز کر دیا تو اس میں گلے کی کیا بات ہے - تعجب تو یہ ہے کہ طبقۂ امرا کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی مورخوں نے ان کے حالات قلمبند کرنے میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے - اصل میں تو قرون وسطی کی تاریخ امیروں کے کارناموں سے بھری ہوئی ہونا چاہئے تھی نہ کہ سلاطین کے حالات سے کیونکہ فی نفسہ امیر ہی وہ لوگ تھے جنھوں نے سلطنت کی بنیاد کو پائدار و مستحکم بنایا - یہ ارکان سلطنت کہلاتے تھے - ان میں اور سلطان میں لازم و ملزوم کا علاقہ تھا -

پس طبقہ امرا کی امتزاجی ہیئت ' اس کی دستوری حیثیت ' اُس کا سیاسیات پر اثر اور اس کی اقتصادی و معاشرتی اہمیت پر کسی قسم کی بحث بعید از دلچسپی نہ ہوگی - مگر قبل اس کے کہ ان مسائل پر کوئی مزید روشنی ڈالی جائے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرداً فرداً اس طبقہ کے لوگ ایک پایہ کے نہ تھے - بہتوں نے تو اپنی زندگی کا افتتاح غلامی سے کیا تھا اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے مناصب اعلیٰ تک پہنچ گئے تھے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ممالک غیر کے شہزادے افلاس و تنگدستی سے عاجز آکر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوتے - جب سلطان کو پتہ چلتا تو وہ ان کو طبقہ اُمرا میں داخل کر لیتا تھا - اس کے علاوہ جب کبھی کوئی فوجی سردار قوت بازو سے تاج و تخت کا مالک بن بیٹھتا تو بمقتضائے موقع و وقت اپنے عزیز و اقربا کو امیر بنا دیتا تھا -

اُس عہد میں سلطان کی بلا مرضی کوئی امیر نہیں بن سکتا تھا - وجہ یہ کہ اس رتبہ کے واسطے فوجی عہدہ کا ہونا نہایت ضروری تھا - اس عہدہ کا عطا کرنا یا نہ کرنا یہ امر خالصاً سلطان کی رائے پر مبنی تھا - اس کے متعلق ایک اور دلچسپ بات ہے اور وہ یہ کہ باوجود اس امر کے کہ کسی شخص کا فوجی عہدہ پر تقرر ہوگیا ہو یہ ضروری نہ تھا کہ وہ فوجی خدمات انجام بھی دے - سرکاری نوکر اور خاص کر ایسا کہ جس کی کچھ قدر و منزلت ہو وہی ہوتا تھا کہ جو فوجی ملازمت میں داخل ہو گیا ہو - حسب دستور یہ عہدے شخصی ہوتے تھے نہ کہ ارثی یہ لازم نہ تھا کہ کسی امیر کا لڑکا اپنے والد کے شغل و خطاب کو پا ہی لے یہ دوسری بات تھی کہ کسی امیر کی خدمات سے خوش ہوکر کوئی سلطان اس کے لڑکے کو اپنے والد کا شغل و خطاب عطا کردے مگر اس کو کرم سلطانی کہتے تھے جس کا کہ کوئی علاقہ ' حق ' یا دستوری حقوق سے نہ تھا - اس زمانہ میں لفظ ' حق ' بالکل مہمل تھا - چنانچہ سلطان کو پوری آزادی تھی کہ کسی امیر کو اس کے عہدے سے معزول کردے اور اس کی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر لے - امیروں کو ایسے طرز عمل کے خلاف چون و چرا کرنے کی قطعی گنجایش نہ تھی - اُس دور میں امیر چار تدریجی درجوں کے ہوتے تھے- درجہ اول کا امیر خاں کہلاتا تھا اور ان میں سب سے اعلیٰ کا خطاب الغ خاں اعظم ہوتا تھا - دوسرے درجہ کے امیر ملک کہلاتے تھے - اور تیسرے درجہ کے امیر کے نام سے منسوب ہوتے تھے - ان کے بعد فوجی افسروں کا نمبر آتا تھا مثلاً سپہ‌سالار ' سرخیل وغیرہ - ہر درجہ کی مناسبت شغل و خطاب ' اور اقطاع سے ہوتی تھی - خطابوں کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی - ہر سلطان اپنی مرضی و خواہش کے مطابق خطاب ایجاد کر لیتا تھا جیسے خواجہ جہاں ' خاں جہان '

خانخاناں ، قدر خاں ، عمادالملک ، قوام الملک ، نظام الملک ، اعظم الملک ، قتلغ خاں ، الغ خاں ، صدر جہان وغیرہ وغیرہ -

دستوری نقطۂ نظر سے امیر تین قسم کے ہوتے تھے اول وہ جن کو یہ عہدہ وراثتاً ملا ہوا تھا - دوسرے وہ جو سلطان الوقت کے بنائے ہوئے تھے اور تیسرے وہ جو نیچے درجے سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے اس عہدہ تک پہنچ گئے تھے - عہد سلطنت کے آغاز میں تیسری قسم کے امیروں کی تعداد بمقابلہ اول دو کے زیادہ تھی وجہ یہ کہ فرماں رواؤں کو اپنے غلاموں پر پورا اعتماد تھا وہ ان کی تعلیم و تربیت کے واسطے مناسب انتظام کرتے تھے اور حتی المقدور ان کی آسایش و آرام کا خیال رکھتے تھے - انہیں غلاموں میں سے جو ہونہار ہوتے وہ ترقی کر جاتے تھے اور مالک پر جان نثار کر دینے کے واسطے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے - محمد غوری نے جو سلوک اپنے غلاموں کے ساتھ کیا وہ شہرۂ آفاق ہے - ان غلاموں نے بھی اپنے کارناموں سے اپنے مالک کی عزت و ناموس کو قایم رکھا -

مگر غلاموں کو امیر بنانے کا دستور عہد سلطنت کے اول حصہ میں ہی زوروں پر رہا - جب تخت نشین ہونے کے بعد قطب الدین ایبک کو اپنا پایہ مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے پہلے تو محمد غوری کے باقی ماندہ ہندوی افسروں کے ساتھ صلح کر کے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنایا - پھر اس نے بہت سے اور امیر بنائے جن میں بیشتر غلام تھے - ایسے امیروں کی ایک زندہ مثال التمش ہے - قاعدہ یہ تھا کہ جس غلام کو امیر بنانا ہوتا تھا اُسے آزاد کر کے پھر اس کے سپرد اقطاع یا شغل یا سپہ‌سالاری کرتے تھے - ممکن ہے کہ آرام جس کو کہ آخیر میں سلطان کا اتنا قرب حاصل ہوگیا شروع میں غلام ہی رہا ہو - لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملتا ہے - جب

قطب‌الدین کے لاولد مرنے پر تاج وتخت کی وراثت کا سوال پیدا ہوا تو لاہور میں تو کچھ امیروں نے آرام کا ساتھ دیا مگر دہلی میں سپہ‌سالار اسمعیل امیر داد نے التمش کو بداؤں سے بلا کر تخت نشین کیا لیکن قطبی اور معزی امیروں نے اس کی سخت مخالفت کی حتیٰ کہ بدرجۂ مجبوری التمش کو جنگ کرنا پڑی - کچھ تو دہلی کے گرد و نواح میں مارے گئے بقیہ جو آرام کے حمایتی بن کر لاہور سے بڑھے آرہے تھے سلطان نے انکا بھی قلع قمع کر دیا -

قطبی اور معزی امیروں کی تباہی سے التمش کی بہت سی مشکلیں آسان ہوگئیں - اب اس کو پوری آزادی تھی کہ اپنے من مانے امیر بنائے - چنانچہ اس نے کیا بھی ایسا ہی - اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کی غرض سے و نیز اس خیال سے کہ تاج شاہی کی آبرو امیروں سے ہی ہوتی ہے التمش نے ایک نئے طبقے کی تکمیل کی جس میں کہ اس نے چالیس چیدہ چیدہ غلاموں کو شامل کیا اور ان کو چہلگان کے نام سے موسوم کیا - تاریخ ہند میں یہ اولین موقع تھا جبکہ کسی فرمانروا نے محض غلاموں ہی کو رکن سلطنت بنایا ہو - اس میں کلام نہیں کہ التمش کا وزیر اعلیٰ نظام‌الملک کمال الدین ابو سعید جنیدی و نیز دیگر حکام بالا مثلاً ملک فیروز شہزادۂ خوارزم و ملک جلال‌الدین شہزادہ ترک غلام نہ تھے مگر اصل میں سلطان نے اپنی قدرت و مملکت کا دار و مدار غلاموں پر ہی رکھا - اس کی وفات کے تیس سال بعد تک یہ ہی چہلگان امور سلطنت کو انجام دیتے رہے - جو جو کاروائیاں ان سے ظہور میں آئیں انکا مفصل و مشرح حال طبقات ناصری میں درج ہے -

مگر غیاث‌الدین بلبن کی تخت نشینی کے بعد سے چہلگان کا زور کم ہو گیا - اس نے انکے گروہ کو تہ بالا کر دیا اور اس نے امراء کے متعلق

ایک نئے دستور پر عملدرآمد کیا جس کا کہ صاف ملشاء یہ تھا کہ کوئی ایسا شخص امیر نہ بنایا جاوے جس کا حسب و نسب صحیح نہو - یہ اصول اس بات کا شاہد ھے کہ بلبن کی سریر آرائی کے قبل کچھ ایسے لوگ طبقہ امراء میں داخل ہو گئے تھے جن کی بے عنوانیوں سے شاہی وقار معرض زوال میں آ گیا تھا - ریحان نے جو کچھ بلبن کے ساتھ سلوک کیا تھا اس کی یاد اس کو بھولی نہ تھی - مزید براں طائفہ چہلگان میں نقائص پیدا ہو گئے تھے - اُنکے درمیان بغض و حسد کی آگ اتنے زوروں سے بھڑک رہی تھی کہ وہ خود اس سے جلکر خاک سیاہ ہوئے جا رہے تھے - اب یہ سلطنت کا بار سنبھالنے کے قابل نہیں تھے اور اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے سیاسی نظام کا شیرازہ بالکل درھم برھم نہو جائے - بلبن میں بھلا اتنی تاب کہاں تھی کہ ایسی زبوں حالت کو چپ چاپ دیکھتا رہتا - چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس طبقے کو خس و خاشاک سے پاک کردے' اس نے اس کام کو نہایت ھی دلیری سے انجام دیا - اس نے اپنے وزیروں کو تاکید کی کہ کسی حالت میں بھی سرکاری ملازمت کے واسطے وہ کسی مجہول النسب کو اس کے روبرو پیش نہ کریں - ایک دفعہ کا ذکر ھے کہ سلطان نے اپنے وزراء سے کہا کہ وہ ایک ایسا آدمی تلاش کر لائیں جو کہ امروھہ کی متصرفی کے قابل ہو اسوقت ملک علاءالدین کشلیخاں امیر حاجب تھا اور ملک نظام الدین بزغالہ وکیلدر - ان لوگوں نے کمال مہیار کو منتخب کیا اور امروھہ کی متصرفی کے لئے اوسکو سلطان کے سامنے پیش کیا - جس وقت کمال مہیار خاک بوسی کر رہا تھا بلبن نے ملازمین سے کہا کہ اُس سے لفظ مہیار کے معنی دریافت کرو کرین- نے جواب دیا کہ مہیار میرے والد کا نام ھے وہ اصل میں ایک ھندو غلام تھا - یہ سننا تھا کہ سلطان آگ بگولہ ہو گیا اس نے

فوراً ھی دربار برخاست کر دیا اور اپنے وزیروں کو تنہائي میں بلا بھیجا - انکو لعنت ملامت کرنے کے بعد کہا کہ تم لوگوں کو معلوم نہیں ھے کہ میں افراسیاب کے خاندان سے ھوں - اللہ تعالی نے میرے مزاج میں وہ خاصیت پیدا کی ھے کہ میں کسی بد اصل کو سرکاری عہدے پر نہیں دیکھ سکتا ھوں' جسوقت میری نگاہ کسی ایسے شخص پر پڑ جاتی ھے جس کا حسب و نسب صحیح نہو تو غصہ سے میرا جسم کانپ جاتا ھے ' پھر بھلا مجھکو یہ بات کب گوارا ھوسکتی ھے کہ میں کسی بد اصل اور کم ظرف کو سرکاری عہدہ پر مقرر کروں - یہي اصول اس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کے ذھن نشیں کرنا چاھا مگر اس میں اسکو خاطر خواہ کامیابي نصیب نہ ھوئی - تاھم جہاں تک ممکن تھا اپنے دور میں اس نے طبقہ امراء کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا - قسمت کو کیا کرتا اس کے پوتے کیقباد نے اپنے باوا کی کی کرائی محنت رائگاں کردی - اسی لئے نہ صرف تخت بلکہ جان سے بھی ھاتھ دھوئے -

بلبن خاندان کے زوال کے بعد ایک نئے خاندان کا عروج ھوا - جس کا باني جلال‌الدین فیروز خلجی تھا - تخت نشین ھونے سے قبل عرصہ دراز تک وہ غیاث‌الدین کي خدمت میں رہ چکا تھا - رفتہ رفتہ اس نے اپنی ایک پارٹی بنائی - سرحدی صوبوں کی محافظت کا کام بلبن نے اس کے سپرد کر رکھا تھا - برني کا قول ھے کہ جلال‌الدین نے اس عہدہ کے فرائض کو ایسی جوانمردي و دلیری سے انجام دیا کہ مغل اس کا لوھا مان گئے - چونکہ اس کا ایک پیر ھر وقت عرصہ کار زار میں رھا کرتا اس لئے اس کے پاس ایک عمدہ فوج بھی ھمیشہ موجود رھتی تھی - اغلب ھے کہ اسکی فوج میں زیادہ تر سپاھی اسی کے ھمقوم ھوں کیونکہ اس زمانہ میں فوجی ملازمت فرقہ وارانہ اصول پر ھوا کرتی

تھی - ہر امیر اپنے فرقہ کے لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا کرتا تھا - یہ کہنا بعید از راستی نہوگا کہ جلال الدین نے اپنے فرقہ والوں ہی کی امداد سے تخت حاصل کیا - حسب دستور اس کو بھی نئے امراء کی ضرورت پیش آئی - اول تو اس کو اپنی پارٹی مضبوط کرنا تھی دوسرے یہ کہ پرانے امیروں پر اعتبار کرنا خالی از خطر نہ تھا - چنانچہ پہلے تو اُس نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو اعلی خطابوں سے سرفراز کیا مثلاً اپنے سب سے بڑے لڑکے کو خانخاناں دوسرے کو ارکلیخاں اور تیسرے کو قدر خاں کا خطاب عطا کیا - اپنے بھائی یغرش خاں اور اپنے دو بھتیجوں میں سے علاءالدین کو تو امیر توزک بنایا اور دوسرے الغ خاں کو اخور بک کے عہدہ پر مامور کیا - جلالی دور کے افسران اعلی کی فہرست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ تو پرانے لوگ تھے مثلاً وزیر خواجہ خطیرہ - احمد جپ نائب باربک وغیرہ - اور کچھ نئے بھی تھے - اس کے علاوہ ایک اور بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اس وقت سے ھندی نژاد امراء کی بھی تعداد بڑھنا شروع ہو گئی - باوجود سعی بلیغ کے بلبن اس تحریک کو نہ روک سکا' کیونکہ ضیاءالدین برنی کا نانا سپہ‌سالار حسام الدین جو کہ غالباً ھندی تھا بلبن کا وکیلدر اور باربک تھا - جلالی دور کے آغاز میں بھی ملک نصیرالدین کہرامی - ملک قطب‌الدین کیتھلی - ملک تاج‌الدین کہرامی - ملک تاجو - ملک ہرنمار جو کہ بتدریج ترقی کر کے ان مناصب تک پہونچے تھے بلا شبہہ ھندی تھے - اس سلطان کے دربار میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے ' ترکی ' ھندی اور خلجی - اگرچہ برنی نے خلجی امیروں کی کوئی علیحدہ فہرست نہیں دی مگر جس ڈھنگ سے وہ فقرہ ' امرائے خلج ' کو استعمال کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد کافی تھی "سلطان جلال‌الدین باکوکبہ

بادشاہی و جمعیت ارکان و اعوان ملک و امراے خلیج و معارف و حشم قدیم ایام ملکی و مخلصان معتمد دولت درون شہر رفت" (صفحہ ۱۷۷)-

سن رسیدہ بادشاہ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں عصاے شاہی کا مدت مدید تک رہنا دشوار تھا - چنانچہ جلد ہی اس کے معتمد و معترف بھتیجے علاءالدین نے در پردہ سازش کر کے اپنے مربی و سرپرست کو دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب روانہ کر دیا - اور خود تاج و تخت کا وارث بن بیٹھا - سلطان علاءالدین کی نگاہ قہر پہلے پہل طبقہ امراء پر پڑی - اس نے سر کش و باغی لوگوں کو تہ تیغ کیا - باقی کو اپنا مطیع و تابعدار بنایا - جن جلالی امیروں نے رشوت لے کر اپنے آقا کے ساتھ نمک حرامی کی تھی ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے - سلطان علاءالدین نے بمصداق - هر که آمد عمارتے نوساخت - امیروں کے ایک بالکل نئے طبقے کی ترتیب دی- اگر تاریخ فیروز شاہی میں دی ہوئی فہرستوں کا باہمی مقابلہ کیا جاوے تو یہ صاف ظاہر ہوگا کہ علاءالدین کے امیروں میں ایسوں کی تعداد بہت کم ہے جو گذشتہ دور میں اس درجہ پر سرفراز تھے - اس کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شبہہ نہیں کہ اس کے عہد سلطنت میں ہندی نژاد امیروں نے بہت زور باندھا - علاءالدین والی فہرست میں کم از کم سات ایسے نام ہیں جن کے حسب و نسب کی بابت کوئی دوسری راے قائم ہو ہی نہیں سکتی مثلاً علاءالملک ' قاضی مغیث‌الدین' قاضی حمید ملتانی ' عین‌الملک ملتانی ' ملک کافور ہزار دینار ملک نائب ' ملک کافور مرہٹ نائب وکیلدر ' ملک فخرالدین کہنڈ - یہ بھی ممکن ہے کہ بقیہ ناموں میں بہت سے ایسے ہوں جو کہ ہندی لوگوں نے اپنی اصلیت کو پوشیدہ رکھنے کے لئے رکھ لئے ہوں - دربار میں ہندی مسلمانوں کی ترقی و تربیت کی ایک اور وجہ بھی تھی' وہ یہ کہ اول تو وسطی ایشیا

میں مغل ہنگامے نے پرانی تہذیب کو درہم برہم کر دیا تھا - اور چونکہ
مغل خود ہندوستان کے سرحدی صوبوں میں لوٹ مار مچائے ہوئے تھے
اس لئے ممالک غیر سے اس طرف رخ کرتے ہوئے قابل لوگ گھبراتے تھے -
دوسرے یہ کہ جو لوگ آتے بھی تھے وہ زیادہ تر ترک نژاد ہوتے تھے - اور
ترکوں کی خلجی دربار میں بڑی بےقدری تھی - جلال الدین کے زمانہ سے ہی
ترکوں اور خلجیوں کے درمیان زیر دست کشیدگی رہنے لگی تھی - ترکوں
کا یہ خیال تھا کہ خلجی لوگ غاصب ہیں - ہندوستان کی سلطنت
کا حق صرف ترکوں کو حاصل ہے - تیسرے سیاسی اصولوں میں کچھ
تغیر و تبدل - اگرچہ بظاہر اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے کہ
شریعت اسلام کو دھکا لگتا - لیکن اس کے گفتار و کردار سے باہر کے لوگوں
کو شک پیدا ہو جاتا تھا کہ اس نے مذہب اسلام کو ترک کر دیا ہے - مولانا
شمس الدین ترک ایک نہایت ہی بے نظیر عالم اور محدث تھے وہ مصر سے
خشکی کے راستہ تشریف لائے - جب ملتان پہنچے تو وہاں ان کو پتہ چلا
کہ بادشاہ وقت علاءالدین نہ تو نماز پڑھتا ہے اور نہ نماز جمعہ میں
شریک ہوتا ہے - یہ سنکر مولانا شمس الدین نے دھلی جانیکا قصد فسخ
کر دیا اور اپنے وطن واپس چلے گئے - وہاں سے فارسی میں ایک رسالہ
لکھکر علاءالدین کے پاس بھیجا - جس میں تحریر تھا کہ میں دور دراز
سفر کی مشقت برداشت کرکے ملتان تک آیا مگر جب میں نے آپ کے
اطوار و عادات کا چرچا سنا تو میں سیدھا واپس چلا گیا - مختصر یہ کہ
علاءالدین کے دور کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً تمام دربار ہندی الاصل امراء
سے بھر گیا تھا - اس کے لئے کسی حد تک تو سلطان خود ذمہ دار تھا
کیونکہ آخری وقت میں اس کو قابل اور جہاندیدہ لوگوں سے نفرت
ہوگئی تھی اور جی حضوریوں سے انسیت - ایسے لوگ ہندی الاصل جماعت

ھی میں مل سکتے تھے - اس کے علاوہ ملک کافور کو جو رتبہ حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بھی ہندیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا کافور نو مسلم تھا اس کو ضرورت تھی کہ اپنے حوصلوں کی تکمیل کے واسطے اپنے ارد گرد اپنے ھی طرح کے لوگوں کو جمع کرے- جب سلطان نے ریاست کی باگ‌ڈور اُس کے ھاتھ میں سونپ دی تو پھر اس کارروائی کا اس کو خوب ھی موقع ملگیا-

ملک کافور نے علاءالدین کے ساتھ وھی برتاو کیا جو علاءالدین نے اپنے چچا کے ساتھ کیا تھا - مگر زیادتیوں نے اس کے نخل اُمید کو بارآور نہ ہو نے دیا - چنانچہ وہ اپنی سازشوں کا خود ھی شکار ہوا اور اس کو تخت کے بجائے تابوت نصیب ہوا - قطب‌الدین مبارک خلجی میں بھلا ایسا بوتا کہاں تھا کہ اتنی بڑي سلطنت کے بار کو سنبھال لیتا - بیکس و بے بس ہوکر اس نے اپنی کشتی کو عیش و عشرت کے بحر نا پیدا کنار میں چھوڑ دیا - جیسے اس کے والد نے ایک بد اصل کے ساتھہ ' رشتہ جوڑا تھا ٹھیک اسی طرح قطب‌الدین نے ایک کم ظرف کو اپنا معتمد و صلاح کار بنایا - خسرو خان کی فوری ترقی کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ھندی اصل امیروں کا شاھی دربار میں بول بالا تھا - موقع ھاتھ آتے ھی خسرو خاں نے اپنے پھر نکالے - اپنے پرانے بھائی بندوں کو دھلی بلالیا اور فوج میں بھرتی کر لیا یہی نہیں بلکہ ان کے واسطے شاھی محل میں آمد و رفت کا دروازہ بھی کھول دیا - قطب‌الدین اپنے وزیر پر اتنا فریفتہ تھا کہ بہی خواھان سلطنت کے پیام آگاھی کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا - نتیجہ میں اس نے بھی معزالدین کیقباد کی طرح اپنے جان و مال سے ھاتھ دھوئیے - پانچ ماہ تک دھلی کا تخت نو مسلموں کے ھی ھاتھ میں رھا - سلطان ناصرالدین خسرو خاں نے اسلام کو ذلیل و خوار کرنے میں کوئي دقیقہ باقي نہ رکھا - مسجدوں کے طاقوں

میں بت رکھوا دئے اور بتوں کے پیروں تلے قرآن شریف رکھوائے - شاید یہ تھا عوض اُن ذلتوں اور خواریوں کا جو کہ التمش اور اس کے جانشینوں نے هندو مذهب کو اور هندوؤں کو پہونچائی تھیں - گجرات کے برادو شاید ابھی نہ بھولے تھے کہ شمس‌الدین التمش نے دھار میں مہا کال کے مندر کو نہ صرف مسمار و بے حرمت کیا تھا بلکہ بت کو لاکر دهلی کی جامع مسجد کے دروازہ پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے ڈالدیا تھا تاکہ مسلمین اُس پر پیر رکھ کر نکلیں - برادو کسی رزیل قوم کے نہ تھے یہ بات امیر خسرو کے تغلق نامہ سے ثابت هے -

بسے هندو کہ گویند هش برادو شدہ یار از برائے فتنہ او
برادو وصف هندوئیست سرباز کہ هم سرباز باشد هم سرانداز
بوند ایں طائفہ دریبش رایاں کہ جاں بازند بر فرمانروایاں

خسرو شاہ کے بے عنوانیوں سے هر چہار جانب سنسنی پھیل گئی - بڑے بڑے امیر مارے دهشت کے کانپنے لگے - لیکن یہ بات سب پر ظاهر تھی کہ جلد هی کوئی انقلاب ظہور پذیر هونے والا هے - چنانچہ غازي ملک نے اس بات کا بیڑا اتھایا کہ وہ خاندان علائی کے دشمنوں سے بلا انتقام لئے چین نہ لے گا - دوسرے امیروں سے خط و کتابت کرنے کے بعد جب اس کو اطمینان هو گیا کہ اس کے هم خیال بہت سے لوگ هیں تو اس نے ایک جرار فوج اکٹھا کی - مار کاٹ کرتا هوا وہ دهلی کے جانب بڑھا مگر اس بھونچال سے خسرو گھبرایا نہیں - اس نے روپیہ کو پانی کے طرح بہایا وہ اپنی فوج لیکر میدان میں آ ڈٹا - ایک بار تو اس نے غازی ملک کے چھکے چھوڑا دئے مگر تقدیر کا هیٹا تھا - جیتی جتائی بازي هار گیا - بھاگ کر ایک باغ میں چھپ رها - تین فاقوں کے بعد بیچارہ جب نکلا تو شاهي انگشتري نے اس کے راز کو طشت از بام کردیا - گرفتار کر کے

غازي ملک کے سامنے لایا گیا - اس کے گناہوں کی سزا اس کو بھگتنا پڑی -

غازي ملک نے علائی امیروں اور بہی خواہوں کو اکٹھا کر کے ایک نہایت ھی زور دار تقریر کي - اتفاق رائے سے امیروں نے اسی کو تخت کا وارث قرار دیا گیا - غیاث‌الدین کو طبقہ امراء کی نئی ترتیب میں کئي باتوں کا لحاظ رکھنا پڑا - اول تو علائی خاندان کے حامی و مددگار ہونے کی حیثیت سے اس کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ پرانے امیروں میں سے بھی کچھ کو اپنے ساتھ رکھے - خاص کر اس وقت تک جب تک کہ اس کا پایا مضبوط نہ‌ہوجائے - دوسرے یہ کہ ہندي الاصل امیروں کو وہ‌یکدم معزول‌نہ‌کر سکتا تھا کیونکہ ابھی تک اس کو یہ امید نہ تھی کہ باھر سے قابل لوگ کافی تعداد میں آ کر حکومت کا کام چلاینگے - تیسرے اس کو مذھبی اصول ہر وقت سامنے رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اس نے مذھب لسلام کے آوازہ کو بلند کیا تھا اور تخت نشینی سے قبل یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اسلام کے بجھتے ہوئے چراغ کو از سر نو روشن کریگا - چنانچہ غازی ملک کے امیروں میں وھی بات ملتی ھے جو کہ جلال‌الدین خلجی کے گروہ میں تھی - فرق صرف اتنا ھے کہ جلال‌الدین کو سیدھے اور سرکش - قابل اور نالائق میں تمیز نہ تھی برخلاف اس کے غیاث‌الدین تغلق کو فرداً فرداً ہر امیر کی لیاقت اور اس کے خیالات کا اندازہ تھا یہ ھی وجہ ھے کہ اس نے اپنے امیروں سے کبھی بھی دھوکا نہیں کھایا اور اُسکو حکومت کے کار و بار میں پوری کامیابی حاصل ہوئی -

محمد تغلق کے آتے آتے فضا بدل گئی - خاندان تغلق کا دبدبہ تمام ہندوستان پر قائم ہوگیا تھا اور بظاھر ہر طرف سکون و اطمینان کے آثار نظر آتے تھے - چنانچہ ہندوستان اور ممالک غیر کے درمیان

دوبارہ ربط ضبط قایم ہوگیا - بقول امیر خسرو تغلق خاندان کے مورث بھی مغل تھے - شعر : معظم تغلق غازی ترا نام * مغل هم نام تغلق داشت ز ایام - اس لئے محمد تغلق کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کو اسی امر کی کوشش کرنا چاہئے کہ اس کا طبقۂ امرا یکسر غیر ملک والے لوگوں سے بھر جائے - اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ پردیسیوں پر اپنا خزانہ لٹانے لگا - ترکی و فارسی الاصل لوگوں کو جو انعامات ملتے تھے ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے - ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ' پادشاہ ہند محمد تغلق شاہ پردیسیوں کی تعظیم و تکریم بدرجۂ غایت کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے - اور بڑے بڑے عہدے ان کو دیتا ہے - اس کے بڑے بڑے خواص اور حاجب اور وزیر اور قاضی اور داماد غیر ملک کے باشندے ہیں - اس کا حکم ہے کہ پردیسی کو ہمیشہ عزیز کے نام سے پکارا کریں چنانچہ باہر کے لوگ بجائے غریب کے سب عزیز کہلاتے ہیں - بدایونی اسی کے متعلق رقمطراز ہے - ' درآں چند سال مردم از ولایت خراسان و عراق و سمرقند بامید بخشش سلطان در هند آمدند که دریں دیار بغیر از ایشاں طائفۂ دیگر کم بنظر درمے آمدند ' برنی لکھتا ہے - ' و در تمامی قرن بادشاهی خود عظما و کبرا و معتبران - و ماهران و استادان هر علمے و هنرے و بزرگزادہ و هر واقعه زدہ کشتی شکسته که بامید عواطف و مراحم محمد شاهی خراسان و عراق و ماوراءالنهر و خوارزم و سیستان - و هریو و مصر و دمشق در درگاہ آسمان جاہ او می رسیدند با موال و اسباب مالا مال می شدند و نه در آخر عهد سلطان چندیں مغلان و امیران تمن و امیران هزارہ معارف مغلان و خاتونان بزرگ و اکابر مغلستان بدرگاہ سلطان محمد شاہ به بندگی و چاکری و اخلاص و هوا خواهی می رسیدند ' (p. 462) ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ محمد تغلق

کو پردیسیوں کا کتنا خیال تھا - ان لوگوں کو اعلیٰ اعلیٰ عہدے دینا مصلحت سے خالی نہ تھا - وہ چاہتا تھا کہ لائق لائق آدمی خراسان، ترکستان عرب، و شام وغیرہ سے آ کر اس کی ملازمت اختیار کریں - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد تغلق نے اس رویہ کو کیوں جاری کیا - کیا ہندوستان میں قابل لوگ اس کو دستیاب نہیں ہوتے تھے جو اس کو پردیسیوں کو بھرتی کرنے کی ضرورت پیش آئی ؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سلطان کو ہندی اصل امیروں کا اعتبار جاتا رہا تھا - علاوہ بریں اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ ربع مسکون میں بے مثل شہرت حاصل کرلے اور اپنے طرز حکومت کو عدیم المثال بنا لے - ان ارادوں کی تکمیل کا اس کو صرف یہی ذریعہ معلوم ہوا کہ پردیسیوں کے ساتھ رعایت کرے - ممکن ہے کہ پردیسی خون نے بھی اس کی رگوں میں کچھ جوش مارا ہو اور اس کو اسی طرز عمل کے طرف مائل کیا ہو - بلبن کے طرح اگر یہ بھی ہوشیاری اور سمجھ سے کام لیتا تو انجام بہتر ہوتا مگر زور میں آکر محمد تغلق نے پردیسیوں کی ایسی بھرمار کی کہ قابل اور نالایق، عقلمند اور جاہل، کار آمد اور بیکار کے امتیاز کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا - دربار تو پردیسیوں سے بھرا ہی تھا -، خیر یہاں تک غنیمت تھا - لیکن محمد تغلق نے فوج اور دیگر شعبہ ہائے حکومت میں بھی پردیسیوں ہی کو جگہ دی - بالآخر جب یہ لوگ نالایق ثابت ہوئے تب محمد تغلق کی آنکھیں کھلیں - سراسیمہ ہوکر اس نے یکدم اپنے طرز عمل کو بدل دیا - کہاں تو پردیسیوں کی اتنی قدر و منزلت تھی کہاں اب وہی باغیوں کی فہرست میں گردانے جانے لگے - مجبوراً ہندی الاصل لوگوں کو سلطان نے گروہ امرا میں داخل کرنا شروع کردیا - لیکن اب اتنا موقع نہ تھا کہ وہ سوچ سمجھ کر کام کرسکتا - وہ تو غصہ کے مارے اندھا ہو رہا

تھا - دوسرے یکدم اتنی تعداد میں قابل آدمیوں کا ملنا امر محال تھا - نا تجربہ کار اور بد اصل لوگوں کا زور بندھا - نئے امیر کس قسم کے تھے اس کا اندازہ برنی کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے - 'سلطان در ولایت سنام و سامانہ لشکر کشید و متمردان و سر تابان آنجاے کہ منزلہا کردہ بودند و خراج نمیدادند و فسادہا می کردند و راہ می زدند سلطان محمد منزلہاے ایشان را نہب و تاراج فرمود و جمعیتہائے ایشان را متفرق گردانید و مقدمان و سران ایشان را در شہر آورد و بعضے از ایشان مسلمان شدند و گروہ گروہ را داخل امرا گردانید' - ممکن ہے کہ برنی کے یہ الفاظ مبالغہ آمیز ہوں لیکن آیندہ واقعات سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ دیسی تحریک نے اسی زمانہ سے از سر نو زور باندھا تھا -

فیروز تغلق علما و اکابر کی مدد سے تخت پر بیٹھا - اس کے زمانہ میں نو مسلمین کی طاقت انتہائی درجہ تک پہونچ گئی - اس کا وزیر خان جہاں مقبول ہندی نژاد تھا - وہ تلنگ کا باشندہ تھا اور اس کا اصلی نام کنو تھا - ظاہر ہے کہ اس نے اپنے ہم وطنوں کی سرپرستی کی ہوگی - دوسرے بہت سے علماء باوجود اپنی پردیسی اصل کے ہندی ہی ہوگئے تھے - اُن کی عزت ' اُن کی شہرت ' اُن کی مقبولیت ' حتیٰ کہ اُن کی ثروت کا دار و مدار باشندگان ہند پر ہی تھا - پھر بھلا وہ کب تک اپنے پردیسی حسب و نسب کو مایہ ناز بنائے رکھتے - تیسرے فیروز نے جود و سخا کے جوش میں آکر ایک علیحدہ محکمہ قایم کردیا جس کا نام دیوان بندگان رکھا - اگر یہ بندگان التمش کے چہل گان کے مقابلہ کے ہوتے تو ممکن تھا کہ شاید ریاست کو کچھ فیض پہنچتا - مگر ان میں سب کے سب نو مسلم تھے اور وہ بھی ایسے جو کہ بطور غلام کے جنگ و جدل میں گرفتار کر لئے گئے تھے - ایسے لوگ کس قابل ہوسکتے تھے؟

اِس کے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں - یہ سچ ہے کہ فیروز نے اُن غلاموں میں سے چیدہ چیدہ کے واسطے اعلیٰ قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا لیکن؂ عاقبت گرگ زادہ گرگ شود -

تیموری حملہ سے جو مغربی ہند کی سیاسیات میں تغیر و تبدل ہوا اس میں اہم ترین واقعہ تھا خاندان سید کا عروج - اس کا بانی مبانی خضر خاں تھا جس کی سیادت کی صحت کے ثبوت میں یحییٰ سہرندی نے متعدد واقعات پیش کئے ہیں - دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد سید خضر خاں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ ایک ایسا گروہ بناوے کہ جس میں اُس کے یارو مددگار شامل ہوں - سید ہوتے ہوئے بھی خضر خاں کی یہ ہمت نہ پڑی کہ پردیسیوں کو بلاتا - شاید موقع بھی نہ تھا - کیونکہ خراسان و فارس کے واسطے آل تیمور کی سرپرستی میں رہنا باعث فخر تھا - خضر خاں کوئی خود مختار سلطان نہ تھا - اس نے تو سلطان کا لقب بھی اختیار نہیں کیا وہ اپنے کو محض ایک تیموری حاکم تصور کرتا تھا - پھر بھلا پردیسی کیوں اُس کے پاس آتے - چنانچہ اس کو ہندی نژاد لوگوں سے ہی ربط ضبط بڑھانا پڑا - واقعہ تو یہ ہے کہ اغلباً وہ خود بھی ہندی ہی تھا - دہلی آنے کے بعد جن لوگوں کو اُس نے ممتاز کیا اُن میں سے چند نام ایسے ہیں جن کے ہندی ہونے میں کوئی شبہہ ہی نہیں مثلاً ملک سروپ ' ملک کالو ' ملک داؤد ' اختیار خاں وغیرہ - خضر خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح مبارک شاہ تخت نشین ہوا - بموجب قول مصنف تاریخ مبارک شاہی ' امرا و ملوک وایمہ و سادات و قضات و ہر چہ کسے در عہد خدائگان مغفور خضر خاں از شغل و اقطاع و پرگنہ ودیہ و وظیفۂ مدرود تعین داشت برہمہ مقرر داشتن فرمود ' - مطلب یہ کہ مبارک شاہ نے طبقہ امرا کے

بنانے میں کوئی خاص تغیر نہیں کیا - اس کے بعد اس خاندان میں کوئی ایسا نہ ہوا جو کسی نئے طرز عمل پر کاربند ہونے کی ہمت بھی کرتا -

سیدوں کے مقدر نے جب پلٹا کھایا تب لودیوں کا عروج ہوا - بہلول نے دوران ملازمت میں ہی اپنے ہموطنوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا تھا - جس کی امداد سے حمید خاں کو اُس نے ایسا دھوکا دیا کہ باید و شاید - حمید خاں کو خواب میں بھی یہ خیال نہ گذرا کہ جاہل افغان کسی وقت اس کی مشکیں کس لیں گے - قصہ کوتاہ اپنے ولی نعمت کو پیچ و تاب میں ڈال کر بہلول سلطان بن بیٹھا - مسند نشین ہوتے ہی اُس نے اپنے ہموطنوں کو پیاپے پیغام بھیجے کہ افغانوں کے واسطے سر زمین ہند میں نان و نمک کی کمی نہیں - اس خبر کا پہنچنا تھا کہ افغانوں کے دل بادل دوہ سے اٹھ کر اس ملک پر چھا گئے ' لودی ' فرمولی ' لوہانی ' عیسیٰ خیل ' کتاخیل ' وغیرہ فرقوں کے لوگ آئے سلطان بہلول نے ان کی سرپرستی کی - ان کو بڑے بڑے عہدے دئے اور تمام سلطنت کا کام انھیں کے سپرد کیا - چنانچہ لودی دور میں طبقہ امراء کی وہی ہیئت نظر آتی ہے جو کہ شمسی یا بلبنی عہد میں تھی - ان میں سے ہر فرد پردیسی تھا - ہر شخص جری اور حوصلہ مند - مرنے کٹنے کو تیار - وقتاً فوقتاً مالک کا وفادار - مگر ہر دم اپنی ذاتی شان و شوکت کا دلدادہ اور اس پر جان نثاری کے واسطے آمادہ -

شمسی خاندان سے لے کر لودی عہد تک طبقۂ امرا کے بنانے اور اس کی ہیئت میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کے بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً اس بات کا بھی اندازہ کر لیا جاوے کہ ان لوگوں کا سیاسی امور پر کیا اثر پڑا - اچھا یا برا - سلطان اور امیروں

کی طاقت میں ضدین کی نسبت تھی - اس کا مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ طاقتور ہوتا تھا اس زمانہ میں امیر کمزور ہوتے اور جب امیر طاقتور ہوتے تھے تو بادشاہ کمزور ہوتا تھا - امیروں کی طاقت کی پہلی مثال قطب‌الدین ایبک کی وفات کے بعد نظروں کے سامنے آتی ہے لیکن چونکہ وہ لوگ اس وقت کی دو گروہوں میں تقسیم تھے اس لئے سیاسی امور پر ان کا کوئی دیر پا اثر نہ پڑ سکا مگر التمش نے جو طریقہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے نکالا وہ بالاخر بہت مفید ثابت نہوا - وہی لوگ جنکو اس نے پستی سے اٹھا کر امیری کے درجہ تک پہنچایا تھا سلطان کی وفات کے بعد اس بات کے درپے ہوگئے کہ تمام شاہی طاقت خود ہی غصب کر لیں - صاحب طبقات ناصری کے قول کے بموجب التمش نے مرتے وقت اپنے امراء و اکابر سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی رضیہ کو سلطان بناوینگے - مگر مذہب اسلام کے مقلدین کو بھلا یہ کب گوارا تھا کہ ایک عورت کے سامنے اپنا سر جھکائیں قرون وسطی میں سیاسی اغراض کو پورا کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لینا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی - حقیقت تو یہ ہے کہ امیر لوگ قابل اور سمجھدار فرماں روا سے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کی باگ تور اپنے ہاتھ میں لیکر ان کی خود مختاری کے راستہ میں سد راہ بن جائے چنانچہ رضیہ کی مخالفت کی اصلی وجہ یہی تھی - لیکن بہ ظاہر امراء نے اپنی مخالفت کو مذہبی رنگ دے دیا - چنانچہ نظام‌الملک جنیدی کی ایما سے جو کہ اس وقت طبقہ امراء کا سردار تھا ، سلطان مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے رکن‌الدین فیروز کو وارث تاج و نگین قرار دیا گیا - اس کار روائی کی سیاسی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت یہ ہے کہ اب سے یہ طے ہوگیا کہ تخت و تاج کے متعلق

حقوق کے فیصلہ کا جزوی و کلی اختیار امیروں کو حاصل ھے ' ایسی فضا میں جب کہ بادشاہ محض ایک کھلونا بن گیا تھا یہ اصول دراصل نہایت ھی کارآمد تھا - لیکن دقت یہ آن پڑی کہ امیروں کے مابین بہت دنوں تک اتفاق رائے قایم رھنا دشوار تھا - ان میں سے ھر ایک کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ کس طرح سے اپنے ساتھیوں کو زیر کرکے ساری طاقت اپنے ھاتھ میں کر لے - نتیجہ یہ ھوا کہ طبقۂ امرا میں فرقہ بندی ھوئی اور وہ لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے - جو فرقہ زور پکڑ جاتا تھا سلطان اُسی کے قابو میں ھوکر کٹھ پتلی کی طرح ناچا کرتا تھا - لیکن کسی گروہ کا بھی عرصہ تک زور رھنا غیر ممکن تھا - وجہ یہ کہ فرقہ بندی کی بنیاد تھی - خود غرضی ' اور خود پسندی - اس دور میں شاید ھی کوئی ایسا امیر ھو جس میں کہ ایثار کا مادہ موجود ھو - پس چند روز تک تو نظام‌الملک جنیدی کی تھاک جمی رھی مگر بہت جلد خواجہ مہذب کی سرکردگی میں ایک مخالف پارٹی قایم ھوگئی جس نے کہ رضیہ کا ساتھ دیا - خواجہ مہذب کے بھی وھی حوصلے تھے جو نظام‌الملک کے ' مگر اس کے بہ‌نسبت خواجہ شاید کچھ زیادہ ھوشیار تھا - اور اس نے ایسی چال چلی کہ رضیہ کو تخت سے ھاتھ دھونا پڑا - اب امیروں نے بہرام کو سلطان بنایا چونکہ یہ محض ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا اس لئے اس کے مشورے کے واسطے ایک مجلس انتظامیہ قایم کی گئی - اس مجلس کا صدر تو وزیر خواجہ مہذب ھی تھا مگر اصلی اختیارات اختیارالدین انیگین کو حاصل تھے - اپنے کرو فر میں اضافہ کرنے کی غرض سے انیگین نے سلطان کی مطلقہ بہن سے نکاح کیا وہ سہ‌گانہ نوبت بھی بجوانے لگا اور اس نے اپنے مکان کے دروازہ پر ایک ھاتھی باندھ لیا - اس کی اس فرعونیت سے اس کے دوست ناراض ھوگئے - بادشاہ نے ان کی صلاح سے انیگین کو

قتل کروا دیا - اس سانحہ کے بعد خواجہ مہذب کی طاقت دوبارہ بڑھ گئی - اس نے مکر و فریب سے تمام امیروں کو سلطان بہرام کی جانب سے بدظن کر دیا - اور انجام کار اپنے مالک کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا - بہرام کے بعد تخت پر کس کو بٹھلانا چاہئے اس بات کا فیصلہ آسان نہ تھا - جب کہ خواجہ مہذب اور اس کے ساتھی اس اہم مسئلہ پر بحث کر رہے تھے ایک باحوصلہ اور دلیر امیر عزالدین بلبن کشلو خان موقع کو غنیمت جان کر محل شاہی میں جاکر سلطان بن بیٹھا تخت پر اس کا حق سلطان التمش کے داماد ہونے کے رشتہ سے تھا - لیکن التمش کی اولاد کے مقابلے میں دوسرے امیر کشلو خاں کے حقوق کو تسلیم کرنے کے واسطے تیار نہ تھے چنانچہ انہوں نے اس مرتبہ مسعود کو سلطان بنایا مگر یہ لوگ اپنی خصلت و عادت سے مجبور تھے - بہت جلد مسعود سے بھی ناراض ہوگئے - انہوں نے اس کے چچا ناصرالدین کو بہرائچ سے بلا بھیجا اور مسعود کو معزول کرکے اس دفعہ اُسے بادشاہ بنایا - خوش قسمتی سے ناصرالدین کو بلبن جیسا وفادار اور ہوشیار وزیر مل گیا جس کی مدد سے ۲۰ سال تک وہ سلطنت کرتا رہا - اس کے عہد میں بھی ایک دفعہ امیروں نے سر اُٹھایا اور سلطان کو اتنا ورغلایا کہ اس نے بلبن کو برخاست کر دیا اور عمادالدین ریحان کو اپنا معتمد اعلیٰ بنایا - لیکن عمادالدین سے وزارت کا کام چلائے نہ چلا - اس کے دوست اس سے برگشتہ ہوگئے اور ان کے کہنے سے سلطان نے بلبن کو اس کے عہدے پر بحال کر دیا اس کے بعد زندگی بھر اُسی کی رائے سے فرائض منصبی کو انجام دیتا رہا - ناصرالدین کے بعد بلبن تخت نشین ہوا ' اُس نے پہلی اصلاح جس پر سب سے زیادہ زور دیا وہ طبقہ امراء کی روز افزوں طاقت کو کم کرنا تھا - اس کے واسطے اس نے جو سبیل اختیار کی

وہ قابل ذکر ھے - اول تو اس نے چہلگان کے گروہ کو درھم برھم کر ڈالا - دوسرے اس نے سن رسیدہ و نیز کمسن امیروں کی جو کہ فوجی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے پنشن مقرر کر دی - تیسرے اس نے نوجوان امیروں کی تنخواہ ان کی لیاقت کے بموجب تجویز کی - چوتھے اس نے چن چن کر کم اصل اور ناکارہ امیروں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا - اس طرح سے بلبن نے طبقۂ امراء کو پھر سے اس کے اصلی مرتبہ پر پہنچا دیا - اس نے یہ صاف صاف کہدیا کہ امیر صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ سلطان کو مشورہ دیں اور اس کی اطاعت کریں - اس کے علاوہ ان کا اور کوئی کام نہیں - جب تک وہ زندہ رہا کسی امیر کی ہمت نہ ہوئی کہ زبان سے کوئی بات نکالتا - فرقہ بندی کا خیال تو خواب میں بھی آنا محال تھا - مگر بلبن کے مرتے ھی پھر امیروں نے شاھی طاقت کو غصب کر لیا - اب ملک الامرا فخرالدین کے داماد نظام الدین کا ایسا زور بندھا کہ سلطان کو اس نے بالکل قابو میں کر لیا - اس کو دیکھ کر دوسرے امیر بہت برھم ہوئے - خاص کر وزیر سلطنت خواجہ خطیر کی ناراضگی کی تو کوئی انتہا ھی نہ تھی ' بیکسی کے عالم میں اس نے سلطنت اور سلطان دونوں سے قطع تعلق کر لیا - اب ھر طرف نظام الدین ھی کی دھوم تھی - لیکن کچھ ھی عرصہ کے بعد اسے اپنی جگہ سے مستعفی ہونا پڑا - نظام الدین کے بعد کار و بار سلطنت میں وہ ابتری پڑی کہ جس کا کچھ حساب نہیں - بگڑی ہوئی فضا کو سنبھالنے کی غرض سے سلطان نے جلال الدین سر جاندار کو سامانہ سے طلب کیا اور عرض ممالک کا عہدہ اس کے حوالے کیا - ابھی تک تو ترکی امیر آپس ھی میں بر سر پیکار تھے مگر جلال الدین کی آمد سے ان کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عرض ممالک ان کی ہستی کو مٹا دے - چنانچہ آپس میں

اتفاق کرکے ترکی امیروں نے یہ صلاح کی کہ چال بازی سے جلال‌الدین اور اس کے خلجی حوالی موالی کا قلع قمع کردیا جاوے - لیکن ان کا راز طشت از بام ہو گیا - بہت سے تو اس جماعت سے بھاگ نکلے اور انہوں نے جاکر جلال‌الدین سے رشتہ جوڑا - بقیہ نے حوصلہ کی خاطر اپنی جان گنوائی-

جلال‌الدین فیروز خلجی ایک نہایت ہی سیدھا سادہ بادشاہ تھا - تاہم چونکہ اس نے تاج شاہی کو مکر و فریب سے حاصل کیا تھا اس لئے باشندگان دہلی اسے غاصب تصور کرتے تھے' کچھ دنوں تک وہ اس کی اطاعت سے منہ موڑے رہے - مگر ملک‌الامرا کے کھلے سلنے سے انہوں نے اپنے خیالات کو بدل دیا - جب تک کہ دارالخلافت میں سکون قائم نہ ہو گیا سلطان جلال‌الدین نے شہر نو یعنی کیلوکھری سے قدم باہر نہ نکالا - دہلی پہنچتے پر پہلے دولت‌خانہ میں گیا اور وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد وہ سلاطین ماضیہ کے تخت پر جلوس فرما ہوا - بعد ازاں وہ کوشک لعل کے طرف روانہ ہوا جب پھاٹک پر پہونچا تو حسب دستور قدیم گھوڑے پر سے اُتر پڑا - اس پر احمد چپ نائب باربک نے سوال کیا - خداوند عالم محل تو آپ ہی کا ہے پھر پھاٹک ہی پر آپ کیوں اُتر پڑے ؟ ' جلال‌الدین نے جواب دیا - ' اے احمد جو محل کہ میرے آبا و اجداد کا بنوایا ہوا ہو وہی میرا ہو سکتا ہے - یہ محل تو بلبن کا بنوایا ہوا ہے - میں نے تو اس پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے در اصل اس کی حق دار بلبن کی اولاد ہے ' کیا ایسا بادشاہ جو اپنے کو ہردم غلام و خدمتگار تصور کرتا ہو طبقہ امرا کو قابو میں رکھ سکتا تھا ؟ چنانچہ بہت جلد یہ خبر مشتہر ہوگئی کہ جلال‌الدین بادشاہی کے قابل نہیں - ملک چھجو نے علم بغاوت بلند کیا - مگر آخر میں اس کو شکست ہوئی - باغی گرفتار کرکے سلطان کے رو برو پیش کئے گئے مگر اس نے ان سب کو رہا کردیا ' اس

طرز عمل کو دیکھ کر امیروں کے دلوں سے اس کی رہی سہی عزت بھی غائب ہوگئی اور وہ علانیہ کہنے لگے کہ جلال الدین نکما آدمی ہے - ایک شب کو بہت سے امیر ملک تاج الدین کوچی کے مکان پر جمع ہوئے - شراب و کباب کے دور کے بعد عالم مستی میں بات چھڑی - ایک بولا کہ اے تاج الدین تاج شاہی کے شایاں تو ہی ہے نہ کہ سلطان جلال الدین - دوسرے نے کہا کہ خلجی لوگ امور سلطنت کے قابل نہیں اگر ان میں کوئی ہوشیار اور لائق ہے تو وہ احمد چپ ہے نہ کہ جلال الدین - سب کے سب نشہ میں چور تھے اور ہوا میں قلعے باندھ رہے تھے - اسی حالت میں سب امیروں نے ملکر تاج الدین کوچی کو سلطان منتخب کیا اور اس کے ساتھ بیعت بھی کر لی - اس کے بعد ایک نا عاقبت اندیش نے کہا کہ میں سلطان جلال الدین کو ایک ہی وار میں قتل کر دونگا ' سرافرسان موجود ہی تھے - انھوں نے جاکر سلطان سے تمام داستان مشرح و مفصل کہہ سنائی - جلال الدین نے سب امیروں کو طلب کیا اور اُن پر لعن طعن کرنا شروع کیا ' آخر میں وہ اتنا ناراض ہوا کہ اس نے اپنی کمر سے تلوار کھول کر امیروں نے سامنے پھینک دی اور کہا - ' اے بد مستو آپس میں تو خوب شیخی مارتے تھے اب تم میں سے کون ایسا جوانمرد ہے جو اس تلوار کو اُٹھا کر وار کرنے کی ہمت کرے - اور کہاں ہے وہ شخص جو مجھ سے زور آزمائی کرے - میں یہاں بیٹھا ہوں وہ آئے تو میرے سامنے ' بادشاہ کے اِن کلمات کو سنکر سب امیر دم بخود رہ گئے - لیکن ملک نصرت صباح نے جرأت کرکے زبان کھولی اور کہا - ' خداوند عالم آپ کو معلوم ہے کہ حالت بیخودی میں لوگ کیسی دون کی ہانکتے ہیں - ورنہ ہم لوگ آپ کے واسطے ویسے ہی ہیں جیسےکہ آپ ہم لوگوں کے واسطے - آپ تو ہماری پرورش اپنے اولاد کی طرح کی ہے - پھر بھلا کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہماری

جان لے لیلگے ؟ هملوگوں کو آپ کی طرح حلیم و کریم بادشاہ کہاں ملیگا اور هماری طرح آپ کو امیر ملک کہاں ملیلگے ' - اس خوشامدانہ تقریر کو سنتے هی بادشاہ کا سارا غصہ کافور هو گیا اس نے شراب منگوائی خود پی اور نصرت صباح کو پلائی - دیگر امراء کو ان کے اقطاعوں پر روانہ کردیا - اور ایک سال ان کو دهلی آنے سے منع کردیا - کیا اس طرح کے برتاو سے امیر سلطان کے تابع و مطیع رہ سکتے تھے ؟ چنانچہ ان میں سے بہتوں نے علاءالدین کا ساتھ دیا -

مقتضائے وقت کا لحاظ کرکے علاءالدین نے پہلے تو جلالی امیروں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا - لیکن جیسے هی اِس کي پریشانیاں کم هوئیں اس نے تیغ انتقام سے ان بد بختوں کا کام تمام کیا - بعد ازاں کچھ دنوں تک تو وہ امرائے قدیم کا پاس کرتا رہا - لیکن اکت خاں ' ملک عمر ' منگو خاں اور حاجي مولا کی بغاوتوں کے بعد علاءالدین کو یہ جستجو هوئی کہ آخر ان سازشوں کی وجہ کیا هے ' اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کرنے کے واسطے اس نے مجلس خاص میں ملک حمیدالدین ' ملک اعزالدین ' ملک عین‌الدین ملتانی وغیرہ جہاندیدہ امراء کو طلب کیا - بہت غور و خوض کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ فتنہ و فساد کے چار وجوهات هیں - اول معاملات نیک و بد کے جانب سے ان کی بے اعتنائی دوسرے شراب - تیسرے امراء کے درمیان ربط ضبط اور قرابت‌داری - چوتھے زر یعنی فارغ‌البالی - مختصر یہ کہ علاءالدین کے ذهن نشین یہ بات هوگئی کہ طبقہ امراء کی ترتیب میں اصلاح کی سخت ضرورت هے - چنانچہ اس نے اس امر کی کوشش بلیغ کی کہ اقطاعداری کے دستور کو یکقلم منسوخ کر کے امراء کی طاقت کی جڑ هی کاٹ دے ' اس کے علاوہ اس نے متعدد احکام بھی جاری کئے جنکی رو سے نہ تو امیروں کو

ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت کی آزادی تھی اور نہ بلا حکم سلطانی آپس میں ازدواجی رشتہ قائم کرنے کی اجازت ' محکمہ خفیہ کی نگرانی سے وہ اتنے خائف رہتے تھے کہ اپنے گھروں میں بھی بآواز بلند گفتگو کرنے سے گھبراتے تھے - علاءالدین نے اُن پر وہ رعب جمایا کہ بیان سے باہر ہے - کچھ دنوں کے واسطے بلوہ کا نام تک صفحہ سیاست سے مٹ گیا - اور ملک میں ہر چار سو سکون ہی سکون نظر آنے لگا مگر طبقہ امراء کی زبونی سے سلطنت کے کسی پائدار نفع کی امید کرنا لغو تھا - تجربہ‌کار و ہوشیار امیر اپنی عزت بچانے کے خیال سے سلطان کے ارد گرد پھٹکتے بھی نہ تھے وہ رکن سلطنت بنکر رہنا چاہتے تھے نہ کہ غلام سلطانی ' لامحالہ چاپلوس اور بد اصلوں کی بن آئی - علاءالدین کے زمانے میں طبقہ امراء کی ساخت و پرداخت میں جو تدریجی زوال ہوا اس کا صاف اندازہ ضیاءالدین برنی کی تحریر سے ہو جاتا ہے - وہ لکھتا ہے کہ اس دور میں یکے بعد دیگرے امیروں کے تین گروہوں نے سلطنت کا کام سنبھالا - اول گروہ میں تھے الغ خاں ' نصرت خاں ' ظفر خاں ' الپ خاں ' ملک علاءالملک ' ملک فخرالدین جونا ' ملک اصغرے ' ملک تاج‌الدین وغیرہ - یہ ایسے لوگ تھے جو بادشاہ کی عزت تو کرتے تھے مگر صاف بیانی سے گریز نہ کرتے - دوسرے گروہ میں تھے ملک حمیدالدین ' ملک‌اعزالدین ' ملک عین‌الملک ملتانی ' ملک شرف قائنلی ' خواجہ حاجی وغیرہ - یہ لوگ بھی قابل تھے مگر اتنے صاف گو اور خود مختار نہ تھے جیسے کہ اول گروہ والے - تیسرے گروہ میں تھے ملک نائب کافور ' ملک بہاءالدین ' ملک قیران ' ملک قیرا بیگ وغیرہ جن کو نہ تو امور ملکی میں دخل تھا اور نہ ان میں سمجھ اور دانائی ہی تھی - ان کا شیوہ تھا خود پرستی اور سلطان کی ہاں میں ہاں ملانا - علاءالدین کے

بیمار پڑتے ہی ان لوگوں نے پھر پھیلانا شروع کردیا - تربت بہ ایںجا رسید کہ کافور نے سلطان کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا -

قطب الدین مبارک کے عہد میں امراء کی طاقت میں از سرنو اضافہ ہوا - لیکن خسرو خاں کی تخت نشینی کے قبل اُن کے درمیان کوئی خاص اتحاد و یگانگت قایم نہو سکی - اس ظالم بادشاہ کے جبر و تشدد سے تنگ آکر غازی ملک نے مغلطی حاکم ملتان ' محمد شاہ لر حاکم سیوستان ' بہرام ایبہ حاکم اچھ ' امیر ہوشنگ حاکم جالور ' اور عین الملک ملتانی ' ملک یک لکھی وغیرہ کو خطوط لکھے جس میں اس نے امیروں کو خسرو خاں کے بادشاہ ہو جانے پر غیرت دلائی اور ان کو جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا - اُن امراء پر غازی ملک کے نامۂ وپیام کا اثر پڑا اس کا مشرح حال امیر خسرو نے لکھا ہے - بہرام ایبہ نے تو فوراً ہی اس کی تجویز کو منظور کر لیا مگر مغلطی کے پاس جب خط پہونچا تو وہ بہت بگڑا اور اس نے غازی ملک کو بہت کچھ برا بھلا کہا - جب مغلطی کے ان خیالات کی غازی ملک کو اطلاع ہوئی تو اس نے ملتان کے دوسرے سرداروں کو خفیہ طور پر اشارہ کیا کہ وہ امیر پر حملہ کردیں - اس ہنگامے کا سرغنہ بہرام سراج تھا - مغلطی اپنے ماتحت سرداروں کی یورش سے جان چرا کر بھاگا مگر ایک نہر میں گر پڑا اور جان بحق تسلیم ہوا - محمد شاہ لرُ کے پاس جب قاصد پہنچا تو اس وقت سیوستان کے مقامی سرداروں نے اس کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی اور وہ قلعہ میں محصور تھا - لیکن غازی ملک کے خط کی وجہ سے باغیوں نے امیر سے صلح کر لی - عین الملک ملتانی نے در پردہ اپنی اعانت کا اظہار کیا لیکن بہ ظاہر خسرو خاں کا شریک حال رہا حتی کہ غازی ملک کے پاس سے آئے ہوئے خط کو بھی خسرو خاں کو دکھلا دیا مگر سامانہ کے امیر ملک یک لکھی نے

مخالفت پر کمر باندھی - کھلے کا ملشاء یہ ہے کہ تغلقی انقلاب کے بانی مہانی امیر تھے اور انہیں کی ذاتی اجتماعی امداد سے غیاث الدین کو کامیابی نصیب ہوئی - عہد خلجی ختم اور دور تغلق شروع ہوا -

محمد تغلق نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے پردیسیوں کا ایک نیا گروہ بنایا اور ان نئے امیروں کو سلطنت کا پشت و پناہ بنانے کی کوشش کی - بڑے بڑے اقطاع اور جاگیریں ان لوگوں کو دیں اور وہ اسی امید پر کہ وہ سلطان کے مطیع اور منقاد رہیں گے - لیکن امیروں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور هر چہار جانب علم بغاوت کھڑا کیا ' من می شنوم کہ هر کہ بلغاک میکند از قوت امیر صدگان میکند و میر صدگان از برائے غصب و غارت یار اومی شوند ' (p. 503) - ان لوگوں کی چیرہ دستی سے عاجز آکر محمد تغلق نے عزم کیا کہ وہ ان کی هستی هی کو مٹا دے - چنانچہ بہت سے بد اصل اور کمینہ لوگوں کو اُس نے امیر بنایا مثلاً ملک سردوانندار ' ملک مخلص الملک ' ملک یوسف بغرا ' عزیز خمار وغیرہ اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ امیران صدگان میں سے جو دولت آباد کے علاقہ میں تھے کسی کا بھی وجود روے زمین پر باقی نہ ' ہے - عزیز خمار صوبہ مالوہ کا حاکم مقرر کیا گیا - بادشاہ نے اس کو یہ هدایت کی کہ دھار کے امیر صدگان کا جس طرح بھی ہو وہ کام تمام کردے - دھار پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ھی عزیز خمار نے ۸۰ امیران صد کو طلب کرکے بلاوجہ قتل کرا دیا - اس کی اس حرکت نے سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ زن کردیا - دولت آباد و گجرات دونوں صوبوں میں فتنہ و فساد کی لہریں اُٹھنے لگیں اور محمد تغلق کی آخری زندگی اسی بغاوت کے فرو کرنے میں صرف ہوئی - باغیوں کا پیچھا کرتے کرتے وہ سندہ پہنچا اور وهیں بعارضہ بخار انتقال کر گیا -

فیروز تغلق کے زمانہ میں امیروں کی طاقت میں برابر اضافہ ھی ہوتا رہا لیکن خانجہانی مقبول کی وجہ سے ان کی جانب سے کوئی خاص شر ظہور پذیر نہ ہوا - مگر جب سلطان بڈھا ہوگیا اور خانجہان بھی اس دار فانی سے رحلت کر گیا اسی وقت سے بندگان نے اپنی طاقت کو آزمانا شروع کر دیا - وزیر مرحوم کا لڑکا جس کو کہ فیروز شاہ نے اس کے والد کا شغل و خطاب عطا کیا تھا اتنا مغرور و مطلق العنان ہو گیا کہ امور سلطنت بالکلیہ اسی کے ہاتھ میں آ گئے - تمام امیر و رئیس بھی اس کا دم بھرنے لگے - اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا تھا تو وزیر کسی نہ کسی حیلہ سے اس کی جان لے لیتا تھا - اب اس نے اس امر کی کوشش کی کہ سلطان اور اس کے لڑکے محمد خاں کے درمیان ناچاقی پیدا کرادے چنانچہ یہ کہکر کہ شہزادہ جلد امیروں کی اعانت سے بہت جلد فتنہ بپا کرنے والا ھے وزیر نے فیروز تغلق سے اس بات کی اجازت حاصل کر لی کہ وہ محمد خاں اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لے - جب شہزادے پر یہ عقدہ کھلا تو وہ از حد پریشان ہوا اور اس نے خفیہ طریقہ پر اپنے والد کے پاس جاکر وزیر کی زیادتی کا حال کہہ سنایا - فیروز نے اس دفعہ محمد خاں کو حکم دے دیا کہ وہ جاکر وزیر کو گرفتار کرلے - لچھلی سرھندی لکھتا ھے - ' ملک یعقوب آخور بیگ اسپان پائگاہ را بتمام و ملک قطب الدین فرامرز شحنہ پیل ھمہ پیلان را باعماری و برگستوان بر شاھزادہ آوردند - بندگان فیروز شاھی و امرائے دیگر و خلق شہر نیز بیشترے باو یار شدند ' یہ اول موقع تھا جب کہ سیاسی امور میں بندگان فیروزی نے حصہ لیا - اب ان کو اپنی طاقت کا احساس ہو گیا - اور وہ متواتر سیاسی چالوں میں دلچسپی لینے اور بازی لگانے لگے جب محمد شاہ تخت پر بیٹھا تب کہیں جا کر بمشکل تمام بندگانِ فیروزی کی طاقت کا خاتمہ ہوا -

اس سلطان نے ان لوگوں کے تمام ہاتھی ضبط کر لئے اور ان کو بالکل ہی بیکار کر دیا - مگر غلاموں کے پسپا ہو جانے کے بعد بھی امیروں کا زور کم نہ ہوا - وہ جس کو چاہتے تھے اُسی کو سلطان بناتے تھے صرف خیال اتنا رکھتے تھے کہ ان کی کٹھ پتلی کا تعلق فیروزی خاندان سے ہو - چنانچہ غیاث‌الدین ثانی بندگان فیروزی کی امداد سے سلطان بنا - لیکن ان کا کیا اعتبار تھا کچھ ہی عرصہ بعد یہ لوگ رکن‌الدین خلدہ نائب وزیر سے جا ملے - انہوں نے غیاث الدین کو قتل کرکے ابوبکر کو تخت پر بٹھلایا - پھر بہت جلد اُس سے بھی برگشتہ ہوگئے - اور اُسے تخت سے اُتار دیا - اس نے بھاگ کر کوتلہ بہادر میں پناہ لی - مسلمانوں کے باہمی نفاق کا نتیجہ یہ ہوا کہ "کفار ہندوستان قوت گرفتند و دست از اداے جزیہ و خراج باز کشیدند و قصبات مسلمانان را نہب می کردند" - کچھ دنوں تک بہادر ناہر ابوبکر کی طرف سے لڑتا رہا لیکن شکست فاش کھانے کے بعد اس نے محمد شاہ کی اطاعت قبول کر لی - محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کا دوسرا لڑکا علاؤالدین سکندر شاہ تخت پر بیٹھا لیکن دو ماہ کے اندر ہی اندر وہ رحلت کر گیا - اس کے مرنے پر ناصرالدین محمود شاہ سریر آرا ہوا - اب تغلقوں کی سلطنت کا دائرہ بہت ہی تنگ ہوگیا تھا مگر محمود شاہ سلطان ہند ہی کہلاتا تھا - اس کی تمام عمر اپنے امیروں سے ہی لڑتے گذری - ہر امیر اپنے اپنے اقطاع میں خود مختار ہو گیا تھا اسی واسطے اس زمانہ کو عہد طوائف‌الملوکی کہتے ہیں - مقرب خاں ، ملو اقبال خاں وغیرہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے ہنگامہ بپا کردیا تھا -

ولایات اعلیٰ خضر خاں نے پنجاب اور دہلی دونوں کو اپنے ماتحت کر لیا - مگر دوآب وغیرہ کے لوگوں نے اس سے سرتابی کی - سرہند میں

بھی بھرم خان مرحوم کے عزیز و اقربا نے فتنہ‌انگیزی کی - اب انکا سرغنہ ملک تغان تھا - اس نے ایک عرصہ تک سرکاری افسروں کو تنگ کیا - بداؤں کے اقطاعدار مہابت خاں نے بھی رایات اعلیٰ کے خلاف سازش کی اور اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی ورغلایا - اس طرح وقتاً فوقتاً امیر و کبیر خضر خاں کو آزار پہنچاتے رہے - جب سید معزالدین مبارک شاہ کی تخت نشینی کی باری آئی تو اس کو بھی انہیں دقتوں کا سامنا ہوا جو کہ اس کے والد کو پیش آئی تھیں - سرورالملک کے کہنے سے اُس نے بہت سے حاکموں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ کیا مثلاً سکندر تحفہ کو عہدۂ وزات سے معزول کرکے وہ جگہ سرورالملک کو دی اور اس کے بھتیجے کو دھلی کا حاکم بنایا - سکندر تحفہ کو لاھور بھیجا - اور محمود حسن کو جلندھر - ان تبدیلوں سے امراء کے درمیان ایک شورش پیدا ہوئی - بالاخر انہوں نے ملکر سلطان کو قتل کرڈالا - اس کام میں سب سے نمایاں حصہ سرورالملک نے لیا - سلطان مبارک کے قتل کے بعد امیروں نے اس کے بھتیجے کو تخت پر بٹھایا - اب انکو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح سے سرورالملک کی طاقت کو تہ و بالا کردیں چنانچہ ایک عرصہ تک خانہ جنگی ہوتی رہی - محمد شاہ بظاہر سرورالملک کے ساتھ تھا لیکن خفیہ طور سے اس کے دشمنوں سے ملا ہوا تھا - جب سرورالملک کو یہ پتہ چلا تو اس نے سلطان کو تلوار کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش کی مگر وہ ناکامیاب رہا اور خود مقتول ہوا - محمد شاہ نے کمال‌الدین کو وزیر بنایا - ملک چمن کو غازی‌الملک کا خطاب دے کر امروھہ و بداؤں اس کے سپرد کئے - الہاداد لودی کے بھائی کو دریا خاں کا خطاب دیا اور حصار کا اقطاع ملک خیراج کو دیا اور حسام خاں کو دارالخلافت کا حاکم مقرر کیا - یہ انتظام کر کے سلطان عیش و عشرت کا شکار ہوگیا - ادھر تو سر ھند کے

نئے حاکم بہلول لودی نے پنجاب میں اپنا سکہ جمانا شروع کیا دوسری طرف دھلی کے امیروں نے یہ دیکھکر کہ بادشاہ تو امور حکومت میں کوئی دلچسپی ھی نہیں لیتا ھے محمود خلجی والی مالوہ کو دعوت دی کہ وہ آکر تخت دھلی پر رونق افروز ھو - محمود کو بھلا کیا عذر ھوسکتا تھا - ایک جرار فوج لے کر دھلی پر چڑہ آیا - سید محمد شاہ نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بہلول لودی سے امداد طلب کی - بہلول نے اس شرط پر مدد دینا قبول کیا کہ سلطان حسام خاں کو قتل کرادے - محمود خلجی کی واپسی کے بعد محمد شاہ نے بہلول کو بہت کچھہ مال انعام و اکرام میں دیا - محمد شاہ کے بعد جب عالم شاہ تخت پر بیٹھا تب امراء تمام ملک پر قابض ھو چکے تھے - لاھور و پنجاب بہلول کے زیر تصرف تھے - سنبھل دریا خاں لودی کے قبضہ میں تھا اور اسی طرح سے اور اضلاع بھی امیروں نے غصب کر لئے تھے - یہاں تک کہ عالم شاہ نے جب دیکھا کہ دھلی میں بھی رھنا دشوار ھے تو وہ بھاگ کر بداؤں میں جا بسا - دھلی میں حسام خاں اور حمید خاں اپنی من مانی کرنے لگے -

بہلول لودی کے عہد میں افغانی امیر سلطان کے مطیع و منقاد رھے وجہ یہ کہ وہ اُن کے ساتھہ برادرانہ سلوک کرتا تھا اور کبھی بھی ان پر رعب غالب کرنے کی کوشش نہ کرتا ، اس کو اپنے امیروں کی رضاجوئی اس قدر منظور تھی کہ دعوت کے وقت نہ تو وہ خود تخت پر بیٹھتا اور نہ امیروں کو کھڑا ھی رھنے دیتا - دربار عام کے موقع پر بھی وہ محض ایک قالین پر بیٹھہ جاتا تھا - صاحب تاریخ داؤدی رقمطراز ھے کہ فرامین میں وہ امیروں کو مسند اعلیٰ کے لقب سے مخاطب کرتا تھا - اگر کسی وقت کوئی امیر سلطان سے رنجیدہ ھو جاتا تو بہلول ھر طریقہ سے اس کی

دل جوئی کرتا تھا - وہ اس کے گھر جاتا اور کمر سے اپنی تلوار کھول کر اس کے سامنے رکھدیتا - کبھی کبھی ایسا بھی کرتا کہ اپنی پگڑی اتار کر امیر کے سامنے رکھدیتا اور معافی مانگتا اور کہتا کہ " اگر آپ مجھے اس عہدے کے قابل تصور نہیں کرتے تو کسی اور کو منتخب کرلیجئے اور مجھے کوئی اور شغل دے دیجئے" اتنے عجز و انکسار کو دیکھکر بھلا کس امیر کا ایسا کڑا دل ہوسکتا تھا جو نہ پسیجتا - ایسے سیدھے سلطان کے خلاف بغاوت کی کیا ضرورت تھی - لیکن یہ بات خیال رکھنا چاہئے کہ بہلول نے یہ طرز عمل مقتضاے وقت کو مدنظر رکھکر اختیار کیا تھا - بذات خود نہ تو وہ کمزور ہی تھا اور نہ بد عقل - بات یہ تھی کہ اس کو اس وقت اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے ہموطنوں کی امداد سے اپنے پایہ کو مضبوط و مستحکم بنالے لیکن آئندہ چل کر یہ طرز عمل سلطنت کے واسطے ضرر رساں ثابت ہوا - جب بہلول گوالیر سے اتاوہ ہوتا ہوا دہلی کی جانب واپس ارہا تھا تو سکیت کے مقام پر سخت بیمار ہوگیا - اس کی خراب حالت کو دیکھکر امیروں نے سازش شروع کردی - سلطان نے تو یہ انتظام کیا تھا کہ اس کی وفات کے بعد تخت و تاج کا وارث اس کا دوسرا لڑکا نظام خاں ہو - مگر افغانی امیروں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ نظام خاں چونکہ ایک سنارن کے بطن سے پیدا ہے اس لئے وہ تخت شاہی کا حقدار نہیں ہو سکتا - یہاں تک تو امیروں کے درمیان اتفاق تھا مگر اس بات کا فیصلہ کرنا کہ پھر کون وارث ہوگا محال تھا چنانچہ طبقہ امراء تین گروہوں میں منقسم ہو گیا - اول تو وہ جو نظام خاں کے طرفدار تھے دوسرے وہ جو باربک شاہ والی جونپور کی حمایت کر رہے تھے اور تیسرے وہ جو کہ اعظم ہمایوں کے حقوق پر زور دے رہے تھے ' اس بنا پر کہ وہ سلطان کے سب سے

بڑے لڑکے کا لڑکا تھا - کہنے کا مطلب یہ ھے کہ موقع پاتے ھی امیروں نے خود غرضی اور خود پرستی کی روش اختیار کی - خوش قسمتی سے سکندر اتنا ھوشیار اور سمجھدار تھا کہ اس نے نہایت ھی خوش اسلوبی سے امیروں کو اپنے ھاتھ میں رکھا اگر چہ اس میں شک نہیں کہ اس نے انکے حقوق میں بہت کچھ کمی کردی اور یہ بات بھی انکے ذھن نشین کرانے کی کوشش کی کہ سلطان کی اطاعت کرنا انکا فرض ھے - اور اب برادرانہ سلوک کا زمانہ نہیں رھا - تاھم جہاں تک ممکن تھا اس نے بلا وجہ امیروں کو ناراض نہیں کیا - مگر امیر اپنی خصلت جبلی سے باز نہ آئے - سلطان کے خلاف انہوں نے سازش بھی کی اور اس کو تہ تیغ کرنے کا انتظام بھی کیا - لیکن سکندر ھر وقت آنکھ کھول کر کام کرتا تھا یہی وجہ ھے کہ وہ عرصہ دراز تک کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رھا - یہ پتہ چلتا ھے کہ اسی کے عہد سے یہ رسم جاری ھوئی کہ کچھ معتمد امیر باری باری سے محل شاھی پر شب کو پہرا دیا کریں - امیروں کو ھوش میں رکھنے کی یہ نہایت ھی عمدہ تدبیر تھی - اس سے ان کو ھر وقت اس بات کا احساس ھوتا رھتا تھا کہ ان کا اصلی رتبہ کیا ھے -

سکندر کی وفات کے بعد جب ابراھیم تخت نشین ھوا تو ایک بار پھر امیروں نے اس بات کی کوشش کی کہ خاندان شاھی میں خانہ جنگی کے بیج بو دیں - انہوں نے نئے سلطان کو رائے دی کہ وہ جونپور اپنے بھائی جلال خاں کے حوالہ کردے - ابراھیم راضی ھوگیا - اور جلال خاں معہ کچھ امیروں کے جونپور چلا بھی گیا - مگر راپری کے حاکم خانجہان نوحانی نے اس کارروائی کے خلاف آواز بلند کی - اس نے درباری امیروں کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور ابراھیم کو رائے دی کہ جلال خاں کو واپس بلالے - مگر چڑیا اب پنجرے سے اڑ گئی تھی - جلال خاں

بھلا کیوں واپس آتا - اور شاید آ بھی جاتا تو پھر اسے کب آنے دیتے - چنانچہ ابراھیم کا بہت سا قیمتی وقت اس جونپور والے ھنگامہ کے فرو کرنے میں صرف ہوا۔ وہ امیروں کی جانب سے بد ظن ہوگیا اور اس نے ان کو پسپا کرنے کے لئے ہر جایز و ناجایز طریقہ اختیار کیا - دربار میں وہ انہیں کھڑا رکھتا تھا - اور طرح طرح سے انہیں ذلیل و خوار کرتا تھا - بہتوں کو اس نے قید کر لیا اور انہیں قتل کروا دیا - نتیجہ یہ ہوا کہ امیر سرکش ہو گئے اور انہوں نے ہر طرف شورش بپا کی - اعظم ہمایوں گوری دریا خاں نوحانی ' میاں حسن قوملی ' ناصر خاں نوحانی ' وغیرہ نے بغاوت کی آگ کو بھڑکایا - اُدھر پنجاب میں دولت خاں لودی نے سلطان کی درشت خوئی سے بچنے کے لئے بیرونی امداد حاصل کرنے کا انتظام کیا - دور سلطنت کا یہ آخری سیاسی انقلاب تھا جس کے بانی امیر تھے اور جس کے بعد ھندوستان کی تاریخ کا آغاز ایک نئے عنوان سے ہوتا ہے -

اس مجمل تبصرہ سے طبقہ امراء کی سیاسی اھمیت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے - ظاہر ہے کہ ان کی ہستی امور ملکی کے واسطے کتنی ضروری تھی - کتناھی ہوشیار اور ذی فہم بادشاہ کیوں نہ ہو مگر بلا صلاح و مشورہ کے اس کے واسطے سلطنت کا کام چلانا غیر ممکن تھا - بلبن ' علاءالدین خلجی ' محمد تغلق ایسے مطلق العنان فرمانرواؤں کو بھی مشورے کی ضرورت پڑتی تھی - اس کے علاوہ ایک شخص کے واسطے تن تنہا مشکل تھا کہ نظام حکومت کی ہر ایک بات کو ذھن میں رکھ سکے - دوسرے اتنی بڑی سلطنت کے انتظام کے واسطے حکام و عہدہ داران چاھئے تھے - سلطان انہیں لوگوں کا اعتبار کر سکتا تھا جن کو اس کا قرب حاصل تھا اور جن کو قرب حاصل تھا ' ان کا شمار دائرہ امارت میں کیا جاتا تھا - پس اگر سلطنت کو ایک جثہ انسانی سے تشبیہ دیجارے تو سلطان بمنزلہ

حرارت غریزی ہے اور امیر اس کے اعضاء - جب تک کہ جسم کے ان دونوں حصوں میں ٹھیک تناسب قائم رھتا تھا امور سلطنت بآسانی انجام پاتے رھتے تھے - لیکن ان میں سے اگر کسی میں بھی فرق پڑ جاتا تو سیاسی فضا میں ایک ھنگامہ برپا ھو جاتا تھا - حرارت کے بڑھنے اور گھٹنے دونوں حالتوں میں تمام اعضا بیکار ھوجاتے تھے - یعنی یہ کہ اگر سلطان بالکل ھی امیروں کی پروا نہ کرتا تب بھی سلطنت کو نقصان پہنچ جاتا تھا کیونکہ انتہا درجہ کی مطلق‌العنانی سے سوائے ضرر کے نفع کی کم امید ھوتی ہے یا اگر سلطان امیروں پر ھی سلطنت کا سارا بار ڈالدیتا اس حالت میں بھی نفع کے بجائے نقصان ھی ھو جاتا تھا پس حکومت کے ان پرزوں کو کا آمد رکھنے کے لئے سلطان کو نہایت ھی دور اندیشی و دانشمندی سے کام لینا پڑتا تھا - لیکن کوئی خاندان تا بہ ابد قائم نہ رہ سکتا تھا اسلئے ایسے قابل لوگوں کی بھی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی رھتی تھی جو موجودہ خاندان کی تباھی کے بعد ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈال سکیں - عہد سلطنت کے امیروں نے اس کام کو نہایت ھی خوش اسلوبی سے انجام دیا - پس اگر ان کے کئے ھوئے انقلابات کے برے پہلو ھیں تو اچھے بھی ھیں -

طبقہ امراء کی سیاسی حیثیت و قدرت پر بحث کرنے کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ھوتا ہے کہ کچھ روشنی اس کے اقتصادی و معاشرتی حالات پر بھی ڈالی جاوے - اس میں شک نہیں کہ امیروں کے پاس روپیہ کثرت سے ھوتا تھا - ممالک غیر سے لوگ آتے ھی اس لالچ سے تھے کہ ھندوستان میں خوب زر اندوزی کریں گے - دوسرے عہد سلطنت کے آغاز میں فرمانرواؤں نے ملک کو تسخیر کرنے کی ایک عجیب و غریب ترکیب سوچی تھی ' وہ یہ کہ جب کوئی سردار افغانستان وغیرہ سے آتا تھا

تو اس کے حوالہ کوئی غیر مسخر علاقہ کردیا جاتا تھا - اس کو پوری آزادی رہتی تھی کہ کسی طرح سے بھی اس پر قبضہ کرلے ' جو کچھ مال غنیمت اس کے ہاتھ لگے وہ سب اپنے پاس رکھے ' کبھی کبھی اس میں سے تھوڑا بہت بطور تحفہ سلطان الوقت کے پاس بھیجدیا جاتا تھا - اختیارالدین بن بختیار خلجی کے کار نامے اس رویہ کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں - ایسے سرداروں سے صرف اتنی ہی امید کیجاتی تھی کہ وہ سکہ و خطبہ سلطان کے ہی نام کا ملک مفتوح میں جاری رکھیں - دوسرے ہندوؤں کی سرکشی کو دور کرنیکے واسطے سلاطین کو متواتر جنگ کرنا پڑتی تھی - دوران جنگ میں دشمنوں کے مال و جائداد کو چھین لینا قطعاً جائز تھا - امراء کی آمدنی کا یہ دوسرا ذریعہ تھا - اس کے علاوہ امراء کی اصلی آمدنی اقطاع و شغل سے ہوتی تھی - ہر ایک بڑے امیر کے تعلق سلطنت کے کسی نہ کسی شعبہ کا انتظام کر دیا جاتا تھا - اُس شعبہ کی آمدنی کا کچھہ حصہ تو وہ خزانہ عامرہ کو بھیجدیتا تھا اور بقیہ یا تو اپنی فوج پر صرف کرتا تھا یا اس کو اپنی جیب میں رکھتا تھا - اس عہد میں سرکاری عہدہ داران کی کیا تنخواہ تھی ؟ اس کا مسلسل اندازہ کرنا تو ممکن نہیں لیکن مورخین نے وقتاً فوقتاً جو واقعات قلمبند کئے ہیں اُن سے کچھہ موٹے موٹے نتایج ضرور نکالے جا سکتے ہیں - مثلاً التمش نے ملک سیف‌الدین ایبک کو سر جامداری کی جگہ پر متعین کرتے وقت اس کی تین لاکھہ جیتل تنخواہ مقرر کی - مگر سیف‌الدین کو اس سے اطمینان نہ ہوا ' جب التمش کو یہ معلوم ہوا تو اس نے سیف‌الدین سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے - سیف‌الدین نے ترتے ترتے جواب دیا ' جہاں پناہ آپ نے فدوی کو ایسے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز کیا ہے کہ جہاں رہکر ہندو و مسلم رعایا کو زر اندوزی کی غرض سے

سکانا غیر ممکن ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر شان و شوکت قایم رکھنے کی ہے نہیں ' جلال‌الدین فیروز خلجی نے جوش سخاوت میں آ کر ایک ملدھر کے لڑکے کو وکیلدار مقرر کیا اور اس کی تنخواہ ایک لاکھ جیتل - جب کہ جلال‌الدین نائب سامانہ اور مقطع کیتھل تھا اس وقت ایک بار اس ملدھر کے والد سے اس کا مقابلہ آن پڑا - ملدھر کی تلوار سے جلال‌الدین کے چہرہ پر ایسے زخم کاری لگے جن کا کہ نشان تمام عمر رہا - چنانچہ اس ملدھر کی جلادت کا خیال کرکے جلال‌الدین نے اس کے لڑکے کو مورد عنایات کیا - صاحب مسالک‌الابصار نے محمد تغلق کے عہد کے عہدہ داران کی تنخواہ کا ذکر کیا ہے - مثلاً اس کے چاروں وزیر بیس سے لیکر چالیس ہزار تنکہ سالانہ تنخواہ پاتے تھے - دبیران خاص کی تنخواہ دس ہزار تنکہ سالانہ تھی - اور کچھ کی تنخواہ پچاس ہزار تنکہ تک ہوتی تھی - صدر جہاں اور شیخ‌الاسلام کو ساٹھہ ہزار تنکہ سالانہ ملتے تھے - اور محتسب کو ایک گاؤں ملا ہوا تھا جس کی آمدنی آٹھہ سو تنکہ تھی - خان کی تنخواہ ۲ لاکھہ تنکہ ہوتی تھی - اس میں سے اُسے کچھہ بھی فوج پر صرف نہ کرنا پڑتا تھا - ملک کی تنخواہ پچاس ساٹھہ ہزار تنکہ کے درمیان ہوتی تھی اور امیر کی تیس چالیس ہزار کے درمیان - سپہ‌سالار کی تنخواہ تقریباً بیس ہزار تنکہ - دیگر حکام کی ایک ہزار سے لیکر دس ہزار تک - مملوک پانچسو تنکہ سالانہ پاتے تھے - یہ تنخواہ انکو نقد دی جاتی تھی - اغلب ہے کہ شہاب‌الدین کے بیان میں مبالغہ ہو - لیکن ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ جب محمد تغلق نے خداوند زادہ ضیاءالدین کو میر داد مقرر کیا تو اس کو پچاس ہزار دینار سالانہ کی جاگیر بھی عطا کی - خود ابن بطوطہ کو پہلے پہل پانچ ہزار کی جاگیر ملی - اس کے بعد اس کی تنخواہ بارہ ہزار دینار سالانہ ہو گئی - سراج عفیف لکھتا

ھے کہ فیروز شاہ نے اپنی وزیر خانجہاں کی تیرہ لاکھ تنکہ تنخواہ مقرر کی اور اس کے امیروں میں سے کسی کی بھی تنخواہ چھہ یا آٹھ لاکھ تنکہ سے کم نہ تھی - چنانچہ اس عہد میں جتنے خان اور ملوک تھے سب دس روپیہ سے مالا مال تھے - جب ملک شاھین شحنہ و نائب امیر مجلس خاص نے انتقال کیا اور اس کے مال متروکہ کی جانچ کی گئی تو پچاس لاکھ تنکہ نقد علاوہ دیگر جواھرات و نفائس کے ملے - اسی طرح سے عمادالملک بشیر سلطانی کے بارے میں عفیف نے لکھا ھے کہ اس کے پاس کروروں روپیہ تھا - ایک بار اسکو ٹاٹ کی تھیلیاں بنوانے کی ضرورت پڑی تو ڈھائی ھزار تنکوں کا ٹاٹ خرید کیا گیا - جب عمادالملک کے سامنے روزانہ کا حساب پیش ھوا تو اس نے اس رقم پر اعتراض کیا اور کہا جبکہ خزانہ زیادہ ھو گیا ھے تو اس کو تھیلوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں اس کو کھتوں میں غلہ کی طرح بھر دینا چاھئے چنانچہ ایسا ھی کیا گیا - عہد لودی میں ایک امیر میاں معتمد کالا پہاڑ کے پاس ۳۰۰ من سونا تھا - زمانۂ سلطنت میں اس قسم کی کثرت سے مثالیں ملتی ھیں جن سے کہ امیروں کی امیری میں کوئی شک نہیں رھجاتا ھے -

لیکن یہ امیر جتنے روپیہ کے امیر تھے اتنے دل کے بھی تونگر تھے چونکہ اُن کی تمام دولت و جائداد ذاتی ھوتی تھی اسواسطے اُن کو کفایت شعاری کا مطلقاً خیال پیدا نہوتا تھا - دوسرے اپنی شان و شوکت قایم رکھنے کیلئے انکو لازم تھا کہ وہ فراغ دلی سے خرچ کریں - بلبلی امیر ملک علاءالدین کشلیخاں کے بارے میں روایت ھے کہ جود و بذل میں یکتائے روزگار تھا - اس وقت خواجہ شمس معین بقید حیات تھا اس نے ایک نظم علاءالدین کی مدح میں لکھی اور درگاہ بلبلی کے مطربوں کو یاد کرادی -

جب وہ پڑھی گئی تو علاءالدین نے اپنے اصطبل کے تمام گھوڑے شمس معین کو بطور انعام کے دیدئے اور مطربوں کو دس ہزار تنکہ دیئے - اسی زمانہ میں ایک اور ملک تھا جس کا نام تھا عمادالملک راوت عرض - اس کے ساتھ کچہری کے ۵۰ یا ۶۰ اہلکار روز کھانا کھاتے تھے - اس کو پان کھانیکی اتنی عادت تھی کہ پچاس یا ساٹھہ تنبولی ہر وقت پان لگانے میں مصروف رہا کرتے تھے - تیسرے ملک فخرالدین کوتوال دھلی کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے یہاں دس بارہ ہزار قرآن خوان ملازم تھے - وہ ہر روز ایک نیا جوڑا پوشاک کا پہنتا تھا اور اترے ہوئے لباس کو انعام میں دیدیتا تھا اتناهی نہیں بلکہ اس کی چارپائی اور بسترے بھی روز نئے ہوتے تھے - ہر سال ہزاروں لڑکیوں کے واسطے جہیز فراہم کرتا تھا - ایسے ہی بلبنی دور میں ایک اور امیر تھا جس کا نام امیرعلی سر جامدار تھا امیر خسرو اسی کے پاس ملازم تھا - یہ امیر سو تنکہ سے کم کبھی کسی کو دیتا ہی نہ تھا - لفظ جیتل تو اس کی زبان سے نکلتا ہی نہ تھا اسکی سخاوت کی خبر سن کر بلبن کو بڑی خوشی ہوتی تھی - ایک بار بادشاہ نے اسکو طلب کیا اور کہا - اے امیرعلی میں نے سنا ہے کہ تو شراب کے نشہ میں ہو کر اتنی دریادلی سے دولت لٹاتا ہے - مانئے کی تو جب بات ہے کہ اگر تو ہوش وحواس کے عالم میں کسی کو کچھہ دے - یہ سنتے ہی امیرعلی نے شراب سے توبہ کرلی لیکن اپنی سخاوت میں ذرا بھی کمی نہ کی بلکہ اسمیں افزائش ہی کی - برنی لکھتا ہے کہ بلبن کے زمانہ میں اسکے امیروں کے درمیان حسد نہ تھا بلکہ اگر ایک کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں کے یہاں پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ہیں تو وہ اپنے یہاں ایک ہزار کو کھلاتا - اسی طرح سے اگر کسی کو پتہ چلتا کہ فلاں سواری کے وقت دو سو تنکہ صدقہ دیتا ہے تو وہ چار سو دیتا حتیٰ کہ کثرت ایثار کی وجہ سے امراء ملک ہمیشہ قرض کے نیچے سے دبے رہتے تھے -

جس وقت کہ جلال الدین فیروز خلجی عرض ممالک تھا اُسی زمانہ سے اس نے امیر خسرو کی سرپرستی شروع کردی اور بارہ ہزار تنکہ جو کہ امیر کے والد کا وظیفہ تھا اس کے لئے مقرر کر دیا - اس کے زمانہ میں ملک قطب الدین علوی تھا جو کہ بیرون اندازہ خیرات کرتا تھا - روایت ھے کہ اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے موقع پر اس نے دو لاکھ تنکے صرف کئے اور عقد والے دن سو گھوڑے مع ساز کے اس نے بخشش میں دئے اور ایک ہزار آدمیوں کو جوڑے پہنائے - اُسی کا ساتھی تھا ملک احمد چپ جس نے ایک روز شاہی مطربوں اور ندیموں کو مدعو کیا اور ان کو ایک لاکھ تنکے انعام میں دئے اور دو یا تین سو خلعتیں دیں - ملک نصرت صباح کی ایسی عادت تھی کہ وہ کسی سائل کو اپنے در سے واپس نہ کرتا اور کسی نہ کسی طرح سے اس کی حاجت براری کرتا - اپنی سخاوت کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا تھا اور قرض خواہ اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے - علاءالدین کے عہد میں تو امیر قریب قریب مفلس ہی ہوگئے - اس کی وفات کے بعد امیروں نے پھر سے دولت جوڑنا شروع کی - اس کے بھتیجے کے وزیر خسرو خاں کا بہت بڑا عملہ تھا اور جب موقع آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹایا - غیاث‌الدین کے زمانہ میں کسی ایسے امیر کا ذکر نہیں ملتا جو روپیہ صرف کرنے میں عالی حوصلہ ہو - مگر محمد تغلق کے عہد میں کئی مثالیں اس قسم کی دستیاب ہوتی ہیں - میر قبول ایک ایسا امیر تھا جو صرف اپنے ذاتی عملہ پر ۳۰ ½ لاکھ تنکے سالانہ صرف کیا کرتا تھا - ابن بطوطہ اگرچہ معمولی عہدہ دار تھا تب بھی ہمیشہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے عاجز رہتا - چنانچہ اس اذیت سے نجات پانے کے لئے اس نے سلطان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں خزانہ عامرہ سے اس کا قرضہ ادا کر دیا گیا - فیروز

تغلق کے عہد میں بشیر سلطانی نے چار ہزار زر خرید غلاموں کو آزاد کر دیا اور ان کو انعامات بھی دئے - وزیر خانجہان نے ایک جوڑ موزے پر اسی ہزار تنکے صرف کئے - قاضی صدر الملک کے لڑکے نے ایک طوائف سے تعلق کر لیا تھا جس کے واسطے ہر روز پانچ چونہ مرواریدی درکار ہوتا تھا - اور یہ فراہم کیا جاتا تھا - سید اور لودیوں کے عہد میں امراء کا یہی رویہ جاری رہا -

دولت کی کثرت کی وجہ سے یہ لازم نہ تھا کہ امیر لوگ نالایق ہوتے برخلاف اِس کے چونکہ اس دور کے بادشاہ خود تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور علوم و فنون کی سرپرستی کرتے تھے اس لئے امراء کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ اپنے ذاتی صفات کو ترقی دیتے رہیں ' یہ لوگ علما و فصحا کی صحبت سے ہمیشہ فیض‌یاب ہوتے رہتے تھے اور اپنی لیاقت کو بڑھانے کا کوئی موقع چھوڑتے نہ تھے - ان کو اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ بغیر لیاقت کے امور ملکی میں کامیابی و عروج حاصل ہونا غیر ممکن تھا - منہاج سراج نے لکھا ہے کہ التمش کے امیر حاجب نے پڑھنے لکھنے میں اتنا وقت صرف کیا کہ وہ ہر دلعزیز ہوگیا - امیر صرف سپاہی نہ ہوتے تھے بلکہ منشی و دبیر بھی - بلبن کے زمانہ میں تودرس و تدریس ' شعر و شاعری کا اتنا چرچا ہوا کہ سلطنت کے امیر کے پاس شعراء و فضلا کا ایک گروہ رہنے لگا - اور جس طرح امیر لوگ بذل و سخا میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے ویسے ہی علمی لیاقت میں بھی - دیسی لوگوں کو طبقۂ امراء سے الگ کرنے میں شاید بلبن کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ ملک میں علم کی اشاعت بڑھے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نو مسلموں کی جو کہ زیادہ تر ادنیٰ فرقوں کے ہوتے تھے اتنی جلدی علمی استعداد بڑھنا غیر ممکن تھا - یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عموماً امیر تعلیم یافتہ ہوتے

تھے - ان میں سے اکثر کی تصنیفات کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے - مثلاً قوام الدین علائی جس نے فتح‌نامہ لکھوتی تصنیف کیا - کبیرالدین پسر تاج الدین عراقی جس نے تاریخ علائی لکھی - تاتار خاں جس نے تفسیر تاتار خانی اور فتاوائے تاتار خانی تصنیف کئے - ان کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں اسی قسم کی دستیاب ہوسکتی ہیں - اس سے ظاہر ہے کہ عہد سلطنت میں طبقہ امرا نے اپنی محنت و جانفشانی - جود و سخا سے نخل علوم و فنون کو سرسبز و شاداب رکھا -

مگر اعلی تعلیم نے ان کے طرز معاشرت پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا - اور ان لوگوں میں وہ تمام نقص قائم رہے جن کا کہ آج تک امیروں سے تعلق ہے - بجز معدودے چند کے سب ہی کو شراب نوشی کی عادت تھی - اس کے ساتھ قمار بازی بھی ہوتی تھی - نصرت صباح کے بارے میں برنی نے تحریر کیا ہے کہ جس مجلس میں وہ جاتا تھا جوا ضرور کھیلتا تھا - اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ اعلی پیمانہ پر - رقص و سرود کی محفل تو روزانہ ہی کسی نہ کسی امیر کے یہاں جمی ہی رہتی تھی - مطربوں اور سازندوں کی حد سے زیادہ مانگ تھی - اگر رقص و سرود کی نفاست ہی کسی زمانہ کی تہذیب کا معیار ہے تو واقعی امرا و سلاطین کی سرپرستی سے یہ فن اس عہد میں کمال کو پہنچ گیا تھا - جس کا شاہد ضیاءالدین برنی ہے - اس کے علاوہ بادشاہوں کی طرح امیر بھی متعدد شادیاں کرتے تھے اور کثیرالاولاد بھی ہوتے تھے - چنانچہ عفیف کا قول ہے - ' خانجہاں را پسراں بسیار بودند زیرا چہ او رغبت بحرم بسیار داشت و برائے جمع کردن حرم کوشش بسیار گماشت - کنیز کان صاحب جمال باکمال در حرم خود جمع کنانید چنانچہ گویند دو ہزار کنیزک از زمین روم و چین در حرم خود داشت ' - امیر اپنی عورتوں کو

پردے میں رکھتے تھے - تاتار خاں اپنی کنیزکوں کو گھوڑوں پر سوار نہ ہونے دیتا تھا بلکہ بھرکہ میں بٹھلا کر ایک جگہہ سے دوسری جگہہ جانے دیتا تھا اور اُن کے پردے کا معقول انتظام رکھتا تھا - لیکن اس عہد میں بھی بعض امیر ایسے ہوتے تھے جو اپنی عورتوں کو گھوڑوں پر سوار کرکے اپنے ساتھہ سیر و شکار میں لے جاتے تھے - لیکن یہ رواج عام نہ تھا - ابن بطوطہ لکھتا ہے - ' عورتیں اس ملک میں ڈولیوں میں آتی جاتی ہیں........ اور ان ڈولیوں پر ریشم کے پردے پڑے رہتے ہیں ' - امیروں کے درمیان دعوت کی ترتیب اور اُس کے آداب کیا تھے اس کا مشرح حال ابن بطوطہ کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے :—' پہلے روٹیاں لاتے ہیں جو نہایت پتلی پتلی چپاتیاں ہوتی ہیں - بکری کو بھون لیتے ہیں اور اس کے چار یا چھہ ٹکڑے کرکے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھے جاتے ہیں - - پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں لاتے ہیں جس کے جوف میں حلوائے صابونیہ بھرا ہوتا ہے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک میٹھی روٹی رکھتے ہیں جس کو خشتی کہتے ہیں اور اس کو آٹے شکر و گھی سے بناتے ہیں اور پھر ایک چیز لاتے ہیں جس کو سموسہ کہتے ہیں اور وہ قیمہ کیا ہوا گوشت ہوتا ہے - اس میں بادام اور چائفل اور پستہ اور پیاز اور گرم مسالہ ڈالکر پتلی چپاتیوں میں اُس کو لپیٹ دیتے ہیں اور پھر گھی میں تل لیتے ہیں - ہر ایک شخص کے سامنے چار یا پانچ سموسہ رکھتے ہیں اور پھر چاول گھی میں پکے ہوئے لاتے ہیں اور اُس کے اوپر مرغ ہوتا ہے - پھر لقیمات القاضی لاتے ہیں اور اس کو ہاشمی بھی کہتے ہیں - پھر قاہریہ لاتے ہیں حاجب کھانا شروع کرنے سے پہلے دسترخوان پر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اور سب حاضرین بادشاہ کی تعظیم کرتے ہیں.........اور جب یہ کر چکتے ہیں تو دسترخوان پر

بیٹھتے ہیں اور کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی اور سونے اور کانچ کی پیالیوں میں مصری اور گلاب کا شربت پیتے ہیں - جب شربت پی چکتے ہیں تو حاجب بسم‌اللہ کہتا ہے اس وقت سب کھانا شروع کر دیتے ہیں کھانا ختم ہونے پر فقاع کے پیالے آتے ہیں اور جب فقاع پی چکتے ہیں تو پان سپاری آتا ہے - جب پان سپاری لے چکتے ہیں تو حاجب بسم‌اللہ کہتا ہے سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جس طرح کھانے سے پہلے تعظیم کی تھی اسی طرح پھر کرتے ہیں اور پھر دسترخوان سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں.........اس بیان سے ظاہر ہے کہ اُس دور میں دعوتوں میں کیا کیا تکلفات ہوا کرتے تھے -

اگر یہ مضمون لوگوں کے خیالات کو اس طرف منعطف کر سکے کہ عہد سلطنت میں بادشاہوں کے حالات کے ماسوا اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں جن کے بارے میں ہنوز ہماری معلومات محدود ہیں تو میں سمجھونگا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی - جس طرح سے مغلیہ دور کے امراء کے مشرح و مفصل حالات مآثرالامراء میں درج ہیں - اُسی طرح اگر اتنی بڑی نہیں تو اس کی نصف یا چوتھائی ضخامت میں عہد سلطنت کے امیروں کے حالات بھی قلمبند کئے جا سکتے ہیں اور اس کی اشد ضرورت ہے -

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماهی رساله

جلد ٦ | جولائی سنه ١٩٣٦ع | حصه ٣

اردو[۱] کا واعظ شاعر

از مولوی عبدالماجد - بی - اے

آج سے کوئی ۲۵ سال اُدھر کی بات ھے الہلال ' افق کلکته سے نیا نیا طلوع ہوا تھا ' اور ملک کی ساری فضا ' ابوالکلامی ادب و انشاء کے غلغلہ سے گونج رھی تھی ' کہ ایک روز اُس کے کسی مقالہ کے ذیل میں ' یہ شعر نظر سے گزرا -

تعزیر جرم عشق ھے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ھے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

پڑھتے ھی طبیعت بے چین ہوگئی - لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا - درج صرف شعر تھا - شاعر کا نام نہ تھا - دل نے کہا ' اور اُس کہنے میں کچھہ بھی سوچ بچار کی ضرورت نہ سمجھی ' کہ شعر یقیناً غالب کا ھے ' یاد نہیں پڑتا ' نہ سہی ' دیوان مطبوعہ میں موجود نہیں ' نہو رہ گیا ہوگا - لیکن ھے شعر غالب ھی کا - اُس مسلم استاد کے سوا ' اور کہہ کون سکتا ھے؟—حاضری اس درمیان

[۱]—اپریل کے گذشتہ نمبر میں جو مضامین پیش کئے گئے تھے وہ سب هندستانی اکیڈیمی کی چوتھی ادبی کانفرنس میں پڑھے گئے تھے - اس جولائی نمبر کے مضامین بھی اُسی سلسلے کے ھیں - " مدیر " -

میں ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی - ذکر اس شعر کا آیا ' ارشاد ہوا ' کہ غالب کا نہیں ' مولانا حالی کا ہے -

ہائیں ! یہ کیا ارشاد ہوا ؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر ؟ بے چارے سیدھے سادے سے آدمی ' روکھے پھیکے اشعار نظم کر دینے والے ' اُنھیں غزل کے پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا ؟ شعر کے سارے تیور ' استاد غالب کے - تخیل وہی ' بندش وہی ' زبان وہی - حالی غریب میں نہ یہ حسن بیان ' نہ یہ لطف زبان - اُن کے کلام میں نہ یہ روح نہ یہ جان ! نہ تخیل کی یہ رعنائی ' نہ طرز ادا کی یہ زیبائی ! ان کی تو ترکیبیں بھی بودی اور بندشیں تک پھسپھسی ! غرض دل نے ' کچھ جھنجھلا کر ' اور کچھ خفیف ہوکر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں ' لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہتی ہے - دیوان حالی اوٹھا کر دیکھا ' تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود !

کون حالی ؟ وہی جنکے تغزل و تشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں - بس شروع سے خیال یہ جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں اور رنگین بیانیوں سے اُنھیں واسطہ کیا - ایک خشک سے آدمی ہیں - کلام پست ' عاشقانہ مضامین کا قحط ' بندشیں سست— خدا غریق رحمت کرے ' دور اول کے اودھ پنچ کو ' اور بھلا کرے اُس کے نقادان فن اور شہسواران سخن کا - یہ اُسی کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں ' خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں ' پختہ کاروں ' لائق فائق زبان دانوں کے دل میں بس یہی رچا ہوا تھا ! اِدھر حالی کا نام آیا اُدھر کلام کی بے اثری ' روکھے پن ' پھیکے پن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی !

———

بات دل سے نکلتے ہی نکلتی نکلتی ہے - اس ایک شعر سے ہوتا کیا ہے - شعر ہو کیسا ہی بامزہ ' ہے تو ایک ہی—اور دو ایک بامزہ شعر کس کے ہاں نہیں ملتے ؟ مشق کرتے کرتے ' ادنی سا ادنی شاعر بھی دوچار شعر تواچھے نکال ہی لاتا ہے—اچھا تو آج کی صحبت میں یہی نہو ' کہ ہم آپ ملکر دیوان حالی کے اوراق ' اُلٹ پلٹ ' اِدھر اُدھر سے دیکھ ڈالیں ' عجب نہیں کہ کچھ اور چیزیں بھی ہاتھ آجائیں - اور یہ گھنٹہ یوں گھنٹہ کی محنت رائیگاں نہ جائے !

دیوان کا صفحہ ۵۴ نکالئے - ردیف الف میں ایک مطلع یہ ملیگا -

فطرت میں تیری صوفی ' گر نور صفا ہوتا
تو سب سے ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

اس غزل میں فرماتے ہیں -

ہم وقت وداع اُن سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

وداع و رخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپکی نظر سے گذر چکے ہونگے ' لیکن حسرت و یاس کی جو تصویر ' اس رونے میں نہیں ہنسی میں دکھا دی گئی ہے ' اس کا بھی کوئی جواب ہے ؟ اور پھر فرماتے ہیں -

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے ' کیا جانئے کیا ہوتا !

عاشق کی جانبازی کے افسانے بھی سب دہراتے چلے آئے ہیں ' لیکن اس ' کیا جانئے کیا ہوتا ' کے کنایہ کے اندر جو بات ہے وہ کسی تصریح کے بعد بھی پیدا ہونی ممکن ہے ؟

ناصح اور عاشق کی مڈ بھیڑ دنیائے شاعری کی بڑی پرانی حکایت ہے - حالی بھی ایک بار ملتے ہیں -

جودل پہ گزرتی ہے ' کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تونے کہا ہوتا !

حالی نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے - ایک آہ سرد بھر کر ' صرف اتنا کہتے ہیں ' اور کہکر چپکے ہو جاتے ہیں ' کہ

کچھ ہم سے سنا ہوتا ' پھر تونے کہا ہوتا !

ناصح کو بے درد ' بے حس ' سب نے مانا ہے - یہاں عاشق کو اپنی داستان درد کی درد انگیزی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کے خیال میں وہ ناصح کے دل پر اثر کئے بغیر رہ نہیں سکتی - پتھر آخر کیسے موم ہوکر نہ رہیگا - کوئی فولاد اتنا گرم ہو بھی تو -

" نشاں نہ تھا " ' " گماں نہ تھا " ' اس زمین میں بھی خوب گل بوٹے کھلائے ہیں -

آتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
تھا کچھ نہ کچھ ' کہ پھانس سی اک دلمیں چبھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیرو سناں نہ تھا

کہئے ! خشک نظم نگاروں کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے ؟ اور آگے چلئے -

بزم دشمن میں نہ جی سے اترا   پوچھنا کیا تری زیبائی کا

بدگمانی کے لئے تو غیر کا سایہ پڑ جانا بھی کافی ہوتا ہے - یہاں عین بزم رقیب میں ' رونق محفل بنا ہوا دیکھتے ہیں ' اور یہ کمال دلربائی ہے کہ جی پھر بھی نہ ہٹا ! کمال اپنا نہیں ' اپنے وفور عشق کا نہیں ' تمامتر اُنہیں کا ' اُنہیں کے حسن بے مثال کا - " پوچھنا کیا

تری زیبائی کا " ! گویا جمال بھی اُنھیں کا ، اور کمال بھی انھیں کا -
غالب کا مشہور مطلع ہے -

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہی زمزمہ زرا حالی کی زبان سے سنئے ، اور واہ واہ کرتے رہ جائیے -

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
ہرخار نخل ایمن وہر سنگ طور تھا !

تجلیات حق کہاں نہیں ؟ دکھائی نہ دیں ، تو قصور اپنی نظر کا ہوا ، یا حسن نامحدود کا ؟ .

شعر یہ کہا ہے ، اور اپنی ساری متانت و ثقاہت کے باوجود ، حضرت زاہد کے دامن پر چھینٹے ڈالتے چلے گئے ہیں -

جانی نہ قدر رحمت حق ، پارسا نے کچھ،
ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

زاہدوں کی قسمت میں تو مزد ہی مزد ہے - محض رحمت حق کا نزول ظاہر ہے کہ اُنھیں پر ہوگا ، جو اپنی سیہ کاریوں کے باعث ، حقدار اس رحمت کے زرا سے بھی نہونگے !

شوخی اور طراری ، درحقیقت دو الگ الگ چیزیں ہیں - اور ظرافت کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ، کہ اُس کے ڈانڈے ، عریانی و فحاشی سے مل مل جائیں - حالی شریف ہیں اور متین - اول بھی متین آخر میں بھی متین ، اور درمیان میں بھی متین - ذہانت ، شوخی ، ظرافت ، طنز ، موجود ان کے ہاں سب کچھ ، لیکن متانت کی شان سب پر غالب ، گویا حضرت اکبر الہ آبادی کا پورا جواب - یہاں

هر منظر پر متانت کا پردہ پڑا ہوا ؛ وہاں ہر چہرہ پر ظرافت کا غازہ لگا ہوا - اُن کا یہ رنگ ' کہ روتے ہوئے کو بھی گد گداتے جاتے ہیں - ان کا یہ ڈھنگ کہ کسی کو ہنسی آئے بھی ' تو پہلے اُس کے منھ پر رومال رکھا لیتے ہیں - ایک کے ہاں تمامتر شوخی و رنگینی ' دوسرے کے ہاں ایک ذرا اُداسی اور غمگینی ! ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کی چاٹ ' دوسرے کے ہاں بات بات پر ادب اور قاعدہ کا لحاظ - ایک کی مجلس طرب افروز ' دوسرے کی صحبت سبق آموز - اُن کے دسترخوان پر شراب و کباب - اِن کے دواخانہ میں یخنی اور عرق گلاب -

باتیں سب عاشقوں والی کہے جاتے ہیں ' لیکن وہی'

نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئــی فریاد رہے !

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے ' نیچی نظروں ' شرمیلی نگاہوں کے ساتھ - لغزش مستانہ کے بجائے ' ہر قدم سلامت روی کی تصویر - لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جائیے ' اور دل ہی دل میں مزے لیتے جائیے -

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائیگا

سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا

مطلع تو معمولی ہے - لیکن آگے گلکاریاں ملاحظہ ہوں ــــ

تم‌کو ہزار شرم سہی ' مجھ کو لاکھ ضبط

الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر

دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائیگا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے

پوچھینگے ہم سبب تو بتایا نہ جائیگا

زرا حالی کی کم گوئی ملاحظہ ہو - کچھ، نہ کہنے پر سب کچھ کہہ جاتے ہیں - رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے ' وعدہ تھا کس سے ' اور پورا جاکر کہاں ہوا ! وہی " کجا می نساید کجا می زند " کی پرانی داستان - کوئی دوسرا شاعر ہوتا ' تو کھل کھیلتا ' اور " معاملہ " کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کر جاتا - ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی - کسی اشارہ کے بھی روادار نہیں - وہی نیچی نگاہیں ' اور زبان پر صرف اسقدر کہ —

" پوچھینگے ہم سبب تو بتایا نہ جائیگا " !

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائیگا -

یہاں اُستاد مومن کا بھی ایک مطلع یاد کر لیجئے —

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کرینگے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

خاکساری کے مضامین آپ نے بارہا سنے ہونگے - کیسی کیسی نازک خیالیاں اس میں صرف ہوچکی ہیں - اور تعلی تو ہمارے حضرات شعراء کی گویا جاگیر ہی ہے - اب زرا دیکھئے کہ اردو کا واعظ شاعر ' ان دونوں اضداد کو کس بلاغت سے جمع کرتا ہے ' اور ایک مختصر سے شعر کے اندر ' کس نادر اور اچھوتے انداز سے تعلی سے خاکساری پیدا کر رہا ہے ' اور خاکساری سے تعلی نکال رہا ہے -

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا   خاکساری اپنی کام آئی بہت !

بیت‌الغزل سن چکے ' تو اب مطلع اور ایک آدھ شعر اور بھی ملاحظہ میں آجائیں -

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کہئے ، اب یہی حالی وہی نرے کھرے واعظ رہے ؟ وہی خشک اور بے مزہ ، پھیکی اور بے اثر ، نظم گو رہے ؟ اور پھر اس غزل کے معاً بعد یہ غزل -

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکیگی گل تر کی صورت

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

مقطع سے متعلق ایک لطیفہ ، مولانا شبلی کی زبان سے سنا ہوا عرض کرنے کی اور اجازت دیجئے ، علیگڈہ کے طالب علموں کی شوخیاں سارے زمانے میں مشہور ہیں - حالی کی یہ غزل جب اول بار شایع ہوئی تو کالج کے ایک نو جوان داؤد احمد امروہی مرحوم کو اس پر تضمین کی سوجھی - سننے کے قابل مقطع کا بند ہے -

چاھئے جب کہ ارادہ کرے کوئی انساں
دیکھ لے خوب کہ ھے شوق وہ اس کے شایاں
سن کے لوگوں سے کہ آئے تھے وہ داؤد کے ھاں
اُن کو حالی بھی بلاتے ھیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعزیر جرم عشق والا شعر ' شروع مضمون میں عرض ھو چکا - اب دو شعر اور اسی غزل کے پیش ھیں -

گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ھے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ھوں بدنام شہر شہر
بارے ھوئی قبول بہت التجا کے بعد

عاشقی میں بجز رسوائی اور بدنامی کے اور رکھا کیا ھے - عاشق کا کمال یہ ھے کہ اس زمانے بھر کی رسوائی سے مغموم نہیں ھوتا ' بچنا نہیں چاھتا - الٹا خوش ھوتا ' اور اس کی طلب و تلاش میں نکلتا ھے ! معرفت کے رنگ میں یہ مطلع چھوڑتے نہیں بنتا -

ھے یہ تکیہ تری عطاؤں پر   وھی اصرار ھے خطاؤں پر !

اکبر نے بھی ایک مصرع میں یہی مضمون ادا کیا ھے -

اُسی کی عظمت سے کوئی خائف ' اسی کی رحمت پہ کوئی قائل !

شاعر اردو کے تھے ' لیکن کہیں کہیں عربی مصرعہ اس بے تکلفی ' سلاست اور برجستگی کے ساتھ لگا گئے ھیں ' کہ جیسے شعر اپنی ھی زبان میں کہہ رھے ھیں -

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دئے ایک دکھ نے سب امراض

دیکھئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

کہتے کہتے ' کہتے ہیں -

لا اُبالی بِاَنْ یُّعَا تبلی کُلُّ ناسٍ وَّ انت عَنّی راضٍ

یہ وہی مضمون ہے ' جسے محمد علی جوہر اپنے رنگ میں یوں باندھ گئے ہیں -

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

ایک اور عربی مصرعہ اسی غزل میں -

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع هَل لَنَا فِی نزاعِنا من قاض

لیجئے دیوان کی جلدی جلدی ورق گردانی کرتے کرتے ہم اب ' ردیف میم تک پہونچ گئے ایک غزل پر نظر جم کر رہ گئی - معاملہ بندی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ ساتھ یہ متانت ' یہ احتیاط ' یہ ضبط ' حالی ہی کا حصہ ہے -

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخم تیغ عشق
بدلینگے تجھکو زندگئی جاوداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کہا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

یہ اشعار اگر حالي کے دیوان سے نکال کر ' مومن یا شیفتہ کے دیوان میں لگا دئیے جائیں تو کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چلنے پائیگا ؟

" گرانیاں ہیں " " کہانیاں ہیں " والی غزل اس زمانے کی ہے جب حالی شاعر ' حالي واعظ کے قالب میں آچکے تھے - اس پر بھي ذیل کے دونوں شعر دیکھئے - شعر کی زمین ہے کہ آسمان سے باتیں کر رهی ہے -

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
روتے ہیں چار ہم پر ' ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماري پہونچي اب ناتوانیاں ہیں

غزلوں کے متفرق اشعار کثرت سے گزر چکے - اب ایک پوري غزل نمونہ کے طور پر ملاحظہ میں آجائے ' کہ انتخاب اشعار میں بد دیانتي کا شبہہ نہ رہے - فرماتے ہیں ' اور ہر ہر شعر پر پڑھنے والے سے داد وصول کئے جاتے ہیں -

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب تھہرتي ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
ہیں دور جام اول شب میں خودي سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بہ خیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں ' کسل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مررہےھیں وہ ہے باتھی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح ' رہے رات بھر کہاں

غزل نو شعر کی ہے - مراتب کا فرق یقیناً ان کے درمیان ہے - لیکن فرمائیے ' اس میں پست و لغو شعر ' نظر ڈالنے کے قابل کون سا ہے ؟ کلام کی 'خشکی' اگر اسی کا نام ہے ' تو آخر 'تری' کے نمونے کہاں ملینگے ؟

ردیف " ے " میں دو مختصر غزلیں گماں رہے ' نشاں رہے ' کی زمین میں ہیں - اس زمین کے متعدد شعر ایسے صاف اور ڈھلے ہوئے ہیں کہ بے تکلف زبانوں پر چڑہ گئے ہیں ' اور تحریروں و تقریروں میں کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں -

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اچھے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنے موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حسن قبول اگر ایسے کلام کو حاصل ہو جائے ' تو اس پر حیرت کیوں کی جائے - مغز و معنی سے قطع نظر ' سلاست ' شستگی ' روانی ' بے ساختگی ' کسی حیثیت سے بھی یہ کلام کسی بلند سے بلند نمونہ سے پست ہے ؟

کہنے والوں نے کہا ہے کہ حالی جب تک قدیم رنگ پر قائم رہے ' اچھی اچھی غزلیں کچھ نہ کچھ بہر حال نکالتے ہی رہے ' مگر جب سے جدید رنگ پر پڑ گئے اپنی شاعری کو غارت کرکے رکھ دیا - یہ قول کسی حد تک تو شاید صحیح ہو ' لیکن تمام تر صحیح تو یقیناً نہیں - ابھی ابھی جو جو نمونے کلام کے گزر چکے ' ان میں اگر دس شعر دور قدیم کے تھے ' تو چار دور جدید کے بھی - دونوں میں کوئی فرق و امتیاز مطلق محسوس نہیں ہوتا - کلام جدید کے بہت سے نمونے اوپر گزر چکے ' اب دو چار شعر اس دور کی ایک اور غزل کے ملاحظہ ہوں -

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے   قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو   وہ صرف تمنا ہوا چاہتا ہے

ندرت قافیہ ملاحظہ ہو -

وفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک   دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
غم اشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم   سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ اندنوں ذوق عصیاں   در رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

خشکی اگر متانت بیان ہی کا دوسرا نام ہے ' تو یقیناً یہ اشعار بھی خشک ہیں - لیکن اگر متانت بیان عیب نہیں ہنر ہے ' تو خدا را کوئی بتائے کہ خشکی کا اطلاق ایسے کلام پر کس طرح کیا جائے ؟

غزلیات کا حصہ اب اچھا خاصہ ہو چکا - عجب نہیں کہ اہل بزم ' مقالہ نگار کی آشفتہ بیانی و ژولیدہ نگاری سے افسردہ و ملول ہو چلے ہوں ' اس لئے اب صرف ایک غزل اور اسی دور جدید کی سن کر یہ ورق الٹ دیجیے -

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کرچکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحان برش شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے تصور مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم هدف تیر کر چکے
دل لیکے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہاں کو تسخیر کر چکے
حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اور توجو کچھہ ہے ' خیر ہئی ہے ' خود شوخی کے نمونوں سے یہ کلام کب خالی ہے ؟ تیسرے شعر کے اندر لطیف شوخی کی جو کیفیت ہے ' اُسے لفظوں میں کوئی کیوں کر بیان کر ڈالے ؟ بس بات کہا ہے - وہی کہ نرم مخملیں پلنجہ ' آہنی دستانہ کے اندر چھپا ہوا ! شوخی حدود متانت سے قدم باہر نہیں نکال سکتی اور اپنی لطیف ترین صورتوں ہی میں محدود رہ جاتی ہے -

قلم کا مسافر ' اب زرا دم لے - شعر اب ایک آدھ نہیں رہا ' دس بیس بھی نہیں ' سو پچاس شعر ہو چکے - کوئی تیر ' کوئی نشتر - اب بھی اس کلام سے وہی بدگمانی چلی جائیگی کہ خشک اور نرا واعظانہ ہے ؟ خیال اب بھی یہی قائم رہیگا کہ حالی غزل گوئی میں ہیتے ہیں ؟ غالب اور مومن اور شیفتہ آسمان شعر کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں ' اُنہیں کے معیار پر کسئے ' جانچ لیجئے ' پرکھہ لیجئے -

یہ سب کچھہ ہے ' لیکن اس پر بھی حالی کا اصلی میدان ' غزل کا میدان نہیں - اُن کی شاعری ' واہ ' کی نہیں ' آہ ' کی ہے ' جوش و ولولہ کی نہیں ' حزن و حسرت کی ہے - نو عمری میں جو کچھہ بھی رہے ہوں ' لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو ' گل و بلبل کے افسانے چھوڑ ' اور زلف و ابرو کے جنجال سے نکل ' بس ' قوم ' کے ہو رہے تھے ' اور اب وہ تھے ' اور قوم کے اقبال کا ماتم - ساز کوئی سا بھی ہوتا ' نغمہ یہی ایک نکلتا ! کسی بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان ' چھیتا بیتا ' آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو ' اُس وقت باپ کے دل پر کیا گزر رہیگی ؟ ملیھہ قہقہوں کے لئے کھلیگا ' یا آہ و بکا کے لئے ؟ زبان پر حسرت و یاس کے کلمے ہونگے ' یا کوئی نئی پھبتی سو جھیگی ؟— بس جو حال ہمارا آپ کا ' ساری دنیا کا ' بیتوں کے لئے ' بھائیوں کے لئے رہتا ہے ' حالی کا وہی حال ساری امت اسلامیہ کے لئے - ساری ملت کے لئے ' ساری قوم کے واسطے تھا - یہی حال ان آنکھوں نے بہت بعد کو ' مشہور قومی لیڈر محمد علی جوہر کا دیکھا - فرق یہ تھا ' کہ محمد علی کے ہاں طبیعت میں غضب کی تیزی تھی ' حالی کے ہاں آہ سرد بھی آئین و ضابطہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی - ایک کے ہاں تمامتر جوش اور شوریدگی ' دوسرے کے ہاں ضبط و تحمل سے ملی ہوئی سلجھیدگی -

محمد علی جدھر سے گزرتے ' ایک عالم تہ و بالا کر دیتے - حالی دلوں میں اندر ھی اندر حزن و غم کی پھانس چبھو کرکے رھتے - محمد علی چیخیں مار مار کر خود روتے ھیں ' بھن اس غضب کے کرتے ھیں کہ سننے والوں کو رلا مارتے ھیں - حالی سر جھکائے - چپکے چپکے بیٹھے کلمہ پڑھتے جاتے ھیں ' کبھی کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں ' اور جب آنکھیں بے اختیار نم ھونے لگتی ھیں ' تو جھٹ جھٹ آنسو پونچھہ ڈالتے ھیں -

طبیعت پر حسرت ' اداسی اور غمگینی مستقل طور پر غالب ھوگئی تھی - جو بات بھی منہ سے نکلتی ' درد کی کسک سے خالی نہ ھوتی - دھلی کے طبیب اعظم ' حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھنے بیٹھے ' تو لگے بجائے فرد کے قوم کا ماتم کرنے - غم نصیب ' ماتم زدہ بوڑھوں کو آپ نے دیکھا ھوگا ' کہ جب دل پر تازہ داغ کھاتے ھیں ' تو معاً پچھلے داغ بھی تازہ ھو جاتے ھیں ' بھن اپنے ' آج ' ھی پر نہیں ' گذرے ھوئے ' کل ' اور بھولے بسرے ھوئے ' پرسوں ' پر بھی کرنے لگتے ھیں - حالی کا سینہ بھی داغوں سے لالہ زار بنا ھوا تھا - محمود خاں کے مرثیہ کے آخری بند ملاحظہ ھوں ' اپنے سارے مذاق طبیعت کی مصوری خود ھی کردی ھے - پڑھتے جائیے اور کلیجہ تھامے ھوئے سرد آھیں بھرتے جائیے - البتہ دل کا دردمند ھونا شرط ھے -

اک زمانہ تھا کہ تھا ھم سے موافق روز گار
اھل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ھم میں شمار
ایسے حاصل خیز دنیا میں نہیں کے کشت زار
جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار
مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

شاید اب پہونچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اُس کی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے ہمال
ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا
سلتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن وعشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
کچھ قصیدہ پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کسی لیلے دیا ہم کو نہ دم
نالۂ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جاکر نہ سم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

" ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا " اس ایک مصرع میں واعظ شاعر کی پوری آپ بیتی آگئی -

---

یہ نہ تھا کہ ظرافت کر نہیں آتی تھی - طنز تو ایسا کر جاتے اور اس کثرت سے کر گئے ہیں کہ ہمارے رشید صدیقی صاحب ' اگر طنزیات

حالی کو جمع کرنے پر آجائیں ' تو اپنے ' ظرفیات و مضحکات ' کا اچھا خاصہ ایک نیا حصہ تیار کرلے جائیں - لیکن وہی متانت کا طبعی رنگ ظرافت پر بھی چھایا ہوا ہے - کھلکھلا کر ہنسنا تو جانتے ہی نہیں - جب دوسروں کو ہنسانا چاہتے بھی ہیں ' تو خود محض زیر لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں — گوروں اور کالوں کی قسمت کے فرق کا تماشا اسی اپنے وطن کی سر زمین پر آپ بارہا دیکھ چکے ہوں گے ' اب زرا ایک یہ منظر ' مرقع حالی میں بھی دیکھتے چلئے -

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل ' مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہونچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آکے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اُتار
ٹھونک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جاکے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پانوں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تھے کو جا پہونچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کولکھ ' تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار

یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار
ایک کالا پٹ کے گورے سے جو فوراً مر نہ جائے .
آئے بابا اُس کسی بیماری کا کیوں کر اعتبار

اب کون ایسا بے انصاف ہوگا ، جو اس کے بعد بھی حالی کی خشک نگاری کا شکوہ سلیح رہے چلا جائیگا ؟

مشاعرے کی محفل گرم ہے ' بڑے بڑے کاملین فن جمع ہیں- دھلی کے دور آخر کے استادوں کا مجمع ہے - لوگ منتظر ہیں کہ غالب و شیفتہ کے شاگرد رشید کی زبان سے کوئی پھڑکتی ہوئی مزیدار سی غزل سننے میں آئے گی ' رندیِ و ہوسناکیِ کی روح تازہ ہوجائے گی - نفس کو ایک نئی زندگی ہاتھ آجائے گی - شاعر کا منہ کھلا ' تو یک بیک یہ معلوم ہوا کہ مشاعرہ کا کمرہ کیا ہے ' گویا مجلس عزاء ہے ' اور غزل نہیں ' نوحہ پڑھا جارہا ہے - اگلے پیارے سب ایک ایک کرکے یاد آرہے ہیں اور نام لے لے کر دل کی بھڑاس نکالی جارہی ہے - نوحہ آج بھی دل والوں کے لئے موثر ہے ' چالیس پچاس برس پیشتر جیسا کچھ رقت انگیز رہا ہوگا ' ظاہر ہے ' خصوصاً جس وقت قدردانوں کے بھرے مجمع میں خود مصنف کی زبان سے ادا ہوا ہوگا -

تذکرہ دھلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور، ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

ہم کو گر تونے رولایا تو رولایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا اُن پہ جہاں روتا ہے
اُن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردۂ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مرکے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لوکہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رولانا ہرگز

آج اگر ہمارے آپ کے آنسو نہیں نکلتے تو ہمیں دھلی مرحوم کے ماضی کا احساس ہی کب ہے ؟ آنکھوں میں تو اب ' نئی دھلی ' بسی ہوئی ہے ' راے سینا کے آگے شاہجہاں آباد کو پوچھتا کون ہے ؟ وایسریگل لاج کے سامنے ' لال قلعہ کو جھانکنے ہی کون جاتا ہے ؟ اور شیکسپیر اور ملٹن کے ہوتے ' غالب و شیفتہ کی قدر ہے کس کے دل میں ؟ افسانۂ ماضی کو تو ہم ماضی کے حوالہ کر ہی چکے ' اب رونا آئے بھی ' تو کس بات پر ؟ باپ اور بھائی کی تازہ میت پر سب روتے ہیں ' بھولے بھالے ہوئے پردادا اور نگردادا پر آنسو نکلتے کس کے دیکھے ہیں ؟

مسدس ' فرط شہرت سے محتاج نہ کسی تعریف کا ' نہ کسی تعارف کا ' نہ کسی نئی مدح و توصیف کا ' نہ کسی جدید نقد و تبصرہ کا - ایک داستان درد شروع سے آخر تک ہے - آخر میں بہ‌طور ضمیمہ ایک قصیدہ لگا ہوا ہے ' شاعر مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے' اسلام

اور مسلمانوں کا حال زار ' دربار رسالت میں عرض کر رہا ہے - اس عرض و معروض میں ' اللہ اکبر ' کسقدر اخلاص ہے اور کس قدر نیاز - کس درجہ تعلق خاطر ہے ' اور اصلاح حال کے لئے کس درجہ اضطرار ؟

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

۱۵ ' ۲۰ شعروں میں اپنے ' حال ' کا عبرت انگیز مقابلہ اپنے ' ماضی ' سے کرتے چلے گئے ہیں اس کے بعد کہتے ہیں -

گو قوم میں تیرے نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اُسے دور زماں میٹ رہا ہے

آگے پھر وہی مد و جزر ' اقبال و زوال کی داستان سرائی ہے - لیکن پھر سنبھلتے ہیں ' اور کہتے ہیں کہ اس میں شکوہ کس کا اور شکایت کس کی ؟

جو کچھ ہے وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانہ کا نہ قسمت کا گلا ہے

مزید عرض حال کے بعد پھر فریاد شروع ہوتی ہے—

اے چشمۂ رحمت بابی انت و اُمی
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھسے چھڑایا
جب تونے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے

اس متن کی تهوڑي سی شرح کے بعد ' پهر متوجه هوتے هیں -

برتاو ترے جبکه یه اعدا سے هیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچهه اُمید سوا هے
اُمت میں تری نیک بهی هیں 'بدبهی هیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا هے

اُمت کا جو تعلق رسول کے ساتهه هے ' اس کا مقابله دنیا کا کوئي تعلق کرسکتا هے ?

جو خاک ترے درپه هے جاروب سے اُڑتی
وہ خاک همارے لئے داروے شفا هے
جو شهر هوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وهی قبله تری اُمت کا رها هے
جس شهرنے پائی تری هجرت سے سعادت
کعبه سے کشش اُسکی هراک دل میں سوا هے

آخر میں دل کهولکر سامنے رکهه دیتے هیں —

هم نیک هیں یا بد هیں پهر آخر هیں تمهارے
نسبت بهت اچهي هے اگر حال برا هے
خود جاہ کے طالب هیں نه عزت کے هیں خواهاں
پر فکر ترے دین کی عزت کي سدا هے
گر دین کو جوکهوں نهیں ذلت سے هماری
اُمت تري هر حال میں راضی برضا هے
عزت کی بهت دیکهه لیں دنیا میں بهاریں
اب دیکهه لیں یه بهی که جو ذلت میں مزا هے

اس منزل پر پہونچکر معاً یاد پڑ جاتا ہے کہ موقع ناز یوسفی کا نہیں ' نیاز یعقوبی کا ہے -

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حد ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھکو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ دل کی شاعری اُس کی تھی' جسکے محض ایک خشک وعظگو ہونے کا ڈھنڈھورا کس بیدردی کے ساتھ ایک عالم میں پٹ گیا تھا -

---

واعظ شاعر کی عام وعظ گوئی اور عام شاعری کے نمونے آپ نے دیکھ لئے - غزلیات کے حصہ کو چھوڑ کر باقی شاعری ایک مسلمان شاعر کے دل کی آواز تھی - ماتم تمامتر زوال اُمت اسلامیہ کا' مصوری تمامتر جذبات ملی کی - اب ختم صحبت پر ' ایک نظر حالی کی انسانی شاعری پر بھی ہوسکے تو بہتر ہے - انسانی شاعری ' اسلامی شاعری سے الگ اور متغائر کوئی چیز نہیں ' اسی کے بلند ترین مقام کا نام ہے - بندہ اور پروردگار کے تعلق سے بڑھکر وسیع عالمگیر تعلق اور ہو کیا سکتا ہے ؟ شاعر نے جب براہ راست رب‌العلمین سے آہ و فریاد شروع کردی ' اور شاعری میں قیود و تعینات کی جگہ ' وحدت مطلق نے لے لی ' بس وہیں سے انسانی شاعری شروع ہوگئی - یہ ہیچمداں تو یہ عرض کریگا کہ حالی نے عمر بھر بجز ایک " بیوہ کی مناجات " کے اگر ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا ' تو اُن کے لئے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ دونوں میں بس تھی - باتیں اتنی

سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں - بول اتلے میٹھے کہ خود معصومیت ' بے اختیار لپٹ لپٹ کر بلائیں لینے لگے - زرا سنئے' لیکن سننے سے پہلے دل کو خوب مضبوطی سے تھام لیجئے -

اے سب سے اول اور آخر　　جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے بالا ہر بالا تر سے　　چاند سے سورج سے امبر سے
سب سے انوکھے سب سے نرالے　　آنکھ سے اوجھل دل کے اُجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے　　دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھسا نہیں کوئی　　تجھسے سب تجھسا نہیں کوئی
بھید ' نرالے بنجاروں کا　　گاہک ملدے بازاروں کا
سوچ میں دل بہلانے والا　　بپتا میں یاد آنے والا

حمد باری صدہا بار آپ سن چکے ہونگے ' اتنی سادہ ' اتنی معصومانہ ' ساتھ ہی اتنی موثر حمد کا کوئی جواب ' دوسری زبانوں کی تو خبر نہیں ؛ لیکن اُردو کے خزانے میں کہیں ہے ؟

اے اٹکل اور دھیان سے باہر　　دھیان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا　　بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تونے شاد کیا ہے　　ایک کے دل کو داغ دیا ہے
کھیتی ایک کی ہے لہرانی　　ایک کا ہردم خون سکھاتی
حال غرض دنیا کا یہی ہے　　غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا　　تحفہ یہی لے دیکھے ہے یاں کا

مناجاتیں آپنے بہتوں کی سنی ہونگی - بڑے بڑے عابدوں زاہدوں کی سنی ہونگی - اب فریاد اس بے کس و بے بس ' بے آس اور نامراد دکھیاری کی بھی سنتے چلئے -

یہاں نہیں بنتی رنج سہے بن — رنج نہیں سب ایک سے لیکن
توہی کر انصاف اے مرے مولا — کون ہے جو بے آس ہے جیتا
خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے — جو ہے اک اُمید اُس کو بندھی ہے
کھیتیاں جنکی کھڑی ہیں سوکھی — آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی
ایک ہے اس اُمید پہ جیتا — اب ہوئی بیتی اب ہوا بیتا
پر نہیں اُٹھ سکتی وہ ہے مصیبت — آئیگی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اُس رہ گھر کا کیا دل — مر کے کٹیگی جس کی منزل
اُن اُجڑوں کو کل پڑے کیونکر — گھر نہ بسیگا جن کا جنم بھر

آگے بڑھنے سے قبل ، اگر خدا نخواستہ آپ کے قرب و جوار میں کوئی بپتا کی ماری نوجوان بیوہ ہو تو اُس کا تصور ذہن میں جما لیجئیے - نوعمری کا زمانہ شوخی و شرارت کا ہوتا ہے - کھیلنا ، کھانا ، دوڑنا بات بات پر ہنسنا ہنسانا - ماں باپ نے بیاہ کس شوق ، کس خوشی سے رچایا - ہاتھوں پیروں میں مہندی لگی ، نئے نئے زیور گہنے ، طرح طرح کی رنگیلیاں ، نت نئی شوخیاں دل میں کیسے کیسے ارمان بھرے ہوئے ، نظروں میں کیا کیا نقشے جمے ہوئے ! اِتنے میں یک بیک یہ سب غائب ! سارا منظر محض خواب و خیال ! یہ ہاتھ اب عمر بھر چوڑیوں کو ترسینگے ، یہ کپڑے اب کبھی خوشبو سے آشنا نہ ہونگے ! اور یہ دل ! ہائے کیا ہے ، کیا ہوکر رہ گیا ! - دنیا اپنے عیش میں مصروف - محلہ میں شادیوں کی دھومیں - خاص اپنے گھر میں برسات کی ملاریں - جھولے پڑ رہے ہیں - کھیل پر کھیل ہو رہے ہیں - ساتھ کی کھیلنے والیاں ، ساتھ کی مانگی بیاہی ہوئیں ، نئی نئی ساڑیاں باندھے ، شوخ رنگ کے کپڑے پہنے ، کیسے کیسے طرحدار دوپٹے اوڑھے ، آنکھوں کے سامنے کوئی ہنس

رھی ھیں ' اور ایک یہ مصیبت کی ماری ھے - جلی ھے کہ اپنی قسمت کو رو رھی ھے -

آئیں بہت دنیا میں بہاریں — عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے — ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں — برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گي — وہ جو کلي مرجھائی تھی دل کی
آس ھي کا یاں نام ھے دنیا — جب نہ رھی یہ ھی تو رھا کیا
حکم سے تیرے پر نہیں چارا — کڑوي میٹھي سب ھے گوارا
تجھہ سے کہیں گر بھاگنا چاھیں — بند ھیں چاروں کھونٹ کی راھیں
تو مارے اور نوازے — پڑي ھوں میں تیرے دروازے
تجھي کو اپنا جانتي ھوں میں — تجھسے نہیں تو کس سے کہوں میں

سہیلیاں زیوروں سے لدی ھوئی ھیں ' کس شوق سے ' کس چاؤ سے ایک دوسرے کو اپنے اپنے زیور دکھائے جا رھے ھیں - ھاتھوں میں مہندیاں رچی ھوئی ھیں - پھولوں کے گہنے سر اور گلے کو زینت دئے ھوئے ھیں - نازک نازک پنڈے عطر کے خوشبوؤں سے مہک رھے ھیں - کہیں ذکر میاں کي چاہ پیار کا ھو رھا ھے - کہیں تذکرے سسرال کی ناز برداریوں کے ھو رھے ھیں - کہیں کسی پر فقرے کسے جا رھے ھیں - قہقہوں کا غل ھے - رنگ رلیاں منائی جا رھی ھیں - ادھر ایک بیچاری ' اللہ کی بندی ایسی ھے جس کے ھاتھ بھی ننگے ' کان بھی ' جسم رنڈاپے کي سفید چادر سے چھپا ھوا ھے - سن اس کا بھی آخر وھی ھے ' کیا اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں رھا ھے ؟ اس کا قلب اُمنگوں سے ' حوصلوں سے ' ولولوں سے خالی بنایا گیا ھے ؟ کیا اس دکھیاری کا جی نہیں چاھتا کہ اس کا بھي ناز بردار ھوتا ؟ یہ بگڑتی اور کوئی ھنساتا ؟ یہ اُٹھتی

اور کوئی کد کدا تا ؟ یہ مچلتی اور کوئی منا تا ؟ یہ فرمایشیں کرتی '
اور کوئی دل و جان سے اونھیں پوری کر کے دیتا ؟ روتی جاتی ہے '
اور کہتی جاتی ہے -

اے میرے زور اور قدرت والے　　حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری　　دروازے کی تیری بھکھاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن　　جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پسرائے کی دھتکاری　　میکے اور سسرال پہ بھاری
بیاہ کے دم پائی نہ لینے　　لینے کے یہاں پڑگئے دینے
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے　　ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
رونہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک　　اور روؤں تو روؤں کہاں تک
دن بھیانک اور رات ڈرانی　　یوں گزری یہ ساری جوانی
بہنیں اور بہنیلیاں میری　　ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھسے　　خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھسے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ　　جب گئیں بیکل ہو کے گئیں وہ
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر　　گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے　　جان کو پھونکا دل کی لگی نے
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی　　شہر میں وہ دھومیں ساہوں کی
تہواروں کا آئے دن آنا　　اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں　　وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں　　وہ ارمانوں بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں　　خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں
وہ گیا دیکر چاند دکھائی　　چاند ہوا پر عید نہ آئی

رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا — بادل گرجا اور مینہ نہ برسا
ریت میں ذرے دیکھ چمکتے — دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے

حسرت نصیب اپنے دن سن کو دیکھتی ہے ' اور آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتی ہے ! پھر بلک بلک کر اپنے اُسی مالک و مولیٰ سے کچھ عرض کرنے لگتی ہے !——آہ ! جو کسک اُس کی آواز میں ہے ' وہ بڑے بڑے مرتاض زاہدوں کو بھی کہاں نصیب ؟ عمر بھر کی عبادتیں' ریاضتیں' مشقتیں ایک طرف ' اور ایک گھڑی کی یہ شکستگی ' یہ بےچارگی ' یہ اپنی بندگی کا مشاہدہ دوسری طرف ! کہتی جاتی ہے ' اور سننے والوں کے دل ہلا ہلا کر رکھتی جاتی ہے -

اے دین اور دنیا کے مالک — اے راجا اور پرجا کے مالک
پورب پچھم ؛ دکھن ' اُتر — بخشش تیری عام ہے گھر گھر
سب پر کھلا ہے در رحمت کا — برس رہا ہے مینہ نعمت کا
سب کو تیرے انعام تھے شامل — میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
اگر کچھ آتا بانٹ میں میری — سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نون کی ترسی میں سانبھر میں
پھروں یہ سوچتی ہوں جی میں — آئی تھی میں کیوں اس نگری میں
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں
قسمت نے جب منہ نہ موڑا — آدمیوں کا ہوگیا توڑا
باپ اور بھائی چچا بھتیجے — سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے
پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا — جس کو ہو میری جاں کی پروا
تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی
کوئی نہیں لاگو اب میرا — باپ نہ بھائی ساس نہ سسرا

شاعر کی تخئیل آرائی نہیں ہے - واقعات لکھ رہا ہے واقعات - کہتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو جھوٹ کو سچ بناکر دکھائے - حالانکہ شاعری کا سب سے بڑا کمال واقعہ نگاری ہے مشاهدات سے ' واقعات سے بڑھکر موثر شے اور کون ہوسکتی ہے -

روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے ۔۔۔ رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو ۔۔۔ کیونکر 'لٹھی کاٹئے غم کو
سونیے میں میرے سارا گھر ہے ۔۔۔ میرے چلن پر سب کی نظر ہے
مہندی میں نے لگانی چھوڑی ۔۔۔ پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے میلوں میں ہوں بدلتی ۔۔۔ عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی ۔۔۔ بال نہیں برسوں گندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی ۔۔۔ تہواروں کنگھی نہیں ہوتی
کان میں پتے ہاتھ میں کنگن ۔۔۔ پہن چکی سب جب تھی سہاگن
آپ کو یاں تک میں نے متایا ۔۔۔ پر دنیا کو صبر نہ آیا
وہم نے ہے اک ایک کو گھیرا ۔۔۔ جب دیکھو تب ذکر ہے میرا

ان دکھیاریوں پر جو جو ظلم ابھی چند سال اُدھر تک ہو چکے ہیں ' اور بہت جگہ اب بھی جاری ہیں - کس سے مخفی ہیں ؟ کن آنکھوں نے وہ جگر خراش منظر نہیں دیکھے ہیں ! کس کان نے وہ فریادیں نہیں سنی ہیں ؟ ـــ ـــ اُن پر مٹ جانے والی ' شرافت پر جان دینے والی ' کمسن بیوہ ' اپنی عزت پر گواہ آسماں کے چھٹکے ہوئے تاروں ' اور گھر کے دروں ' دیواروں سب کو لاتی ہے -

اے امبر کے چمکتے تارو ۔۔۔ اے گھر کے در اور دیوارو
اے جانی پہچانی راتو ۔۔۔ تنہائی کی ڈرانی راتو
ایک دن اس گندی دنیا سے ۔۔۔ جانا ہے مالک کے آگے

جب وہاں پوچھ ہو میری تیری — تم سب دیجو گواہی میری
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی — پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی
پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی — منہہ پر یہ آئے بن نہیں رہتی
خواہ بری تھی خواہ بھلی میں — بات سے اپنے نہیں ٹلی میں
ساتھ، نہ قوم اور دیس کا چھوڑا — اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
اے ایمان کے رکھنے والے — اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے — چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پر چلتی تیرے اگر میں — چین سے کرتی عمر بسر میں
لیکن ہمت پیاروں کی یہی تھی — مرضی غمخواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے — قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
جان کسی کی جائے تو جائے — آن میں اپنی فرق نہ آئے
تجھ پہ ہے روشن اے میرے مولا — وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
روکنے تھے حملے مجھے دل کے — تھا مجھے جینا خاک میں ملکے
آن سنبھالے جان تھی جاتی — جان بچائے آن تھی جاتی
طے کرنے تھے سات سمندر — حکم یہ تھا ہاں پانوں نہ ہوں تر
کوئلہ چاروں کھونٹ تھا پھیلا — حکم یہ تھا پلا نہ ہو میلا
جان نہ سمجھا جان کو اپنی — دیا نہ جانے آن کو اپنی
اے اچھے اور برے کے بھیدی — کھوٹے کے اور کھرے کے بھیدی
بھید دلوں کے جاننے والے — پاپ اور پن کے چھاننے والے
عیب اور گن سب تجھ پہ ہیں روشن — پاپ اور پن سب تجھ پہ ہیں روشن
کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو — جن جن پر تھا یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا — سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
روک کے اور یوں تھام کے آپا — میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا

دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی   مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی   اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی
تو ہے مگر اس بات کا دانا   میں نے کہا دل کا نہیں مانا
تھامنا دل کا کام تھا میرا   اور تھمانا کام تھا تیرا
پکڑے اگر تو دل کی خطا پر   میں راضی ہوں تیری رضا پر

اپنی تو خیر جیسی بھی گزری، گزر گئی - اب دھیان ہے تو اس کا کہ اور بہت سی بہنوں پر بھی یہی وقت پڑا ہوا ہے - ان بیچاریوں کی تو مشکل کسی طرح آسان ہو - بندی اپنے چاہنے والے مالک اور مولا سے کہتی ہے -

اے غمخوار ہر ایک بیکس کے   حامی ہر عاجز بیکس کے
ہے اپنے عاجز بندوں پر   پیار ترا ماں باپ سے بڑھ کر
جس نے لگی میں تجھکو پکارا   سامنے تیرے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے   گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
گھر بسنے کی آس نہ رہنی   ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے   بپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے   یا جس پر گزری ہو وہ جانے
اے خاوند خداوندوں کے   مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنے خداوندی کا   صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو   کسی کو بے وارث مت کیجو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا   کر اُسے تو پیوند زمیں کا
یا عورت کو پہلے بلالے   یا دونوں کو ساتھ اُٹھا لے

اس سوز دل سے نکلی ہوئی دعائیں کہیں بالکل بے اثر رہ سکتی تھیں -

کم از کم جہاں تک ہندی مسلمانوں کا تعلق ہے ' رانڈوں کی بپتا اس وقت کے دیکھتے ' یقیناً بہت کچھ ہلکی ہو گئی ہے - اور کچھ نہ کچھ اصلاح تو بہرحال ہمسایہ قوموں کی بھی ہوکر رہی ہے -

خلاصہ پر واعظ شاعر نے وہی کہا ہے ' جو آج تک سارے واعظ ' اور سارے حقیقی شاعر برابر کہتے چلے آئے ہیں - کیسی بھوگی اور کہاں کا سہاگ ' نہ اس کو قیام نہ اس کو ثبات - ساری لذتیں فانی اور سارے عیش آنی - کسی کی پھولوں کی سیج پر لیٹ لوٹ کے گذری تو کیا ' اور کسی نے کانٹوں پر لوٹ لوٹ کے کاٹی تو کیا ' بشریت کا تقاضا تھا ' جو زبان پر اتنی بھی حکایت و شکایت آگئی - پیار ہو تو اسی من موہن کا ' جسے کبھی فنا نہیں - دل میں لگن ہو تو اُسی ایک کی ' جس کا عہد کبھی ٹوٹنے والا نہیں ' جس کی خاوندی کبھی ختم ہونے والی نہیں - بیوہ کی یہ مناجات واعظ شاعر کی وعظ گوئی اور شاعری دونوں کا نچوڑ ہے -

دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا
سکھ پر ہے یاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی
سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی
آنی جانی چیز ہیں خوشیاں
چلتی پھرتی چھانوں ہے ارماں
منگنی بیاہ برات اور رخصت
میل ' ملاپ سہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے
آگے چلکر ہیں پچھتاوے

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے
خواہ ہو رانڈ اور خواہ سہاگن
موت ہے سب کی جان کی دشمن
ایک ہے گو آج ایک سے بہتر
مر گئیں جب دونوں ہیں برابر
اور کوئی گر انصاف سے دیکھے
مر کے اُسے نسبت نہیں اس سے
چھٹ گئی وہ چھوڑ کے یاں کے
قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کو پڑی کل اُس کی گئی کل
یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل

شاعر کا آخری پیام وہی ہے ' جو عارفوں کا ہمیشہ رہا ہے - یہ سوز بھی اگر کسی دل میں آگ لگا کر نہ رہے تو یقیناً وہ دل نہیں ہے ' پتھر کا ٹکڑا ہے -

تیرے سوا یاں اے میرے مولیٰ
کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
پڑی تھی سونی جب یہ نگریا
تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
چاہتی ہوں ایک تیری محبت
اور نہیں رکھتی کوئی حاجت

گھونٹ ایک ایسا مجھکو پلادے
تیرے سوا جو سب کو بھلادے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں
کوئی رھے ارمان نہ جی میں
دل میں لگن بس اپنی لگادے
سارے غم اپنے غم میں کھپادے
وھاں سے اکیلی آئی ھوں جیسی
ویسی ھی یہاں سے جاؤں اکیلی
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا
کوئی رھے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشان پیاروں کا مٹادوں
پیار کے منہ کو آگ لگادوں
توھی ھو دل میں توھی زباں پر
مار کے جاؤں لات جہاں پر
پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملاکر

یہ مناجات تو وہ ھے ' جس پر اگر در و دیوار بھی جھوم جھوم کر ' اپنی بولی میں آمین کہہ اٹھیں تو کچھ عجب نہیں - انسان کا دل تو پھر آخر انسان کا دل ھی ھے -

اردو میں اوقاف قراءت

(از مولوی نعیم‌الرحمان ' ایم . اے)

مجھے اس وقت اُردو تحریر میں اوقاف قراءت کے استعمال کے باب میں کچھ عرض کرنا ھے . میں نہایت اختصار سے کام لوں گا ' اور حتی‌الوسع اِس کے لئے کمترین وقت صرف کروں گا .

اوقاف قراءت سے میری مراد ان علامات سے ھے' جو تحریری فقروں میں الفاظ کے مابین لکھے جاتے ھیں' اور جن سے جملوں کی تقسیم ھوتی ھے — اور گفتگو کے صحیح مضمون اور مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ھوتی ھے . ان علامتوں کے ذریعے ایک طرف تو پڑھنے والے کی آنکھ لفظوں اور جملوں کی تقسیم کو عبور کرتے ھوئے ذھن کی راھبری کرتی ھے ؛ دوسری طرف ذھن مسلسل اور مربوط طور پر تقریر کا مفہوم اور مطلب آسانی اور صحت کے ساتھ اخذ کر لیتا ھے . اس طرح کہنے والے کو یہ یقین ھو جاتا ھے کہ میری گفتگو کا مدعا صحیح سمجھا جا رھا ھے ' اور پڑھنے والا بجائے خود ھر طرح غلط فہمی سے بچ جاتا ھے - ان اوقاف کی مدد سے تحریر میں تقریر کرنے والے کی آواز کا اُتار چڑھاؤ بخوبی اور صحیح طور پر سمجھ میں آ جاتا ھے .

جیسے اوقاف کی علامتیں لگانے سے اِن فوائد کے حصول سے انکار نہیں ھوسکتا ' ویسے ھی مجھے یقین ھے کہ آپ سب اس امر میں بھی مجھسے اتفاق فرمائینگے کہ اُردو تحریر کو ان علامات کے استعمال

کی شدید ضرورت ہے ۔ اب سے قبل متعدد موقعوں پر ' بالخصوص انجمن ترقی اُردو کے رسالے " اُردو " میں ' اُردو تحریر کے رسم الخط کے بارے میں بحثیں کی جا چکی ہیں ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ رسم الخط کی صحت اور اس کی تعیین بھی نہایت ضروری امر ہے ' لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرات کے اوقاف سے جو سہولت اور خوبی لکھنے اور پڑھنے میں پیدا ہو جائے گی اس کا ضبط اور رواج بھی نہایت ضروری ہے ۔ اس وقت میرا مقصد اسی امر کی طرف توجہ دلانا ہے ۔

مغرب زمین کی تمام زبانوں میں ان علامات کا استعمال ہوتا ہے ۔ اُن کے ہاں اس کے ابتداء کی قریب ترین تاریخ سولھویں صدی عیسوی تک پہنچتی ہے ' جب کہ ملک اطالیا کے شہر وینس کے طابع اور ناشر مانچی [۱] (Manucci) اور اس کے بیٹے پولوس (Paulus) نے اپنے مطبع کی چھپی ہوئی کتابوں میں ان علامتوں کو باضابطہ طور پر خاص موضوعہ اور مقررہ اصول کے مطابق استعمال کرنا شروع کیا تھا اور اس طرح بہت سی قدیم یونانی اور لاطینی کتابیں زیادہ صحت اور وضاحت کے ساتھ شائع کی تھیں ۔ اس کے بعد ان علامات کا رواج اطالیا سے نکل کر مغرب کے اور ملکوں میں پھیل گیا ' یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر وہ یورپ کی تمام سر زمین پر چھا گیا ۔

مشرق میں ان علامات کا استعمال سب سے پہلے غالباً عربی میں ہوا ہے ' اور اس میں بھی اور بہت سے امور کی طرح اولیت کا سہرا ان

[۱]—مغرب کے اس محسن کا پورا نام آلدومانچی (Aldo Manucci) یا آلدو مانوتسیو (Manuzio) ہے ' لیکن اس کی لاطینی صورت آلدوس مانوتیوس (Aldus Manutius) بھی مشہور ہے -

بزرگوں کے سر ہے ' جنھوں نے قرآن مجید کی تحریری عبارت کو ان علامات سے مزین کر کے اپنے وقت کے معلومہ اقطاع عالم میں پھیلا دیا تھا ۔ اوقاف کی مغربی علامات میں جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے' اور قرآن کے اوقاف میں ایک فرق یہ ہے کہ مقدم الذکر محض موضوعی علامتیں ہیں اور موخر میں الفبا کے حروف سے ان اشارات کا کام لیا گیا ہے ۔ اب ان اوقاف کے استعمال کے لئے بظاہر ہمارے پاس یہی دو صورتیں ہیں — یا تو ہم قرآنی اسلوب کو اختیار کریں اور الفبائی حروف سے کام لیں ' یا مغربی طرز پر محض اشارات موضوع کریں ۔ غالباً الفبائی حروف کے استعمال کے وقت اِن کے باکمال واضع کو محض اشاری علامات کا خیال نہیں آیا ۔ یا اس کا یہ سبب ہوگا ' اور یہی زیادہ قرین قیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان حروف میں—اور خصوصاً ایسے موقعوں پر جہاں ایک سے زائد حروف سے کام لیا جاتا ہے—پورے پورے جملوں کی تخفیف مضمر ہے ۔ بہر کیف اِن حروفی علامات کا استعمال عبارت میں خلط حروف اورالتباس سے خالی نہیں ۔ قرآن کی تحریر میں اِن کو جو خصوصیت حاصل ہے اس سے پڑھنے والوں کی نگاہیں پوری طرح مانوس ہو چکی ہیں ' اور اس لئے اُس میں کسی نوع کا التباس یا خلط مبحث واقع ہونے کا احتمال نہیں رہتا ۔ لیکن اردو کی تحریر میں ان کے استعمال سے التباس کا احتمال بجا ' اور ان کا محل اعتراض ہونا صحیح ہے ۔ اب دوسری ' یعنی مغربی علامات کی ' صورت باقی رہ جاتی ہے ' اور اس میں شک نہیں کہ ان کا استعمال حروفی اشارات سے بہتر ہے ؛ اور اس لیے غالباً یہ تجویز بےجا نہیں ہے کہ ہمیں اردو کے لیے ان کو اختیار کر لینا چاہیے ۔ اور میری ناچیز رائے یہ ہے کہ ان

تمام علامات کو ' بلا استثناء ' اختیار اور استعمال کیا جاسکتا ھے ' اور کرنا چاھیے ۔

میری یہ تجویز ' مجھے تسلیم ھے کہ ' نئی نہیں ھے ۔ موجودہ صدی کے ربع اول میں ' جہاں تک مجھے علم ھے ' سب سے پہلے المولوی محمد نظام الدین حسن نوتنوی نے اپنی کتاب " اوقاف العبارت " میں پیش کی تھی ' جو سنہ ۱۹۰۲ع میں لکھی گئی [۱] ' اور ۱۹۰۴ع میں نولکشور کے نامی گرامی مطبع میں طبع ہوکر لکھنؤ سے شایع ہوئی تھی ۔ یہ کتاب فلس کیپ کی بڑی تقطیع پر چھپی ھے ' اور ۹۳ صفحوں پر حاوی ھے ۔ قابل مصنف نے شروع سے آخر تک قرآن شریف کے رموز اوقاف سے بحث کی ھے ' اور صرف آخر کے دوصفحوں میں " رموز اوقاف عبارت بطرز مغربین " کا ذکر کیا ھے ۔ اس باب (باب چہارم ' ص ۹۲) کے آغاز میں آن جناب نے اس مضمون کی تقریب ان الفاظ میں کی ھے :

" علماء مغربی نے ملک ھسپانیہ میں مابین سنین ۷۱۱—۱۴۹۱ع جو علامات اوقاف استعمال کیے وہ تمام السنہ یورپ میں بالفعل مروج ھیں— جب سلطنت بنی امیہ کو اندلس میں زوال ھوا اور کتب قدیمہ سے علماء مشرقی نا واقف رھے تو انہوں نے علماء مغربی کے اوقاف کو خود استعمال نہیں کیا ۔ لیکن زمانۂ حال میں السنۂ یورپ کا مروج ھے اور اردو میں نہ علماء مشرقی اور نہ علماء مغربی کے علامات اوقاف مروج ھیں لہذا باعث سہولت ہوگا اگر اردو میں وہ اوقاف عبارات استعمال

---

[۱]—جیسا کہ کتاب کے آخر میں خاتمے کے اس فقرے سے معلوم ہوتا ھے کہ " الحمدللہ تعالی کہ یہ بحث اوقات عبارت کی آج ختم ھوئی—مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۰۲ع ھاوہ مقام حیدرآباد—دکن ھند "

کئے جائیں جو علماء مغربی استعمال کرتے تھے - تاکہ اردو میں یہ اختلاف جو باعث اشکال طلباء علوم ہے بآسانی رفع ہو جائے—علامات مستعملہ حسب ذیل ہیں [۱]— "

اس کے بعد اِن سات علامتوں کا ذکر اور ان کی تشریح ہے : وقف خفیف (کاما ' coma) ' نصف وقف (سیمی کولن ' semi-colon) ' وقف کامل (فل اسٹاپ ' full stop) ' اقتباس (اِن ورٹڈ کاما ' inverted commas) ' ندا (sign of interjection) ' استفہام (query) اور قوسین (parenthesis) .

اس مقام پر یہ امر بھی بیان کے قابل اور لحاظ کے لائق ہے کہ مولوی نظام الدین حسن صاحب نے اپنی اس تمام کتاب میں اوقاف کی ان علامات کو استعمال کیا ہے . مولوی صاحب موصوف نے اس اُردو کتاب کے علاوہ ایک چھوٹا سا رسالہ انگریزی میں بھی لکھا تھا ' جو ہمارے شہر کے پائنیر پریس سے شائع ہوا تھا . اس تیرہ صفحے کے رسالے کا موضوع بھی یہی ہے . اس کے دیباچے کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ " علامات اوقاف کے استخراج کے متعلق میں ایک رسالہ ۲۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۰ع کو شائع کر چکا ہوں " . اس کے بعد دو فقروں میں یہ کہہ کر دیباچے کو ختم کردیا ہے کہ میرا وہ رسالہ ادبیات حال کے طلبہ نے نہایت مفید پایا اور اب میں ان ہی طلبہ کے لئے نظر ثانی کرکے اسے پیش کررہا ہوں . اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو یہ دھن گزشتہ صدی کے آخیر سے ہی تھی .

---

[۱]—مصنف نے تمام کتاب میں ' شروع سے آخر تک ' علامات اوقات استعمال کیے ہیں - مگر حیرت ہے کہ اس پارے (para) میں ڈیش کے سوا ' جسے وہ پورے وقفے (فل اسٹاپ) کی جگہ استعمال کرتے ہیں ' کوئی علامت استعمال نہیں کی ! میں نے یہ کل عبارت بالکل اسی طرح نقل کی ہے جس طرح کتاب میں چھپی ہے -

فی الحال ہمیں اس کتاب کے عجیب و غریب مگر دلچسپ مضامین سے بحث نہیں ہے .

اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد ہے علامات اوقاف کو رائج کرنے کی تجویز لاہور کے معدوم رسالے "کہکشاں" میں مولوی سید ممتاز علی نے پیش کی تھی . پھر سنہ ۱۹۲۲ء میں " اُردو " کی اکتوبر کی اشاعت میں پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے اردو کے رسم الخط پر بحث کرتے ہوئے ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی جس میں (ص ۶۹۰) یہ سوال اٹھانا تجویز کیا کہ " اوقاف قرات کے نہ ہونے سے اردو زبان کو نقصان پہنچتا ہے یا نہیں ؟ اس کے لئے انگریزی اوقاف بجنسہ استعمال کئے جا سکتے ہیں یا ان میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے ؟" اس کے بعد سنہ ۱۹۲۳ء میں " اُردو " کی اپریل کی اشاعت میں ، میں نے رسم الخط پر گفتگو کرتے ہوئے اوقاف قرات کے مسئلے کی طرف اہل اردو کی توجہ طلب کی تھی (ص ص ۲۹۵ - ۲۹۷) .

پروفیسر شیروانی کی تجویز کردہ کانفرنس بالآخر انجمن ترقی اُردو کی سرپرستی میں ، اور ہمارے مکرم صدر جلسہ مولوی عبدالحق صاحب کی عنایت سے ، سنہ ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں منعقد ہوئی اور اس میں اردو کے رسم الخط کے متعلق کافی بحث مباحثے کے بعد کچھ قراردادیں طے ہوئیں . افسوس یہ ہے کہ ان قراردادوں پر پوری طرح عمل درآمد اب تک نہ ہوا .

اب ہم اس نوبت پر پہنچ گئے کہ ارباب اُردو نے علامت اوقاف کی ضرورت کو گویا تسلیم کرلیا ؛ اور اب یہ بحث اٹھی کہ ہماری زبان میں ان علامات کے نام کیا ہوں - میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ان سب علامتوں میں سے صرف سات کو نظام الدین حسن صاحب نے اختیار کرنا

تجویز کیا ' جن کے نام ان کی تجویز کے مطابق آپ سن چکے ھیں ' میں نے اپنے مضمون میں بارہ علامتوں کو لیا اور ان کے نام تجویز کئے ھیں - اس کے بعد حیدرآباد کی انجمن امداد باھمی مکتبہ ابراھیمیہ کے رسالے "مجلۂ مکتبہ" نے مئی سنہ ۱۹۲۸ع کی اشاعت میں جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں متین نے " اشارات اعجام " کے عنوان سے سولہ صفحوں میں (ص ص ۱۵—۳۰) ان علامات سے مفصل بحث کی ھے ' اور اس میں اس خاکسار کی تجویز کا بھی ذکر کیا ھے . جناب متین نے میری تجویزوں پر مفصل بحث کر کے ان میں ترمیم پیش کی ھے . جناب متین کے اس قابل قدر مضمون پر الہآباد یونیورسٹی کے فاضل استاد مولوی زبید احمد صاحب نے اسی رسالے کی اگست سنہ ۱۹۲۸ع کی اشاعت میں مختصر طور پر نظر ثانی کی ھے (ص ص ۱۹—۲۱) ' اور متین صاحب کے تجویز کئے ھوئے ناموں میں کچھ اور ترمیمیں پیش کی ھیں .

اس کے بعد اس موضوع پر اور کوئی مضمون اب تک میری نگاہ سے نہیں گزرا . بہت ممکن ھے کہ کسی بزرگ نے اس طرف توجہ فرمائی ھو اور اردو کے کسی رسالہ میں اس پر بحث کی ھو . مجھے اپنے اس قصور کا اعتراف ھے .

اِس وقت کی صحبت میں ' جو افسوس کہ مختصر ھے ' غالباً آپ حضرات اس بحث کی تفصیل کو غیر ضروری سمجھ کر گوارا نہ فرمائینگے کہ ھمارے ھاں ان علامات کے نام کیا کیا رکھے جائیں - اگر مجھے یہ فرض کر لینے کی اجازت ھو کہ آپ علامات اوقاف کی ضرورت اور اس کی اھمیت کو تسلیم کرچکے ھیں ' تو یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کرنا چاھتا ھوں کہ اب وہ وقت بھی آجانا چاھئے ' اور اس میں

زیادہ دیر نہ ہونا چاہئے کہ اِن علامات کے نام طے ہو جائیں ۔ غالباً اس باب میں میری یہ تجویز بیجا نہ ہوگی کہ ایک طرف ہماری هندوستانی اکیڈیمی اپنے ہاں ان امور پر بحث کر کے ایک معین قرار داد پر قائم ہوجائے ' اور اسی طرح ہمارے اور دوسرے صوبوں کی اُردو انجمنیں فرداً فرداً اس بارے میں ایک فیصلے پر پہنچ جائیں اس مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد بہتر ہوگا کہ اس قسم کی تمام انجمنوں کے نمائندے یکجا جمع ہو کر بحث و تمحیص کے بعد ایک واحد قرار داد پر پہنچیں ۔ پھر ہر انجمن اپنے اپنے عمل اور اثر کے دائرے میں اس متحدہ تجویز کو شائع کرے لیکن یہ کوشش صحیح اور کامل معنوں میں تب ہی کامیاب ہوگی کہ جب اہل اردو متفقہ طور پر ' ایک طرف اپنے اپنے صوبے کے صیغۂ تعلیم کو آمادہ بلکہ مجبور کریں کہ آئندہ اسکولوں کے اردو نصاب کی تمام کتابوں میں ان علامات کا استعمال کریں ' اور دوسری طرف آئندہ کے تمام مصنف اور مؤلف اِس کا پورا پورا خیال رکھیں اور اس پر کاربند ہوں ۔

اِس مقام پر شاید بےجا نہ ہوگا اگر دفع دخل مقدر کے طور پر یہ بھی عرض کردوں کہ اوقاف کی علامات کا استعمال نہ صرف یہ کہ محال ' ناممکن یا مشکل نہیں ہے ' بلکہ یہ علامتیں ' کم و بیش ' خاصے طویل عرصے سے اردو میں استعمال بھی ہو رہی ہیں ۔ میں نے سنہ ۱۹۲۳ع میں اپنے مضمون میں (رسالۂ اردو بہ حوالۂ بالا) میں عرض کیا تھا کہ " میں نے اپنی کتاب خلافت موحدین میں ان تمام اوقاف کا باقاعدہ استعمال کیا ہے ' اور جہاں تک مجھے خیال ہے یہ کتاب اردو ادبیات میں پہلی ہی کتاب ہے جس میں یہ التزام کیا گیا ہے " . مگر ' خود غلط بوداٰنچہ ماپنداشتیم ! مجھے اپنے اس قول کے دوسرے جملے کی

ناروائی کا اعتراف ہے . حقیقت امر یہ ہے کہ ' جیسا کہ میں اس سے قبل ذکر کرچکا ہوں ' مجھ سے بیس سال پہلے مولوی نظام‌الدین حسن نے ان کو استعمال کیا ؛ اور ان سے بھی پانچ سال قبل الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب یادگار غالب میں اوقاف کی بیشتر علامتوں کو نہایت خوبی اور صحت سے برتا ہے . " یادگار " کے جس ایڈیشن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ رحمت‌الله رعد کے نامی پریس کانپور میں میر لکھنوی کے قلم سے سنہ ۱۸۹۷ع میں چھپ کر شائع ہوا ہے ' اور غالباً یہ اُس عزیز کتاب کا پہلا ہی ایڈیشن تھا . بعد کی اشاعتوں میں اُس کی یہ خوبی اس سے چھین لی گئی . میرا خیال ہے کہ حالی سے پہلے کسی نے ان علامات کو استعمال نہیں کیا . حالی کی زندہ جاوید مسدس بارہا چھپی . حال ہی میں اس کا ایک نہایت شاندار اور دیدہ زیب ایڈیشن نکلا ہے . مگر اسے دیکھ کر منہ سے بے اختیار آہ نکلتی ہے کہ ارباب نشر نے اس کی طباعت میں حالی مرحوم کی اس فردی خصوصیت کا مطلق لحاظ نہیں رکھا . حالی اب بھی اپنی زبان حال سے " اے بسا آرزو کہ خاک شدہ " کہہ کر تڑپ کے رہ گئے ہوں گے .

بعض کا خیال ہے کہ ان تمام علامات اوقاف کو عبارت میں استعمال نہیں کیا جاسکتا ' خاص کر وقف کامل (فل اسٹاپ) کے متعلق یہ شبہہ وارد اور ظاہر کیا جاتا ہے . علامہ حالی کی " یاد گار " نے جس ایڈیشن کا میں نے ذکر کیا ہے اس کی محض ورق گردانی سے بھی اس کا ثبوت مل جاتا ہے کہ یہ شبہہ محض شبہہ ہے ' اور اسے یقین اور حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں . حالی نے ان علامات کے لکھنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہی مولوی نظام‌الدین حسن کی مذکورہ بالا کتاب میں موجود ہے' اور مجھے اس تواردہ پر فخر ہے کہ میں نے بھی (بالکل ناواقفیت کے عالم

میں) وہی اسلوب اختیار کیا ۔ اس سے شاید یہ ثابت ہوسکے کہ ان علامات کا یہ طریقۂ اظہار بجا اور مناسب ہے ۔ میلے سنہ ۱۹۲۲ع سے اپنی تمام ناچیز تحریروں میں ' مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ ' نجی کے خطوط ہوں یا سبھا تک پہنچنے والی چیزیں' ہمیشہ اور برابر ان علامات کو استعمال کیا ہے اور کرتا ہوں ۔ سنہ ۱۹۲۳ع اور سنہ ۱۹۲۴ع میں مجھے یہ اتفاق نصیب ہوا کہ صوبہ مدراس کے ہائی اسکول کے درجوں کے لئے اُردو نظم کا نصاب بناؤں' میں نے یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا ' اور دونوں مرتبہ تجربے کے طور پر تمام اشعار اور ان کے حواشی کو شروع سے آخر تک ان علامات سے مزین کر دیا - پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا ' بلکہ دونوں برسوں میں اس آزمایش کی صحت اور خوبی کی طرف سے اپنا اطمینان کرنے کے لئے ہائی اسکول کی دونوں جماعتوں کو مسلسل چند روز تک خود درس دیا ' اور طلبہ کی یہ رائے سن کر اطمینان حاصل کیا کہ ان علامات کی وجہ سے اِنھیں نہ صرف اشعار کے سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے بلکہ اُن کے معانی سے اور زیادہ لطف اندوز ہونے میں مدد بھی ملتی ہے ۔ خود اس معزز اکیڈمی نے اب تک میری جتنی تحریر شائع کی ہے ' سب ان تمام علامات اوقاف کی حامل ہے ؛ اور میں نے اپنے کسی کرم فرما سے اِن کے بارے میں کسی نوع کی شکایت نہیں سنی ۔

یہ صحیح ہے ' اور مجھے اس سے نہ انکار ہے نہ ہوسکتا ہے کہ اِدھر چند سال سے اُردو کے متعدد رسالوں اور کتابوں میں اِن اوقاف کا استعمال نظر آتا ہے ۔ لیکن ان سب مطبوعات کے ایک سر سری مطالعے سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں اوقاف کا استعمال جس طور سے کیا جاتا ہے اُس کی توصیف میں سوا اس کے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے لکھنے والوں کی انتہائی بد تمیزی اور بد مذاقی کا پتہ چلتا ہے ۔

یہ امر اور بھی زیادہ تاسف انگیز ہو جاتا ہے جب ہم اپنے صوبے کی بعض نامور اور مقتدر علمی جماعتوں کی مطبوعات کے ہر صفحے اور ہر سطر میں اسی بے تمیزی اور بے مذاقی کو جلوہ گر پاتے ہیں ۔ ان جماعتوں کے ارباب سے جہاں اِس کی شکایت ہے ' وہیں یہ عاجزانہ التماس بھی ہے کہ وہ اِس کی صحیح اور قرار واقعی درستگی کی طرف توجہ فرمائیں ۔ ان حضرات کی اس روش سے اتنا فائدہ ضرور ہو رہا ہے کہ آئندہ جب کوئی مبصر اُردو تحریر میں علامات اوقاف کے استعمال اور رواج کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا ' تو یہ مطبوعات اسے ہمارے اس زمانے کا پتہ دیں گی جسے وہ اس چیز کے نشو کا دور کہے گا — اور ظاہر ہے کہ دور نشو میں اسی طرح کی افراط و تفریط ہوا کرتی ہے ' تا آنکہ کوئی چیز ایک خاص اور معین صورت اختیار کرے ۔

حضرات ! مدعا اس سمع خراشی کا یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اُردو تحریر میں علامات اوقاف کا استعمال جاری کردیں ۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس پر غور کرنے کے لئے اپنا کچھ وقت صرف فرمائیں گے ۔

دور آصفیہ میں حیدرآباد کی اُردو شاعری

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور - ایم - اے ' پی ایچ - ڈی (لنڈن)

حیدرآباد کی اردو شاعری کا ذخیرہ فطرتی طور پر دو جدا جدا حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے - پہلا حصہ عہد قطب شاہیہ کی شعری پیداوار پر مشتمل ہے اور دوسرے میں عہد آصفجاہیہ کے گنجینہ ہاے شعر و سخن شامل ہیں - پہلے حصہ کی نسبت اسوقت تک متعدد کتابوں (مثلاً اردوے قدیم ' اردو شہ پارے ' محبوب‌الزمن ' دکن میں اردو ' یورپ میں دکنی مخطوطات اور جواہر سخن وغیرہ) نیز مختلف رسائل میں تفصیلی معلومات شایع ہو چکے ہیں - چنانچہ اول‌الذکر دو کتابیں تو قطب شاہی اردو شعر و شاعری کی ایک حد تک مکمل تاریخیں ہیں' لیکن صرف عہد آصفیہ سے متعلق کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو محض اس عہد کی اردو شعر و شاعری کی مکمل و مبسوط تاریخ سمجھی جا سکے - اگرچہ متذکرہ کتابوں اور متفرق رسائل میں اس زمانے کے بعض شاعروں کے حالات اور کلام کے چند نمونے شایع ہوئے ہیں لیکن اس وقت تک اس امر کی کوشش نہیں کی گئی کہ عہد آصفیہ کی اردو شاعری پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی جائے - اس موضوع پر کچھ عرصہ سے راقم‌الحروف مصروف‌کار ہے چنانچہ آج کی صحبت میں اسی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے -

عہد آصفیہ کی اردو شاعری گونا گوں خصوصیات اور زبان و خیال کے مختلف رجحانات کے اعتبار سے پانچ جداگانہ ادوار پر منقسم ہوتی ہے - چنانچہ پہلا دور سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک قرار پاتا ہے - اس دور کے پچاس سے زیادہ اردو شاعروں کا پتہ چلا ہے - جن میں اکثر اورنگ‌آبادی ہیں - لیکن جب سنہ ۱۱۸۳ھ میں حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارالحکومت قرار پایا ، علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سرگرمیاں بھی وہیں منتقل ہوگئیں - اس دور کے متعدد شعرا اساتذۂ فن سمجھے جاتے ہیں -ان میں سے اکثروں کے اردو دواوین، مثنویوں ، مرثیوں اور قصیدوں وغیرہ کے مجموعے بھی اس وقت موجود ہیں - شاہ سراج ، درگاہ قلی خاں درگاہ ، نوازش علی خاں شیدا اور شاہ تجلی علی تجلی کے علاوہ محمد ماہ محرم (۱۱۹۶) مرزا داؤد (۱۱۶۸) نورالدین علی خاں رنگین (۱۱۷۰) عاشق علی خاں ایما (۱۱۷۲) کنھیا مل مہا سنگھ حقیر (۱۱۷۷) مرزا عطا ضیا (۱۱۸۳) منورالدولہ پیار (۱۱۸۵) معتبر خاں عمر (۱۱۸۷) میر حفیظ اللہ واحد (۱۱۸۸) فخر (۱۱۹۰) صمصام‌الملک صارم (۱۱۹۲) شیخ احمد مضطر (۱۱۹۴) لال چند رنگین (۱۱۹۵) سرونجی رائے لالہ (۱۲۰۰) شیخ ظہورالدین نادر (۱۲۰۱) موہن لال مہتاب (۱۲۰۲) جے کشن بے جان ، شاہ عنایت اللہ فتوت ، اسد علی خاں تمنا ، اور لچھمی نارائن شفیق - اس دور کے مشہور شعرا میں سے ہیں - موخرالذکر تین شاعر تو صاحب تذکرہ بھی ہیں جن کے تذکروں کی طباعت کا انتظام انجمن ترقی اردو خاص اہتمام سے کر رہی ہے اور ان میں سے ایک یعنی چمنستان شعرا کو تو شایع بھی کر چکی ہے -

اس زمانہ میں شمالی ہند سے جو شاعر دکن گئے تھے ان میں میر غلام علی آزاد ، غلام علی ارشد ، ملا باقر شہید ، نورالعین واقف ، عبدالحکیم

حاکم ' اور عبدالقادر سامی وغیرہ خاصکر قابل ذکر ہیں جو نواب ناصر جنگ شہید (۱۱۶۴) اور بعد میں نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کی سرپرستی شعر و سخن سے مستفید ہوئے -

اُس وقت شمالی ہند میں شیخ شرف‌الدین مضمون (۱۱۵۸) نجم‌الدین علی خاں آبرو (۱۱۶۱) انعام‌اللہ خاں یقین (قبل ۱۱۷۰) اشرف علی خاں فغاں (۱۱۸۶) مرزا جان جاناں مظہر (۱۱۹۴) محمد رفیع سودا (۱۱۹۵) خواجہ میر درد (۱۱۹۹) میر حسن (۱۲۰۱) شیخ ظہورالدین حاتم (۱۲۰۷) اور ان کا معاصرین ناجی ' یکرنگ ' احسن ' اور بیدار وغیرہ اردو کے مشہور شعرا تھے -

دکن کی اردو شاعری کے اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں قدیم دکنی اردو میں لکھنے والے شاعر موجود تھے اور اس دور کے ختم پر اُن کے ساتھ دکنی زبان کی ادبی حیثیت بھی ختم ہوگئی - اِسی طرح اس دور کا خاتمہ اورنگ‌اباد کی علمی چہل پہل اور شعر و سخن کی سر گرمیوں کا خاتمہ ہے - اسی زمانہ میں قریب ایک‌سو سال تک عالم کس مپرسی میں رہنے کے بعد پھر شہر حیدرآباد دکن کی سیاسی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا - اور وہاں آصفی حکمرانوں کے زیر سایہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی قدیم علمی و ادبی روایات ازسرنو زندہ ہوگئیں -

عہد آصفیہ میں اردو شاعری کا دوسرا دور سنہ ۱۲۰۰ سے ۱۲۲۵ تک کے زمانہ پر مشتمل ہے - کیونکہ اس وقت نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی (۱۲۱۸) اور نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث (۱۲۴۴) کے علاوہ وزراے سلطنت ارسطو جاہ (۱۲۱۹) اور میر عالم (۱۲۲۳) نے حیدرآباد میں شعر و سخن کی خاص سرپرستی کی ہے جسکا شہرہ سنکر

اس دور میں اقصائے ہندوستان سے متعدد باکمال اردو شاعروں نے بھی دکن کا رخ کیا تھا - مرزا علی لطف ' حافظ مشتاق ' غلام امام شہید' احسن‌اللہ خاں بیان وغیرہ اور دیگر شعرا اسی زمانہ میں حیدرآباد گئےتھے - ارسطو جاہ کا دربار اردو شاعری کا گہوارہ تھا - اتفاق سے اس مرکز سخن کی ایک یادگار اس وقت حیدرآباد کے دفتر دیوانی ومال میں محفوظ ہے - یہ اصل میں صرف ان اردو قصائد کے انتخابات کا مجموعہ ہے ' جو ارسطو جاہ کی مدح میں مختلف اوقات میں پڑھے گئے - اسمیں سوسے زیادہ اردو شاعروں کے قصیدے درج ہیں - اور اپنے موضوع اور زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے اسقدر اہم ہیں کہ زبان اردو پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اس مجموعہ کا مطالعہ لازمی ہے - اس کے ذریعہ سے آج سے تیرہم سو سال کے مختلف مقامات کے رہنے والے شاعروں کے کلام اور زبان کے باہمی فرق کے متعلق نہایت اہم انکشافات ہوتے ہیں -

اس دور میں جن دکھنی شاعروں نے خاص اہمیت حاصل کی انمیں صرف ایمان چندا ' متین ' اور شاداں کا تذکرہ اس موقعہ پر کافی ہے - اس زمانہ میں قدیم دکنی زبان شعر و سخن کے لئے بالکل ترک کردی گئی اور شمالی اردو کا دکن پر تسلط ہو گیا - اسی وقت سے دکن کے شاعر شمال کے اساتذہ سے اپنے کلام میں اصلاح لینے پر مجبور ہوگئے -

تیسرا دور سنہ ۱۲۲۵ سے ۱۳۰۰ تک قرار پاتا ہے' اس میں نواب سکندر جاہ کے علاوہ نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع (۱۲۷۳) اور نواب افضل‌الدولہ آصفجاہ خامس (۱۲۸۵) اور اُن کے وزرا و امرا مثلاً مہاراجہ چندو لال شاداں (۱۲۹۱) اور نواب فخرالدین خاں شمس‌الامرا (۱۲۷۹) اور اُن کے فرزندوں کی بے نظیر سرپرستیوں نے حیدرآباد کو اردو ادب کا مرکز بنادیا - یہ دراصل حافظ میر شمس‌الدین محمد فیض (۱۲۸۳)

اور اُن کے تلامذہ کا عہد تھا جن کا اسی زمانہ میں ایک مبسوط تذکرہ قلمبند کیا گیا تھا جسکے قلمی نسخے اس وقت محفوظ ہیں - اس دور کے سربرآوردہ شعرا میر شمس الدین فیض ' بدالدین خاں تمیز ' گردھاری پرشاد باقی ' مشرف جنگ فیاض اور میر اصغر حسین ناجی ہیں لیکن اس زمانہ میں حیدراباد میں سو سے زیادہ ممتاز شعرا موجود تھے - میر حسین علی خاں ایما (۱۲۳۰) میر بہاالدین حسین خاں عروج (۱۲۳۰) میر عباس علی خاں کافی (۱۲۳۷) میر سجاد علی خاں سجاد (۱۲۴۰) اس دور کے اوائل کے مشہور شعرا ہیں - بعد کے شاعروں میں حافظ غلام محمود محمود (۱۲۸٦) شاہ معین الدین خاموش (۱۲۸۹) مرزا قربان علی بیگ سالک (۱۲۹۱) محمد روشن خاں روشن (۱۳۰۰) افتخار علی شاہ وطن - حکیم مظفرالدین خان مزاج ' بچھو لال تمکین ' سیتل پرشاد خرم ' احمد علی قاضی ' محمد محسن محسن ' حفیظ الدین پاس' بہاری لال رمز ' حیدرعلی حیدر ' عبداللہ حسین افسر اور فیاض الدین مرد وغیرہ شامل ہیں -

اس وقت حیدراباد میں متعدد ایسے شعرا بھی موجود تھے جو وہاں کی قدردانی سخن سے مستفید ہونے کے لئے دور دراز مقامات سے وہاں گئے تھے اور جن میں سے بعض تو وہیں رہگئے اور حیدراباد ہی کو اپنا وطن قرار دے لیا - جو صاحبان کمال اس دور میں وارد حیدراباد ہوے اُن میں حسب ذیل مشہور ہیں - شیخ حفیظ (۱۲۴۷) مرزا علی رضا مرہون (۱۲۵۲) عیسی خاں افاق (۱۲۵۳) شاہ نصیر (۱۲۵۴) شیخ وزیر علی مسرت (۱۲۵۷) حیدر بیگ خاکی (۱۲۵۷) ذوالفقار علی خاں صفا (۱۲٦۰) حبیب اللہ ذکا (۱۲۹۱) میر احمد علی خاں شہید (۱۲۹۲) میر سرفراز علی وصفی (۱۲۹۳) میر غلام حسین قدر (۱۳۰۱) اور میر کاظم علی خاں شعلہ (۱۳۰۸) -

یہ پچھتر سال اُردو شاعری کے عہد سمجھے جاسکتے ھیں کیونکہ اسی زمانہ میں شمالی ھند میں بھی متعدد اعلیٰ پایہ اور ممتاز شاعر موجود تھے مثلاً انشا (۱۲۲۳) مصحفی (۱۲۴۰) نظیر (۱۲۳۹) رنگین (۱۲۵۱) ناسخ (۱۲۵۴) ممنون (۱۲۶۰) نسیم لکھنوی (۱۲۶۰) آتش (۱۲۶۳) مومن (۱۲۶۸) وزیر (۱۲۷۰) ذوق (۱۲۷۱) نسیم دھلوی (۱۲۸۱) رشک (۱۲۸۴) آزردہ (۱۲۸۵) غالب (۱۲۸۵) شیفتہ (۱۲۸۶) انیس (۱۲۹۲) دبیر (۱۲۹۲) اسیر (۱۲۹۷) منیر (۱۲۹۸) اور بحر (۱۳۰۰) وغیرہ -

دکن کی اُردو شاعری کے اس دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس زمانہ میں دکنی شعرا میں ایک گونہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی کشمکش نے انھیں قدیم دکنی اُردو سے بالکل غیر مانوس کر دیا تھا اور اب وہ شمالی اُردو میں قادرالکلامی سے اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور شاعرانہ نکات پیدا کرنے لگے تھے - اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ کے بعض دکنی شاعر مثلاً فیض، باقی، سالک، وطن، عصر اور مزاج وغیرہ اُردو کے مسلم‌الثبوت اساتذہ سخن مانے جاسکتے ھیں -

دکن کی اُردو شاعری کا چوتھا دور سنہ ۱۳۰۰ ھجری سے سنہ ۱۳۳۰ ھجری تک قرار دیا جاسکتا ھے - یہ دور بھی عہد ماضی کے مانند نہایت درخشاں رھا - نواب محبوب علی خاں آصفجاہ سادس (۱۳۲۹) ادب نواز اور شعر و سخن کے قدردان ہونے کے علاوہ خود بھی اچھے شاعر تھے - یوں تو بیرون ریاست اور خاص کر شمالی ھندستان کے شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ پہلے سے قائم ہوچکا تھا، اس دور میں اور بھی اس میں اضافہ ہوا - اس باھمی میل جول کا شاعری پر بھی اچھا اثر پڑا - سب

کا رجحان صحیح شاعری کی طرف تھا - ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا اور متفقہ طور پر اصلاح زبان کي طرف خاص توجہ رھی - رفتہ رفتہ متروکات کي بنیاد مضبوط ھوتی گئی اور اسلوب بیان بھی بدل گیا -

اسوقت حیدرآباد میں اچھے اچھے فنی کمال اور صاحب فن شعرا کچھ تو دکن ھی کے تھے اور چند باھر سے آئے ھوئے تھے جنکی کئی صفحات کی ایک طویل فہرست مرتب کی گئی ھے - لیکن یہاں بنظر اختصار اس دور کے سب سے مشہور شعرا ڈاکٹر سید احمد حسین مائل، جلال‌الدین توفیق ، رضی‌الدین کیفی ، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، عزیز یار جنگ عزیز اور غلام مصطفیٰ رسا کے علاوہ قادر حسین فرق ، تراب علی زور ، مظفرالدین معلی، غلام محمد عرب شوق ، دلاور علی دانش، حسین علی خاں امیر ، امیر حمزہ حمزہ ، خیرات علی خاں سخی ، آصف یاوروالملک وزیر ، محمد علی بخش، امداد حسین عازم، مہدی حسین الم ، نوازش علی لمعہ ، نوازش علی مست ، لقمان‌الدولہ دل ، اعظم علی شایق ، احمداللہ واصل ، احمد نواز جنگ فانی، عبدالصمد واصفی، عبدالغفور خاں نامی، صولت جنگ عابد ، اور عبدالولی فروغ وغیرہ کے نام قابل ذکر ھیں -

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے ان میں کاظم حسین شیفتہ ، محمد کاظم حبیب ، حیدریار جنگ نظم ، شمس‌الحق میکش ، فصیح‌الملک داغ ، امیر احمد امیر ، ظہیرالدین ظہیر ، نواب مرزا شکیب ، عبدالرحمن بیدل ، محمد باقر فکر ، امراؤ مرزا نادان ، سید محمد شاہ وارثی بے نظیر ، درگا پرشاد ذکا ، نادر علی برتر ، عبداللہ خاں ضیغم ، نجم‌الدین ثاقب ، جمال‌الدین اشک ، فصاحت جنگ جلیل ، اختر یار جنگ اختر ، ابوالحمید آزاد ، ملھرالدین

ضیا ، امیر حسن فروغ ، اور اصغر یار جنگ اصغر ، نے کافی شہرت حاصل کی -

اس دور کے شمالی ہند کے باکمال شاعروں میں میر مہدی مجروح ، حکیم ضامن علی جلال ، منشی امیراللہ تسلیم ، عبدالرحمان راسخ ، سید علی نقی صفی ، مرزا ہادی عزیز ، علی حسن احسن ، سراج الدین احمد خاں سائل ، محمد نوح نوح ، کلیم برہم ، احمد علی شوق ، محمد محسن محسن ، عبدالحی بے خود ، محمد جعفر اوج ، سید علی شاد ، امداد امام اثر ، افتخار حسین مضطر ، وحیدالدین احمد بے خود ، اور جدید طرز کے شعرا میں محمد حسین آزاد ، الطاف حسین حالی ، محمد اسمعیل ، اکبر حسین اکبر ، برج ناراین چکبست اور درگا سہائے سرور وغیرہ کے نام اُردو ادب اور شعر و شاعری سے ہر ایک دلچسپی رکھنے والا جانتا ہے -

یہ دور اصل میں نواب مرزا داغ اور ان کے تلامذہ کا دور ہے - داغ کی شخصیت اور شہرت نے دہلی کے دبستان سخن کو ازسرنو زندہ کردیا ورنہ کوئی تعجب نہیں کہ لکھنؤ کی خدمات شعر و سخن دہلی کے دبستان کو پس پشت ڈالدیتیں - گذشتہ زمانہ میں حیدرآباد کی شاعری میں جو خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اس دور میں وہ پھر متزلزل ہو گئی اور حیدرآباد کے اکثر شعرائے اُردو داغ کے شاگرد ہوگئے اس طرح سے حیدرآباد کی شاعری پھر سے دہلی کے دبستان سخن اور خاص کر داغ کے رنگ سے بے حد متاثر ہوئی -

دکن کی اردو شاعری کا پانچواں دور عہد حاضر پر مشتمل ہے یعنی سنہ ۱۳۳۰ ہجری سے ۱۳۵۴ ہجری تک - درحقیقت دکن کی اردو سرپرستی کا تابناک عہد ہے - حضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع

خود بلند پایہ شاعر اور قدردانِ سخن ہیں - ولیعہد سلطنت نواب اعظم جاہ اعظم اور شہزادہ والاشان معظم جاہ شجیع کے علاوہ دوسرے شہزادگانِ والا تبار کو بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی ہے - امرائے عظام میں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت شاد ' نواب معین الدولہ معین اور نواب لطف الدولہ لطف کو بھی شعر و سخن کا خاص ذوق رہا ہے - اس وقت حیدرآباد میں سیکڑوں اردو شاعر موجود ہیں لیکن جو اپنی عمر عزیز کے چالیس سال گذار کر پختہ مشق ہوگئے ہیں ان کی فہرست بھی نہایت طویل ہے - اس موقع پر صرف حبیب الدین صغیر ' احمد حسین امجد ' بہبود علی صفی ' غلام مصطفیٰ ذہین ' محب اللہ خاں عالی ' اعجاز علی شہرت ' راگھویندر راؤ جذب ' نرسنگھ راج عالی ' حبیب اللہ وفا ' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں -

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے ان میں نظیر حسین سخا ' نظام شاہ لبیب ' مرزا ہادی رسوا ' وحیدالدین سلیم ' صادق حسین غبار ' ناظرالحسن ہوش ' شبیر حسن خاں جوش ' کاظم علی باغ ' نثار یار جنگ مزاج ' واجد حسین یگانہ اور شوکت علی خاں فانی وغیرہ بہت مشہور ہیں -

اس دور کے شمالی ہند کے مشہور شعرا سے اس مجلس کا ہر شخص اچھی طرح واقف ہے -

دکن کی گذشتہ دوسو سال کی اردو شاعری کے اس مختصر سے تبصرہ میں افسوس ہے کہ نہ تو ہر دور کی شاعری کے نمونے درج کئے جاسکتے تھے اور نہ جملہ شاعروں کی فہرست - یوں بھی یہ مضمون ایک طرح سے فہرست ہی معلوم ہوتا ہے - یہ موضوع اسقدر بسیط ہے کہ ایک مضمون تو کجا ایک کتاب کی گنجائش بھی اس کے لئے ناکافی ہے - چنانچہ فی الحال

ضیا ' امیر حسن فروغ ' اور اصغر یار جنگ اصغر ' نے کافی شہرت حاصل کی -

اس دور کے شمالی ہند کے باکمال شاعروں میں میر مہدی مجروح ' حکیم ضامن علی جلال ' منشی امیراللہ تسلیم ' عبدالرحمان راسخ ' سید علی نقی صفی ' مرزا ہادی عزیز ' علی حسن احسن ' سراج‌الدین احمد خاں سائل ' محمد نوح نوح ' کلیم برہم ' احمد علی شوق ' محمد محسن محسن ' عبدالحی بے خود ' محمد جعفر اوج ' سید علی شاد ' امداد امام اثر ' افتخار حسین مضطر ' وحیدالدین احمد بے خود ' اور جدید طرز کے شعرا میں محمد حسین آزاد ' الطاف حسین حالی ' محمد اسمعیل' اکبر حسین اکبر ' برج نارائن چکبست اور درگا سہائے سرور وغیرہ کے نام اُردو ادب اور شعر و شاعری سے ہر ایک دلچسپی رکھنے والا جانتا ہے -

یہ دور اصل میں نواب مرزا داغ اور ان کے تلامذہ کا دور ہے - داغ کی شخصیت اور شہرت نے دہلی کے دبستان سخن کو ازسرنو زندہ کردیا ورنہ کوئی تعجب نہیں کہ لکھنؤ کی خدمات شعر و سخن دہلی کے دبستان کو پس پشت ڈالدیتیں - گذشتہ زمانہ میں حیدرآباد کی شاعری میں جو خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اس دور میں وہ پھر متزلزل ہو گئی اور حیدرآباد کے اکثر شعرائے اُردو داغ کے شاگرد ہوگئے اس طرح سے حیدرآباد کی شاعری پھر سے دہلی کے دبستان سخن اور خاص کر داغ کے رنگ سے بے حد متاثر ہوئی ۔

دکن کی اردو شاعری کا پانچواں دور عہد حاضر پر مشتمل ہے یعنی سنہ ۱۳۳۰ ھجری سے ۱۳۵۴ ھجری تک - درحقیقت دکن کی اردو سرپرستی کا تابناک عہد ہے - حضرت سلطان‌العلوم آصفجاہ سابع

خود بلند پایہ شاعر اور قدردان سخن ہیں - ولیعہد سلطنت نواب اعظم جاہ اعظم اور شہزادہ والاشان معظم جاہ شجیع کے علاوہ دوسرے شہزادگان والا تبار کو بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی ہے - امرائے عظام میں مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت شاد ٬ نواب معین الدولہ معین اور نواب لطف الدولہ لطف کو بھی شعر و سخن کا خاص ذوق رہا ہے - اس وقت حیدرآباد میں سیکڑوں اردو شاعر موجود ہیں لیکن جو اپنی عمر عزیز کے چالیس سال گذار کر پختہ مشق ہوگئے ہیں ان کی فہرست بھی نہایت طویل ہے - اس موقع پر صرف حبیب الدین صغیر ٬ احمد حسین امجد ٬ بہبود علی صفی ٬ غلام مصطفیٰ ذہین ٬ محب اللہ خاں عالی ٬ اعجاز علی شہرت ٬ راگھویندر راؤ جذب ٬ نرسنگھ راج عالی ٬ حبیب اللہ وفا ٬ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں -

جو شاعر اس دور میں حیدرآباد آئے ان میں نظیر حسین سخا ٬ نظام شاہ لبیب ٬ مرزا ہادی رسوا ٬ وحیدالدین سلیم ٬ صادق حسین غبار ٬ ناظرالحسن ہوش ٬ شبیر حسن خاں جوش ٬ کاظم علی باغ ٬ نثار یار جنگ مزاج ٬ واجد حسین یگانہ اور شوکت علی خاں فانی وغیرہ بہت مشہور ہیں -

اس دور کے شمالی ہند کے مشہور شعرا سے اس مجلس کا ہر شخص اچھی طرح واقف ہے -

دکن کی گذشتہ دوسو سال کی اردو شاعری کے اس مختصر سے تبصرہ میں افسوس ہے کہ نہ تو ہر دور کی شاعری کے نمونے درج کئے جاسکتے تھے اور نہ جملہ شاعروں کی فہرست - یوں بھی یہ مضمون ایک طرح سے فہرست ہی معلوم ہوتا ہے - یہ موضوع اسقدر بسیط ہے کہ ایک مضمون تو کجا ایک کتاب کی گنجائش بھی اس کے لئے ناکافی ہے - چنانچہ فی الحال

اس کی پہلی قسط جو چار سو سے زیادہ صفحات کی ایک مبسوط کتاب پر مبنی ہے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے جشن سیمیں کے موقع پر شایع ہورہی ہے - اس میں اِس پچیس سالہ جشن کی مناسبت سے صرف پچیس شاعروں کے حالات اور مختصر سا نمونۂ کلام پیش کیا جارہا ہے -

دکن کی گذشتہ دو سو سال کی اردو شاعری کے ذخیرہ میں جہاں سراج ' شہدا ' اور ایمان جیسے بلند پایہ مثنوی نگاروں کی دلچسپ مثنویاں موجود ہیں - تجلي ' ایمان ' قیس اور مائل کے قصائد بھی شامل ہیں - اس میں باقی ' عصر اور امجد کی پرتاثیر رباعیوں کے ساتھ درگاہ ' ناجی ' اور سرور کے رقت آمیز مرثیے اور نوحے بھی نظر سے گذرتے ہیں - اسی طرح فیض ' عصر اور ناجي جیسے باکمال تاریخ گو شعرا کی تاریخوں کے علاوہ قیس کی دلچسپ ریختی بھي موجود ہے - تغزل کے دلدادگان کے لئے سراج ' چندا ' فیض ' مائل ' فیاض ' عزیز ' توفیق اور صفي کا کلام بہترین سوغات کا کام دیتا ہے - تصوف و عرفان اور اعلیٰ تخیلات و احساسات سے ذوق رکھنے والے سراج ' فیض ' توفیق ' شاد ' صغیر ' اور امجد کے کلام سے خاص کیف حاصل کرتے ہیں - غرض آصفی دور نے گذشتہ دوسو سال میں دکن میں ہر رنگ کے شاعر پیدا کئے جنہوں نے حیدرآباد کی اردو شاعری کے ذخیرہ میں ہر طرز کے نمونے فراہم کردئے - اس طرح سے تاریخ دکن کا یہ دور بھی قطب شاہی اور عادل شاہی عہد سے پیچھے نہیں ہے - یہ اور بات ہے کہ قطب شاہي اور عادل شاہی دور کے شعرا اور کتابوں کي طرح عہد آصفیہ کے شاعر اور ان کا کلام دنیائے اردو میں اب تک روشناس نہیں ہوا -

اردو زبان اور ادب کی غیر معمولی وسعت و استحکام اور اس کی قدیمي عظمت و فضیلت ابھی پوری طرح سے بے نقاب نہیں ہوئی ہے -

حیدرآباد کی طرح ہندوستان کے دیگر صوبجات میں بھی اُردو ادب کے ذخیرہ میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے - لیکن یہ اردو بولنے والوں اور خود زبان اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کا ہر خدمت گذار تمام دنیائے اردو میں روشناس نہیں ہوسکتا - اکثر اعلیٰ پایہ کے شاعر اور مصنف محض صوبجاتی تعصبات اور ذاتی اختلافات کی بنا پر گوشہ گمنامی میں پڑ جاتے - ہیں اور ان کے قابل قدر کارنامے نقش و نگار طاق نسیاں بن جاتے ہیں - لیکن وہ زمانہ دور نہیں ہے جبکہ اہل اردو کو خواب غفلت سے چونکنا پڑے گا - یہ مصنوعی حدبندیاں باقی نہیں رہیں گی ' اور اردو ادب کے حقیقی خدمت گذار خواہ وہ ہندستان کے کسی گوشہ میں کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں منظر عام پر آئیں گے اور ان کی خدمات صحیح داد حاصل کریں گی - اور سب اردو بولنے والے اُن سے یکساں مستفید ہوں گے -

عہد جدید کی تعمیر و تہذیب میں
ادب اردو کا عالی حصہ

(از مولانا سیماب اکبرآبادی)

دنیا کا لمحۂ آغاز دراصل انسانی تمدن کا آغاز ہے - سب سے پہلے انسان کی ایک کروٹ تمدن تھی اور دوسری تہذیب - انسان کے ہر نئے سانس کے ساتھ انسانی ارتقا کا تعلق رہا ہے - اور جب تک سطح زمین پر ایک انسان کے بھی سانس لینے کی گنجائش باقی رہے گی ارتقاے مدنیت کا امکان باقی رہے گا - نشو مدنیت کا دوسرا نام تہذیب و تعمیر ہے - اور جس طرح انسان اور تہذیب ہمیشہ لازم و ملزوم رہے ہیں اسی طرح تہذیب و ادب کا بھی ہمیشہ ساتھ رہا ہے - ادب سے میری مراد زبان کا وہ اختراع فائق ہے جو نثر اور نظم دونوں اصناف کلام پر حاوی ہے - مگر اس مضمون میں میرا مطمح موضوع صرف نظم یا شاعری ہے -

ادب اور تہذیب و تمدن کا عالمگیر تعلق

لسانی تقسیم و اقتضا سے ذرا الگ ہٹ کر جب ہم دیکھتے ہیں تو شاعری کی حقیقت، شاعری کی کیفیت، شاعری کے تاثرات اور شاعری کی نفسیات، حقیقتاً ہر دور اور ہر عالم میں یکساں نظر آتی ہیں - شاعری صرف ایک چیز کی ترجمان ہے اور وہ صداقت ہے - شاعری صرف ایک چیز کا آئینہ ہے اور وہ حسن ہے - سورج کی تابانی ہر شخص کے علم میں ہے - چاند سورج کی روشنی

شاعری اور ترجمانی تخئیل

سے کسب ضیا کرتا ہے یہ بھی ہر شخص کو معلوم ہے - پھول کھلتے ہیں، ہوا چلتی ہے، شبنم گرتی ہے، ان تمام مظاہر سے ہر بالغ نظر انسان واقف ہے - لیکن یہ راز کہ پھول کچھ کہتے ہیں، ہوا ہنستی ہے، اور شبنم روتی ہے صرف ایک فطرت شناس شاعر ہی جانتا ہے -

یہ تفوق جو شاعر کی قسمت ہے، اور یہ قوت جو شاعر کو ودیعت ہے، تخئیل کا کرشمہ ہے - افلاطون کہتا ہے کہ فلسفے کی بنیاد حیرت پر ہے - یعنی اگر کوئی بچہ کھلونے سے کھیلتے کھیلتے اپنی ماں سے یہ پوچھنے لگے کہ یہ کھلونا کیونکر بنا ہوگا ؟ تو یہیں سے فلسفے کے ایک مسئلے کی بنیاد پڑجاتی ہے - اسی تخئیل کی ترجمانی کا دوسرا نام شاعری ہے- اگر کوئی شخص پھول کی پتیاں دیکھتے دیکھتے پوچھنے لگے کہ یہ پتیاں کسی کا پردہ تو نہیں ہیں ؟ تو بس یہیں سے ایک شاعر ذہن کا کام شروع ہو جاتا ہے -

تخئیل کا واسطہ صرف زندگی کے ان غیر متعلق شعبوں ہی سے نہیں بلکہ تخئیل زندگی کے ذروں سے لے کر زندگی کے لامحدود بیابانوں تک طاری وساری ہے - دنیاوی زندگی پر تخئیل کو پھیلاکر ہمارا کام یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ماضی کی تابندگیوں کو جگائیں، حال کے نقوش پر مبصرانہ اور ناقدانہ نظر ڈالیں - اور ایک امید افزا مستقبل کی تخلیق میں زندگی کے تسلسل کو دراز سے دراز تر بنادیں - اس سے ثابت ہوا کہ زندگی پر جس قدر بہتر تنقید اور روشن تبصرہ ایک شاعر کی تخئیل کر سکتی ہے اور کوئی نہیں کرسکتا -

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ تہذیب، معاشرت، ثقافت یا کلچر سے شاعری کا کیا تعلق ہے ؟ جو روایات و خصوصیات افراد قوم یا جماعت کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوکر استقلال کی حدتک پہونچ جاتی ہیں - وہ اُس قوم یا جماعت

شاعری اور تہذیب مدنیت

کی تہذیب کہلاتی ہیں - تہذیب عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے تخئیلی شکل میں ڈھلتی ہے - پھر اسی تخئیل کی ایک عملی صورت تہذیب بن جاتی ہے اور دوسری شاعری - تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تہذیب اور شاعری کا مد و جزر ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا ہے - فرانس ' اٹلی ' اور انگلستان کی تاریخیں شاہد ہیں کہ شاعری اور تہذیب ایک ساتھ ڈوبتی اور ابھرتی رہی ہیں - ترکی وتاتاری اور یونانی و ایرانی تہذیب کے زوال و کمال میں شاعری کا بیش از بیش حصہ رہا ہے - عرب میں شعراکی قصیدہ خوانی نے قبائل کے عروج و زوال میں معجزانہ کام کئے ہیں - قوموں کے عروج و زوال میں ہر ملک کے ادب کا ہاتھ ضرور رہا ہے - عروج کے وقت ادب میں زندگی و ارتقا کے قومی جراثیم موجود ہوتے ہیں - شاعر اپنے ملک کی ثقافت کا علمبردار ہوتا ہے - ادیب اپنے ملک کی اصلاح کے ضامن ہوتے ہیں اور اس طرح ملک و قوم عروج کی بلندیوں پر اپنے شعرا اور ادبا کے ساتھ صرف پرواز نظر آتی ہے - پھر جب کسی ملک یا قوم کے زوال کا وقت آتا ہے تو یہی شاعر اور یہی ادیب تخریب و تذلیل کے بدترین مظاہروں میں محو ہوجاتے ہیں - تاآنکہ ملک اور قومیں برباد ہوجاتی ہیں - اور انہیں کے ساتھ وہ تخریبی لٹریچر بھی ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتا ہے -

شاعری کی تعمیری قوتیں

وہ صرف ایک شاعر کا نغمہ تھا جو فرانس کو غلامی کی نیند سے جگا کر انقلاب کی شاہراہ پر لے آیا - وہ صرف شاعری ہی کا سحر تھا جس نے نفاق سے منقسم اٹلی کو متحد کر دیا - وہ صرف شاعری ہی کا اثر تھا جسلے یونان کو بربادی کے جہنم میں گرتے گرتے روک لیا - شاعری چونکہ فی نفسہ تخئیل کی ترجمان ہوتی ہے اس لئے جیسوں کی ذہنی تربیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوسکتی ہے -

شاعری ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ اس لئے ہے کہ وہ حسن اور صداقت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور سوا ان دو باتوں کے ذہنی تربیت کے لئے کسی دوسری چیز کی ضرورت بھی نہیں - شاعری ہمیں سمجھاتی ہے کہ مجاز کے علاوہ کوئی حقیقت بھی ہے - اور حسن اپنی تمام معصوم صفات کے ساتھ کن آداب و ائین کا پابند ہوسکتا ہے ؟

کسی بزدل نوجوان کے سامنے اُس کے باپ کی بہادری کا قصیدہ متواتر پڑھئے وہ بھی ایکدن اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار ہو جائے گا-دل و دماغ پر جلد سے جلد حاوی ہو جانے کی قوت شاعری میں انداز بیان کی موزونیت اور الفاظ کی موسیقیت پر مبنی ہے - اہل یونان شاعر کو Vates یعنی خالق کہتے ہیں - صرف اس لئے کہ شاعری جذبات و کیفیات کی خلاق ہے - اور وہ اُن اسرار کو بے نقاب کردیتی ہے جو عام طور پر نگاہ عوام سے بالاتر ہوتے ہیں - شاعری انسان کو جماعت کے تنگ دائرے میں محدود نہیں دیکھ سکتی - بلکہ وہ ان کو کائنات کی زنجیر مسلسل کی ایک کڑی دیکھنا چاہتی ہے - شاعری انسان کو اُس کی خود پیدا کردہ دنیاوی کثافتوں سے زیادہ حقیقی فطری لطافتوں سے قریب دیکھنا چاہتی ہے - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانی مستقبل شاعر کی نگاہ میں مایوس اور تاریک نہیں ہوتا -

شاعر کے مذہب میں یاس و قنوط کو دخل نہیں - دنیا میں ناکامی کی بدمزگیاں اُسے محسوس ضرور ہوتی ہیں - لیکن وہ اس ناکامی کو اُمید جاودان سے ہم رشتہ کرکے اس کی تلخیاں مٹا دیتا ہے -

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اپنے دائرہ موضوع میں آجانا چاہتا ہوں - ہندوستان کا عہد جدید اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے ہندوستانیوں کے نظریۂ حیات میں تبدیلی ہوئي - یہ تبدیلی دراصل ہندوستان میں برطانوی

ہندوستان کا عہد جدید

استحکام کے بعد پیدا ہوئی ہے - اس عہد جدید کی تعمیر و تاسیس میں مختلف ادارہ ہائے ملک کو دخل ہے - سائنس اور فنون لطیفہ یعنی شاعری ، مصوری اور آرٹ ، اس عہد جدید کے معمار ہیں - یہ معمار مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں ارتقائے ثقافت کی کوشش کرتے رہے ہیں ، ہندی ، بنگالی ، گجراتی اور اردو زبانیں اس عہد کی وہ چند ممتاز و مخصوص زبانیں ہیں جنہیں بقدر وسعت و قوت اثر اپنی اپنی جگہ موجودہ تہذیب و ترقی کا ضامن کہنے میں کسی تردید و تاویل کا خوف نہیں -

تعمیر عہد میں اردو کا حصہ فائق

چونکہ موضوع زیر بحث میں " ادب اردو " عنوان خاص ہے اس لئے میں دوسری زبانوں کا تفصیلی ذکر کرنے سے مجبور - ہوں برطانیہ کے اقتدار فی الہند سے پہلے اردو زبان نہ صرف بن چکی تھی بلکہ ایک حدتک مکمل بھی ہو چکی تھی - لیکن اردو نے جدید نظریۂ زندگی سنہ ۱۸۶۰ع کے بعد قبول کیا ہے - غدر کے بعد اردو کو اپنی اہمیت اور تعمیری پروگرام کا احساس ہوا - اور اس احساس سے سب سے پہلے جو جماعت متاثر ہوئی - " وہ سر سید گروپ " تھا - جس میں بہ اوقات مختلف مولانا شبلی نعمانی ، محسن الملک ، سر سید علیہ الرحمہ ، شمس العلما مولانا نذیر احمد دهلوی ، اور شمس العلما مولانا آزاد جیسے ناثرین اردو - اور شمس العلما خواجہ حالی جیسے ناظم وشاعر کار فرما تھے - رسالۂ زمانہ - تہذیب الاخلاق - اور تیرھویں صدی کے ذریعے جو تعمیری لٹریچر ملک میں پھیلایا گیا اُس نے ثقافت و سیرۃ کی تعمیر ، اور اخلاق و معاشرت کی تہذیب میں بطور خاص حصہ لیا - پھر اسی جماعت کے بعض دوراندیش افراد کی کوششوں سے ہندوستان میں مغربی تعلیم کا ذوق پیدا

ہوا - جسکے نصاب میں وہ تمام سامان موجود تھے جن سے اس نئے عہد کی تعمیر و تاسیس مقصود تھی -

اب ایک طرف تو مغربی سیاست کا نفاذ تھا - اور اُس کے افہام و تفہیم کی کوششیں ' دوسری طرف ہندوستان کی معاشرت وتہذیب کی تعیین کا احساس -

مختلف شعبہ ہائے زندگی اور ادب اردو

جو مغل سلطنت کے زوال اور مغربی حکومت کے خروج نے پیدا کر دیا تھا - چنانچہ ان مختلف شعبہ ہائے تمدن کی ترویج و اشاعت کے لئے اکناف ملک میں مختلف ادارے قائم کئے گئے- جن میں افراد ملک نے بقدر بضاعت وبساط حصہ لیا - مغربی قانون جب ملکی زبان میں ڈھالا گیا تو اردو بہ آسانی اُس کی ترجمانی کرسکی - اور جب معاشرت وتہذیب کی تجویز کا سوال پیدا ہوا تو اردو میں بہترین اخلاقی اور تاریخی مواد فراہم ہوگیا -

مولانا عبدالحلیم شرر ' حکیم محمد علی ' اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصانیف نے ایشیائی مذاق کی گہرائی و پذیرائی میں بڑی دلچسپی پیدا کر دی - اس سے پہلے فسانہ عجائب ' سروش سخن ' چہار درویش ' حاتم طائی ' طلسم ہوشربا ' داستان امیر حمزہ یہ سب قصے اور افسانے ملک کی ماؤف ذہنیت کو جگانے اور آشوب وطن سے ہٹاکر تفریح و نشاط سے آسودہ کرنے کے لئے تصنیف کئے گئے تھے جن میں برطانوی افسروں کی حمایت و اعانت کا ہاتھ تھا - اس لئے کہ اگر اردو کی حمایت کر کے اُسے ملک کی عام دلچسپی کا ذریعہ نہ بنایا جاتا تو مغربی قانون و سیاست کی تفہیم بجائے خود دشوار ہو جاتی - لیکن ملک کا مذاق جس قدر نکھرتا گیا ان داستانوں کی لذت پھیکی پڑتی گئی - اور شرر وغیرہ ترقی یافتہ مصنفین کے ناول زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جانے لگے - جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے عہد جدید کو تاریخ اور درس اخلاق سے بہرہ مند کیا جائے - یہ مقصد بڑی حد تک پورا ہوا -

ھندوستانی شاعر اپنے ملک کے ہر شعبہ حیات سے وابستہ بھی رہا -

شاعر اور ملکی ادارہ ہائے حیات

اور منفرد بھی - شاعر کی انفرادی حیثیت اداروں سے بہت زیادہ وقیع ہے - ادارے ایک مشین کی طرح کام کرتے ہیں - اور انسان مادی قواعد و قوانین کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے - یہ پابندی علی‌العموم مقاصد کی راہ میں دشواریاں پیدا کردیتی ہے - لیکن شاعر اپنی انفرادی حیثیت میں ان تمام رسمی قواعد کو توڑ کر تخئیل کی قوتوں سے اپنا مقصد تنہا حاصل کرتا ہے - اس کا مقصد اجتماعی تہذیب و اصلاح ہوتا ہے - ادارے مخصوص اور ذاتی مقاصد کی تبلیغ و تکمیل کے لئے معرض وجود میں آتے ہیں - لیکن شاعر کا مقصد عالمگیر ہوتا ہے - وہ پیام و درس کے ذریعے ملک کے ہر نشیب و فراز پر حکومت کرتا ہے - سوسائٹی کی روحانی باگ " شاعر " کے مضبوط ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اپنے ملک اور قوم کو جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے - نہ کوئی اس کی زبان روک سکتا ہے ' نہ اس کے قلم کی گرفت کر سکتا ہے - فلسفی اور مورخ ' سیاسی اور مدبر قوم و ملک کو چند محدود مقاصد و اغراض کا سبق دیتے ہیں لیکن شاعر کا راس‌العین مقصد اور نقطۂ نگاہ وسیع ہوتا ہے - میرا مقصد یہ ہے کہ ھندوستانی شاعر نے دور جدید کے تمام اداروں کے استحکام میں حصہ بھی لیا اور اپنی انفرادیت کو بھی قائم رکھا - اور یہی وہ امتیاز تھا جس نے ھندوستانی شاعر کو مختلف ادارہ ہائے کار کے مدبروں سے ممتاز کر دیا -

ھندوستان اور شاعر کا تعلق

ھندوستان اور شاعر کا تعلق ازلی و ابدی ہے - عہد مہابھارت سے بھی پہلے یعنی کئی صدی قبل مسیح ھندوستانی شاعر کا پتہ چلتا ہے - گیتا خود عہد عتیق کے شاعرانہ مذاق کا ایک مقدس ثبوت ہے - رامائن اور مہا بھارت ایک سانس

اور ایک وقت میں لکھی ہوئی کتابیں نہیں ہیں - بلکہ قدیم نسل ہائے انسانی اور روایات و خیالات عہد عتیق کا مجموعہ ہیں - چلند پروائی ' سارنگ دھر ' کبیر ' نانک کو تو عہد متوسط کا شاعر کہنا چاہئے - اسی طرح تلسی داس ' سور داس ' اور کالیداس سولہویں صدی کے شاعر ہیں - میرا خیال یہ ہے کہ جب ہمالیہ کی چوٹیوں پر برف کی پہلی تجلی ہوئی تھی اُس وقت بھی ہندوستان کا شاعر گرم نوا ہوگا - ہندوستان سے شاعر اور شاعری کا تعلق اس قدر قدیم ہے کہ تاریخ بھی صحیح رہنمائی سے عاجز ہے -

ہندوستان کا عروج و زوال اور شاعر

ہندوستان کے موجودہ زوال سے پہلے جو عروج فضاگیر تھا اُسکی پیداوار وہ شاعر تھے جنہوں نے مذہبی اور تاریخی تصانیف سے اپنی قوم اور اپنے ملک میں بلند خیالی اور بیداری پیدا کی - لیکن جب ہندوستان میں زوال کا وقت آیا تو فضا نے ایسے شاعر پیدا کردئے جن میں وصل و ہجر اور کنگھی چوٹی کے سوا کسی دوسرے موضوع مفید کا خیال تک پیدا نہ ہو سکا - ولی سے لے کر داغ و غالب تک تمام شعرا کسی نہ کسی حد تک ایک ہی لکیر کو پیٹتے رہے - خصوصاً دور وسطیٰ اور دور آخر میں جو شعرا پیدا ہوئے اُن کی یکرنگی و عیش آہنگی ہندستان کے زوال کا ایک تاریخی باب ہے - واجد علی شاہی اور محمد علی شاہی شعرا نے جو رنگ رلیاں کی ہیں اُردو شاعری کی تاریخ میں اُن کی مثالیں آج تک ندامت افروز ہیں - لیکن آخر دور میں احساس زوال سے غالب اور مومن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - فلسفۂ حیات داغ و امیر اور جلال کے کلام میں بھی اُبھرتا نظر آتا ہے - مگر زوال کی تاریکی پھر کروٹ بدلوا دیتی ہے - اور زندگی کا چراغ اپنے کو بلند کرنے کے بعد پھر تمتمانے لگتا ہے -

زوال عہد کے بعد شعرا کو جو زوال ہوا ہے یہ اُن کے اسی گناہ کا باعث تھا کہ شعرا خود باعث زوال تھے - ادب اُن کے زوال کا سبب نہ تھا - ادب اپنی تعمیری و اصلاحی قوتوں کے ساتھ بدستور اپنی جگہ پر قائم و باقی تھا - مگر اُس کے غلط استعمال اور ذہنیت کی پستی و جمودآگہنی نے شعرا ' شاعری ' اور عہد ' تینوں کو تباہ کر دیا - آخر دور میں اگر چند شعرا نے جزنئے اور شہر آشوب لکھے تو اُنھیں عہد زوال کے ماتم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے - بیداری کا نغمہ نہیں کہا جاسکتا -

ہندوستان کا جدید شاعر اور اُس کی خصوصیات

ہر جدید تحریک ' ابتداً کمزور ' کم لذت ' اور کم اثر ہوتی ہے - جب ہندوستان میں آشوب وطن کے بعد عہد جدید کی اساس قائم ہوئی تو اُسے مضبوط کرنے کے لئے نئے شاعر بھی پیدا ہوئے - اب سے پہلے تمام ملک عیش و انبساط کے نغمے سننے کا عادی تھا - چاندنی راتوں میں پھولوں کی سیجیں سجانا ' اور دست حنابستہ سے افشردۂ انگور کے جام لینا ہنوز یاد تھا - اس لئے اصلاحی و تعمیری شاعری جرعہ تلخ ثابت ہوئی - جسے منہ بنا بنا کر لوگوں نے پذیرا کیا - مولانا حالی کا وہ مسدس - جسے آج مطلا اور مرصع شائع کرنا فخر سمجھا جاتا ہے قومی محفلوں میں جماہیوں اور کسلمند انگڑائیوں کے ساتھ سنا جاتا تھا - علامۂ نذیر کی نظمیں کانفرنسوں میں وعظ و پند کے خشک جملے سمجھی جاتی تھیں - علامۂ شبلی کی تاریخی اور اخلاقی نظمیں صور اسرافیل سے کم پر خروش ثابت نہ ہوتی تھیں - مگر ان شاعران وطن نے قوم کی تلخکامی کے تصور سے اپنی تلخ نوائی ترک نہیں کی—بلکہ تلخی کو کسی قدر اور بڑھا دیا - نتیجہ یہ ہوا کہ قوم و ملک کا کام و دہن اس تلخی کا عادی ہوگیا - اور مختلف حصص ملک میں شعر و سخن سے

ذوق رکھنے والے صلاحیت پذیر دماغ ' اس طرف متوجہ ہوگئے کہ کس طرح اس تلخی کو شعریت کی عذوبت سے بدلا جاسکتا ہے -

اب تعلیم عام اور ہندوستان گیر تھی - متقدمین و متاخرین کے کلام اور کام پر صحیح تنقید کا رجحان تعلیم یافتہ فرزندان وطن میں پیدا ہو چکا تھا - انہوں نے نقد و نظر سے ان سب کا تجزیہ کیا - ادھر ذوق شعری ماحول اور زمانے کے اثر سے متاثر ہو چکا تھا - چنانچہ بعض شعرا نے اپنی خداداد قابلیت و اہلیت سے ایک نیا مہذب راستہ نکال لیا - جس پر کچھ افراد جماعت گامزن ہوگئے - اور جو آج بھی منزل ارتقا کے لئے جادۂ مستقیم ثابت ہورہا ہے -

شعرائے عصر کی آواز کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تعلیم ہماری زندگی کا جزو ضروری ہے ' جماعتی اتحاد کا سوال پوری قوت سے ذہن آزما ہے - جذبۂ خود داری روز افزوں ترقی پذیر ہے - آزادی کا مطالبہ برابر جاری ہے - عالم نسواں میں بیداری مسلسل ہو رہی ہے - زندگی کا فلسفہ تبدیل ہو چکا ہے - اب زندگی کے معنی سکون نہیں رہے - اب زندگی کا مفہوم جنگ کا مرادف ہے - اور اس جنگ میں شکست کا نام موت ہے -

شعرائے عصر موجود کی نوعی تقسیم

مگر اس وقت بھی تین قسم کے شاعر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں - زوالی ' حالی ' اور استقبالی — زوالی شعرا وہ ہیں جو ہندوستان کے اس عہد زوال میں ہلوز انہیں متقدمین کے پیرو اور مقلد ہیں جو ہندوستان کی مجلسی و اخلاقی اور ثقافتی عظمتوں کے زوال کا باعث ہوئے - جن کی بےنشاطی ' بازاری ' معاملاتی ' اور غیر سنجیدہ شاعری نے ملک کی تمام سوسائٹیوں اور حکومت کے ایوانوں میں عیش پرستی و غفلت مندی کا زہر

پھیلاکر اُن کی قوت عاملہ کو ماؤوف کر دیا تھا - یہ شعرا زبان اور محاورات کی آڑ لے کر اب بھی اُسی شاعری کے مبلغ و موید ھیں - جو انشا اور امانت کے عہد میں زوال مدنیت کا باعث ہوئی تھی - ان کی شاعری سے اب بھی ملک کو نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں - اِن لوگوں نے سوسائٹی کی تفریحی اور نشاطی ذھنیت کا آسرا لے کر رکاکت و ضلالت کے انبار ھرگوشۂ ملک میں جمع کر دئے ھیں - اور حیرت یہ ھے کہ ان کے خرمن گندہ و پراگندہ پر اصلاح و تھذیب کی کوئی چنگاری اب تک اُڑ کر نہیں پہونچی - یہ زوالی شاعر ' عہد موجود کی ترقی کے بعد بھی یاد گار زوال رھینگے - اور تاریخ ھند نفرت و عبرت کے ساتھ بقائے زوال کا ان لوگوں کو ذمہ دار ٹھرائے گی - دوسری قسم حالی شعرا کی ھے - یہ وہ شعرا ھیں جو تعلیم کی برکات سے مستفیض ھو کر اپنی روش افکار بدل چکے ھیں - ان کی شاعری کا معیار بلحاظ جذبات و خیالات بہت بلند ھے - یہ وہ شعرا ھیں جنہوں نے میر و سودا اور غالب و مومن کے اُس حصۂ کلام کی تقلید کی ھے جو فلسفۂ حیات و غم اور فلسفۂ حسن و صداقت پر مبنی ھے - ان کی شاعری سے اگر تھذیب جدید کے ارتفاع کو کوئی داخلی فائدہ نہیں پہونچا تو کوئی نقصان بھی نہیں ھوا - یہ جماعت سوسائٹی کی تعمیر یا تخریب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی - اور اس کا مقصد اقصول صرف تحفظ و ترفیع ادب ھے -

تیسری جماعت استقبالی شعرا کی ھے - گو یہ شعرا معدودے چند ھیں - لیکن انہیں فی الحقیقت ' مستقبل کا شاعر کہا جاسکتا ھے - ھندوستانی ثقافت کی تعمیر و ارتفاع میں ان کا حصہ عملی ھے - ان کی نظموں نے اقوام ملک کو درس بیداری دیا ھے - اور ان کے عالمگیر

پیام بیداری نے ماورائے ہندوستان بھی جگار پیدا کردی ہے - افسوس یہ ہے کہ ان کی مرکزیت کمزور اور ہمنوائی دشوار ہے - زوالی و حالی شعرا اگر ان کے نقوش قدم پر چل کر ان کی تقلید و ہمنوائی کریں تو ہندوستان کا مستقبل آج ہی شروع ہوسکتا ہے - یہ ان حقیقی شعرائے عصر کے نغموں ہی کا اثر ہے کہ آج اقوام ہند میں احساس قومیت بیدار ہے - سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ میں ان کی حدی خوانی نے زندگی پیدا کردی ہے - آزادی اور غلامی میں ان کی بلند بانگی نے امتیاز پیدا کر دیا ہے - اتحاد و افتراق کی علیحدہ علیحدہ خلیجوں کو ان کی فکر ہموار نے پاٹ دیا ہے- مادیت اور روحانیت کے حجابوں کو ان کی آتش نوائی نے چاک کردیا ہے - اور انسانیت و بربریت کا فرق ان کی اسرار کشا نواؤں نے صبح کی روشنی کی طرح آشکار کر دیا ہے -

شاعر اور سیاست

ہندوستان پر اس وقت سیاست غالب ہے - شاعری اور سیاست دومختلف چیزیں ہیں - سیاست ہمیں صرف عمرانی و مدنی انتظام کا درس دیتی ہے لیکن وہ ہماری انسانی اور روحانی قوتوں کو بروئے کار لانے میں معاون نہیں ہوتی - لیکن شاعر کا نظریۂ حیات کچھ اور ہے - جب سیاست اپنا کام ختم کر چکتی ہے تو شاعر کا کام شروع ہوتا ہے- سیاست ایک ہیولیٰ بناتی ہے اور شاعر اُسمیں تناسب وتوازن سے جان ڈالتا ہے - شاعر' تصویر کا روشن پہلو اپنی شاعری میں نمایاں کرتا ہے - وہ ملکی و قومی زندگی کی دشوار گزار منزلوں کی کاروان ملک کو اطلاع دیتا ہے - جس منزل کی جستجو میں قافلے صدیوں بھٹکتے رہے ہیں شاعر اُن منزلوں پر اپنے خیال کی شمعیں روشن کر کے رہروانِ منزل کی رہنمائی کرتا ہے -

انسانیت ، قومیت ، عمرانیت ، اور مدنیت کے لاینحل عقدوں کو اپنے ناخن فکر سے کھولتا ہے - اُن کا حل بتاتا ہے - قوم و ملک کے احساسات کو اُبھارتا ہے - اُنھیں عزم و ہمت اور استقلال و ثبات کا درس دیتا ہے - یہ تمام خدمات آج ملک کے وہ چند شعرا انجام دے رہے ہیں جنھیں میں نے استقبالی شاعر کہا ہے - ہندوستان کے حال و استقبال کی تاریخ ان شعرا کے کار ناموں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی -

جدید فلسفہ زندگی کے ادارے اور شاعر

اس وقت ہندوستان میں جتنے ادارے جدید فلسفہ زندگی اور جدید ثقافت و تہذیب کے حامی ہیں اُن میں ایک ادارہ بھی ایسا نہیں ، جسکا شاعر رکن رکین نہ ہو - ان اداروں کو مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے - ادارہ ہاے تعلیم ، ادارہ ہائے مجلسی ، ادارہ ہائے مذہبی ، ادارہ ہائے مصوری ، ادارہ ہائے موسیقی ، ادارہ ہائے صحافت ، ادارہ ہائے سیاست ، ادارہ ہائے قومی ، ادارہ ہائے اقتصاد ، ادارہ ہائے معاشرت ، یہ تمام ادارے بیک وقت اپنی ارتقائی منزل کی طرف مصروف پرواز ہیں - اور ان تمام اداروں میں شاعر شریک بالعمل ہے - میں ایجاز و اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے اجمالاً عرض کرتا ہوں کہ آج تعلیمی نصاب خواہ کسی صوبے کا ہو بغیر شاعر کے تشنہ تکمیل ہے - کوئی مجلس اور کوئی انجمن ایسی نہیں جسمیں شاعر کسی نہ کسی حیثیت سے شریک کار نہ ہو - کانگریس ، لیگ ، کانفرنسیں ، اکیڈیمی ، غرض کہ ہر ملکی مجلس میں شاعر کی شرکت لازمہ وقت ہے - کوئی مذہبی ادارہ ایسا نہیں جس میں شاعر کے رشحات فکر کی اعانت لازمی نہ ہو - یہاں تک کہ مذہبی تصانیف میں بھی شاعر دخیل ہے - مصوری شاعری کی ہمیشہ محتاج رہی ہے - اور مصور کا مو قلم ہمیشہ

شعر کے نقوش فکر کا تابع رہا ہے - موسیقی کا جزو اعظم شاعری ہے - پہلے شاعری کا درجہ ہے پھر موسیقی کا - صوت ولحن شاعر کے الفاظ پر ڈھلتی ہے - آواز و ساز بغیر الفاظ کے جسم بے روح سمجھے جاتے ہیں - شاعر تصویر کا رنگ اور موسیقی کی زبان ہے - صحافت میں شاعر کا درجہ بتانے کی ضرورت نہیں - صحافت کی گرمی شاعر کے نفس گرم ہی تک ہے - آج تک کوئی ایسا صحافی کامیاب اور مشہور نہیں ہوا جو شاعر نہ ہو - سیاست میں شاعر کا تدبر دیکھنا ہو تو ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزاد کے شذرے اور نظمیں پڑھئے - سیاست کی وہ گتھیاں جو لائڈ جارج اور سر سیموئل ہور سے بدقت سلجھ سکتی ہیں - فکر شاعر بہ یک جنبش قلم اُنہیں سلجھا دیتی ہے - قومی اداروں میں اگر شاعر کا ہاتھ نہ ہو تو احساس قومیت کی پیداوار مشکل ہوجائے - یہ شاعر ہی تھا جس نے جنگ بلقان اور فلسطین کے واقعات سے متاثر ہوکر اقوام ملک کے جمود آگین دلوں میں جوش و حریت کی آگ بھڑکادی - یہ شاعر ہی تھا جسنے جنگ عظیم کے نامساعد دور میں اپنے ملک کو تحفظ و خودداری کا درس دیا - یہ شاعر ہی تھا جس نے زوال خلافت عثمانیہ کے عہد میں ہندوستان کے ذہن کو ہمدردی و جانفروشی کے جذبات سے مشتعل کردیا - یہ شاعر ہی تھا جس نے اپنی صدائے حریت کی قوت سے سنہ ۱۹۳۱ھ میں قصر بکنگم میں زلزلے ڈالدئے - اور یہ شاعر ہی ہے جس کے رسیلے اور شیریں نغمے مہاتما گاندھی کی پراتھنا کو موثر جزو عبادت بنائے ہوئے ہیں - ادارہ ہائے اقتصاد میں شاعر نے وہ حصہ لیا کہ سر مایہ دار کو دن میں تارے نظر آنے لگے - مزدور کو اپنے انسان ہونے کا عرفان شاعر ہی کے قلم سے ہوا - سودیشی اور بدیشی کا مسئلہ شاعر ہی کے نفوس مقدس نے حل کیا - اب رہے ادارہ ہائے معاشرت ' تو موت اور

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو شاعر کا رہین احسان نہ ہو - شادی کی مجلسوں میں سہرا خوانی ، محفل سرود میں نغمہ سرائی ، سنیما اور تھیٹروں میں اثر نمائی ؛ پھر مرنے کے بعد افراد کی قبروں پر کتبہ نویسی کس کا کام ہے - صرف شاعر کا ! آغا حشر کے ڈراموں نے ، سدرشن اور پریم چند کے فسانوں نے سماج کی تہذیب و اصلاح میں کیا کچھ کم حصہ لیا ہے ؟ غرض یہ کہ جدید فلسفۂ زندگی کے پھیلاؤ اور ترویج و تبلیغ میں سب سے اہم حصہ شاعر عصر کا ہے - اور آج ہندوستان میں ترقی وترفع کے جو آثار نظر آرہے ہیں وہ بڑی حد تک شاعر کی نبض شناسی کے منت پذیر ہیں -

شعرا کی خاموش تبلیغ

آج ملک کے مختلف گوشوں سے جو رسائل و اخبارات شائع ہو رہے ہیں ، کیا یہ شعرا کے خاموش کارنامے نہیں ؟ ان کی نظمیں اور ان کے مضامین کیا خاموشی کے ساتھ زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں پر تنقید کر کے آج ہندوستان کو گذشتہ رفعت و عظمت کی دعوت نہیں دے رہے ہیں ؟ کیا ہندوستانی ثقافت کو مختلف نوعیات و حیثیات سے معارف ، اردو ، نگار ، زمانہ ، ہندوستانی ، ہمایوں ، ادبی دنیا ، شاہ کار......زمیندار ، مدینہ وغیرہ مولفت الشیوع رسائل و اخبارات نے بلند نہیں کیا ہے - اور کیا ان میں کوئی ایک جریدہ بھی ایسا ہے جس میں کسی شاعر کا ہاتھ نہ ہو -

ادب اردو اور شاعر

شاعر اور ادب اردو ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں ؛ اس لئے جو کام شاعر نے کئے ہیں وہ در اصل ادب اردو کے کام ہیں - ادب اردو نے جو عالمگیر اثرات پیدا کر دئے ہیں وہی موجودہ ہندوستانی ثقافت کے اجزائے تعمیر ہیں اور اس جہت سے ''اردو'' آج مختلف اقوام ہند کے درمیان یگانگت و اتحاد

کا واحد ذریعہ بنی ہوئی ہے - اردو زندگی کے ہمہ گیر عنوانات پر حاوی ہے - اور ادب اردو ان عنوانوں میں رنگ بھر کر انہیں درخشاں اور دلنشین بنا رہا ہے -

خاتمہ

میں یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے اتنا اور عرض کردوں کہ اردو کے ذریعے خیالات کی توسیع و اشاعت کے لئے ملک میں متعدد ادارے قائم ہیں - مثلاً دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ' دارالمصنفین اعظم گڈھ ' ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ' اور مختلف صوبوں کی تمام انجمنیں جو مختلف عنوانوں سے ہندوستان میں قائم ہیں اردو کی توشیع و توسیع میں حصہ لے رہی ہیں - اور ان اداروں سے اردو کے چشمے نکلکر ملک کے اخلاقی ' مجلسی ' مذہبی ' ادبی ' سیاسی ' اقتصادی ' معاشرتی ' اور تعلیمی میدانوں کی آبیاری کر رہے ہیں - میں نہیں کہتا کہ دوسری زبانوں کے لٹریچر نے تہذیب حاضر کی شگفتہ کاری میں اعانت نہیں کی - ضرور کی - لیکن ادب اردو کو جو اہمیت مشترکہ ملکی زبان ہونے کی وجہ سے حاصل ہے وہ اس کا حق فائق ہے - اور بالآخر ہمیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ اردو موجودہ ثقافت کی تہذیب ہی کے لئے پیدا ہوئی تھی - اگر اردو زبان کی تخلیق سولہویں صدی عیسوی میں نہ ہو چکی ہوتی تو ہندوستانی ثقافت کی تہذیب و ترقی ابھی صدیوں شرمندۂ تعبیر رہتی - بے شک ہندی ' بنگالی ' اور گجراتی نے تخلیقی اور عاریتی لٹریچر سے ملک میں سماجی زندگی کو فروغ دیا ہے - لیکن ان زبانوں کے کارنامے محدود ہیں - اور ملک کی مشترکہ ذہنیت ان سے کچھ زیادہ مستفیض نہیں ہو سکی ہے - لیکن اردو زبان اور اردو ادب نے اپنی برکات سے سورج کی کرنوں ' مینہ کی پھواروں ' چاند کی روشنی ' اور

پھولوں کي خوشبو کی طرح تمام سواد ھند کو فیضیاب کیا ھے - اور اردو موجودہ ھندوستانی ثقافت ' یا تہذیب ' یا تمدن ' " اردو ادب " سے زیادہ کسی دوسری زبان کے ادب کا ممنون فیض نہیں ھے -

حالی مرحوم نے ھندوستان کے گذشتہ و رفتہ عظمتوں کو یاد دلاکر ھندوستان کی ماؤف رگ حمیت میں نشتر زنی کر دي ھے - اقبال نے حال پر تبصرۃ کر کے مستقبل کے لئے بکثرت پیغام دے دئے ھیں - اکبر الہ‌آبادي مرحوم نے تمدن ' معاشرت ' اخلاقیات اور سوسائٹي کی خرابیوں پر کیسی میٹھی تنقید کی ھے - الغرض ھماری تعلیم ' ھماری خود داری ' ھمارا اتحاد ' ھماری قومیت ' ھماری وطنیت ' ھماری بیداری ' آزادي کی طلب ' منزل رسی کي تڑپ ' اور ھمارے تمام ذھنی انقلابات بڑی حد تک ھمارے شعرا ھی کے پیدا کردہ ھیں - دفتری اصلاحی فرمانوں کا نتیجہ نہیں - یہ سلسلہ جاری تھا ' جاری ھے ' اور انشاالله تعالیٰ جاری رھے گا -

ملک الشعرا بہاری لال

کے

(ہندی دوہوں میں عجمی تراکیب و تشبیہات)

بہاری لال کو ہندی کا ملک الشعرا کہا جاتا ہے ' ہندی شـ
کے نورتنوں میں وہ امتیاز کے ساتھ شریک ہے ' اگرچہ اس کا مجموعۂ
صرف ۷ سو اشعار پر مشتمل ہے جسے " بہاری ست سئی" کے نـ
ترتیب دیا گیا ہے ' اتنے کم شعر کہنے پر بھی ہندی ـ
میں وہ مرتبہ بہت کم شعرا کو حاصل ہوسکا جو بہاری لال کے
مخصوص ہے -

بہاری اپنے تغزل اور شعریت لطیف کے اعتبار سے بھاشا کا
شاعر ہے اس صنف میں اس کے دوہے کہیں کہیں حافظ و عرفـ
سحر طراز تخیلات سے ہمدوش نظر آتے ہیں - بعض مقامات پـ
اس کی رنگینی و سرمستی اس قدر بے پناہ ہوگئی ہے کہ شعر و ا
کی لطافتیں بھی اس کا ساتھ دینے سے معذور ہیں -

بہاری سنہ ۱۶۰۳ع کے قریب گوالیار کے پاس ایک گاؤں ـ
گوبند پور میں پیدا ہوا ' اسی خطے میں بچپن کا زمانہ گزرا ' شـ
آیا تو متھرا میں شادی رچائی' اور پھر وہیں کا ہو رہا -

متھرا ' عہد قدیم سے حسن و عشق کا گہوارہ رہا ہے اس
دامن میں ہمیشہ شعر و موسیقی کے چشمے مچلتے رہے ہیں - پھر

زمانہ تو اس کے لئے ایک " شہاب نو " سے کم نہ تھا - جہانگیر اور نورجہاں کے مظاہر محبت نے شیام اور رادھا کی یاد دلوں میں تازہ کر دی تھی - " کرشن نگری " متھرا ان عشق پرور ایام میں کس قدر دل نواز ہوگا اس کا دھندلا سا تصور بھی آغوش خیال کے لئے متاع عزیز ہوسکتا ہے -

مشیت کا حسن نظر ملاحظہ ہو ' بہاری کو شریک زندگی بھی ملی تو متھرا باشی - گوالیار کے شاعر مدھوش کے جذبات ومحسوسات یوں ہی کیا کم سرور انگیز تھے ' اس نسبت جمیل نے شراب احساسات کو دوآتشہ بنا دیا -

ہندوستانی فنون لطیفہ کی تاریخ میں شہنشاہ نورالدین جہانگیر کا زمانہ بجا طور پر عہد زریں کہا جاتا ہے ' مغلوں اور راجپوتوں کے تعلقات مجلسی و معاشرتی حدود سے آگے بڑھکر ایک ایسے عظیم‌الشان تمدن کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو رہے تھے جس کی تخلیق نے مشرق کی دو بڑی قوموں کی ذہنیت میں ایک خوش گوار انقلاب پیدا کر دیا تھا -

بہاری کی شاعری بھی اسی اخلاص آفریں ماحول کی پیداوار ہے ' اس مختصر سے مضمون میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ بہاری کے وہ دوہے جو برج بھاشا کی شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہاں تک عجمی تشبیہات و تراکیب سے مزین ہیں -

بہاری "ست سئی" کا موجودہ نسخہ " اعظم شاہی سنسکرن " کہلاتا ہے ' یہ سلطان اورنگ‌زیب کے لخت جگر شاہزادہ اعظم شاہ کی نگرانی میں ترتیب دیا گیا تھا -

اعظم شاہ بہاری کے ذوق شعریت کے حد درجہ معترف تھے ' دیوکوی جو ہندی شاعری کے ایک رتن ہیں اپنی تصنیف " بھاؤ ولاس " میں لکھتے ہیں -

दिल्ली पतिऔरंग के, आजमसाहि सपूत ।
सुन्यो सराह्यो ग्रंथ यह, अष्ट जाम संजूत ॥

دلی پتی اورنگ کے اعظم ساہ سپوت
سنیو سراھیو گرنتھ یہ اشٹ جام سنجوت

یعنی ' شہر یار دھلی اورنگ زیب کے خلف‌الرشید اعظم شاہ اس " صحیفۂ شعریت " کو آٹھوں پہر سنتے اور تعریف کیا کرتے تھے -

حسن اتفاق دیکھئے کہ جس طرح " ستسئی " کی ترتیب کا سہرا مغل اعظم کے دودمان عالی کے سر چڑھا ہے اسی طرح ستسئی کے بہترین شرح کار بھی ایک مسلمان نواب انور خاں ہیں - جن کی بلند پایہ تصنیف " انور چندرکا " اپنی عظمت امتیاز کے لئے ' کسی دلیل کی محتاج نہیں - ستسئی کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں - جن‌میں امر چندرکا—پرتاب چندرکا——رس چندرکا——بہاری‌دھار—— ہری پرکاش——اور " کرشن کوی کی ٹیکا " بہت مشہور ہیں ان میں سے " رس چندرکا " بھی ایک مسلمان ہندی شاعر نواب عیسی خاں کی تصنیف ہے - ان سب شرحوں میں انور چندرکا کا مقام سب سے افضل ہے ' اور دور حاضر کے ہندی شاعروں ' ادیبوں ' اور مصنفوں کا یہی عقیدہ ہے - اس مختصر سے تعارف کے بعد ' اصل موضوع کا آغاز کرتے ہوئے وہ دوہے پیش کئے جاتے ہیں ' جن کا صوری و معنوی جمال فارسی تراکیب و تشبیہات کی حسن کار رنگ آمیزیوں کا ممنون ہے -

قبلہ نما

بہاری کا ایک مشہور دوہا ہے -

सबही तन समुहाति छन, चलति सबनि दै पीठि ।
वाही तन ठहराति यह, किबलनुमा लौं दीठि ॥
बि० स० ५६

سب ہی تن سموھتی چھن چلت سبنی دے پیٹھ،
واھی تن ٹھہراتی یہ قبل نما لوں دیٹھ
بہاری ستسئی دوہا نمبر ۵۶

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا :—

(ہجوم دلدادگان میں) —— وہ (ناظورۂ معصوم)
ذرا دیر کے لئے سب کے سامنے ہوتی ہے ' پھر سب کی
طرف سے منہ پھیر لیتی ہے قبلہ نما (کی سوئی) کی
طرح (اس کی نگاہ) اپنے پیارے ہی تک پہونچ کر
ٹھہرتی ہے -

کسقدر ' لطیف تخئیل ہے' دلدادگان ناز کی محفل آراستہ ہے - ہر دلفروش محبوبۂ دلنواز کے انتظار میں ہے ' وہ آتی ہے ' اور لمحہ بھر کے لئے سب کو دیکھتی ہے' پھر نظر اُچٹتی ہے' رخ بدل جاتا ہے' بے اختیار نگاہ وہیں جاکر ٹھہرتی ہے' جہاں حبیب لبیب بیٹھا ہے ' قبلہ نما کی سوئی کو چاہے جس طرف گھما دیا جائے ' ٹھہرے گی قبلہ ہی کی طرف آکر -

اسی تخئیل کو ہندی کے دوسرے شعرا نے بھی نظم کیا ہے مگر چونکہ وہ " قبلہ نما " کی سی بہترین تشبیہ کا استعمال نہیں کرسکے ' اس لئے اُن کے اشعار کی طرف کسی کی نگاہ بھی نہیں اٹھتی ' اور اٹھتی

.ہی ہے تو اچٹ کر بہاری کے دوہے پر ہی پہونچتی ہے ' اس نے "قبلہ نما" کی معنویت کا کتنا دلکش استعمال کیا ہے - اس کا اعتراف مذاق سلیم خود ہی کرسکے گا -

فوج ہراول

जुरे दुहुन के दृग झमकि, रुके न झीने चीर।
हलकी फौज हरौल ज्यों, परत गोल पर भीर॥
बि० स० ६१

جڑے دھن کے درگ جھمک رکے نہ جھینے چیر
ہلکی فوج ہرول جیوں پرت گول پر بھیر
بہاری ست سئی دوہا نمبر ۹۱

لفظی ترجمہ :—

دونوں کی (تشنۂ نظارہ) آنکھیں جھپٹ کر آپس میں متصادم ہوگئیں—باریک نقاب میں نہ رک سکیں- جس طرح فوج ہراول مختصر ہونے کے باوجود مقابل فوج کے قلب پر جاپڑتی ہے -

کیا لطیف مصوری ہے - محبوبہ ناز آفرید ' باریک نقاب میں منہ چھپائے ہوئے اپنے دلدادۂ عشق کو دیکھتی ہے ' جو اُس کی طرف پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہا ہے ' نگاہ‌ناز بے اختیار اُٹھ کلیم کی نگاہوں سے متصادم ہو جاتی ہے ' ہلکا اور باریک سا نقاب اس تصادم کو کیا روک سکتا تھا ' فوج ہراول کو کتنا ہی روکا جائے ' وہ تو مقابل کے قلب پر ہی پڑے گی -

تخئیل میں ندرت و لطافت بڑی حد تک شامل ہے ' مگر پہلی بھی وہی کیفیت ہے ' بہاری کی یہ کامیابی "فوج ہراول" کے بل بوتے پر

هے ' یہ ٹکرا دوھے سے الگ کرلیا جائے تو دوھے کا سب زور و شور ختم ہو جاتا ہے -

گرہ باز کبوتر

ऊँचे चितै सराहियत, गिरत कबूतर लेत।
दृग झलकित मुलकित बदन, तन पुलकित केहि हेत॥
बि० स० ७३

اونچے چتے سراھیت گرہ کبوتر لیت
درگ جھلکت ملکت بدن تن پلکت کہي ھیت
بہاری ست سئي دوھا نمبر ۷۳

لفظی ترجمہ :—

کبوتر کو بلند پرواز اور گرہبازی کرتے دیکھکر سبھی تعریف کرتے ھیں ' (مگر اے سکھی !) تیری آنکھیں (فرط نشاط سے) ڈبڈبا رھی ھیں - رخ پر مسرت کی جھلک ہے اور جسم (کسی کیفیت پنہاں سے) پسینے پسینے ہو رہا ہے ' یہ کسلئے ؟

دلدادۂ محبت نے ' اٹاري سے اپنا گرہ باز کبوتر اڑایا ہے ' محبوبۂ وفادار کبوتر کو دیکھنے کے بہانے سے اپنے دل آرام کو دیکھہ رھی ہے ' نشاط نظارہ نے آنکھوں میں مد ہوشی ' عارض پر رنگ مسرت ' پیدا کر دیا ہے صہباے دیدار کی مستی آتشیں نے جسم کو پسینے پسینے کردیا ہے - ایک سہیلی پوچھتی ہے ' —— سکھی ! کبوتر کی گرہ بازیاں دیکھہ کر سبھی تعریف کیا کرتے ھیں ' مگر تیرے جیسا حال تو کسی کا نہیں ہوجاتا - شاید اس طرح وہ اپنی سکھی کو یہ بتانا چاھتی ہے کہ سکھی ہوشیار میں تیری بات سمجھہ گئی ہوں - کبوتر کی شوخیوں کے پردے میں تو کبوتر والے کو دیکھہ دیکھہ کر کھلی جا رھی ہے -

اس تخئیل کی شوخی و دلکشی کا سب افسانہ ' گرہ باز کبوتر کی شوخیوں سے مرتب ہوا ہے - —— یہ شرارت ختم کر دی جائے ' تو سب کہانی خواب ہو کر رہجاتی ہے -

پاانداز

मानहु बिधि तन अच्छ छबि, स्वच्छ राखिबे काज।
दृगपग पोंछन को किये, भूषन पायन्दाज ॥
बि० स० ५९५

مانہو بدھی تن اچھہ چھبی سوچھہ راکھوبے کاج
درگ پگ پوچھن کو کئے بھوشن پایندا ج
بہاری ست سئی دوہا نمبر ۵۱۵

اس کے جسد اطہر و لطیف کی پاکیزگی و لطافت قائم رکھنے کے لئے گویا ' زیورات ' پائے نگاہ پونچھنے کے لئے پا انداز بنگئے ہیں -

یہ دوہا بہاری کی پرواز تخئیل کا تنہا آئنہ دار ہے - نقادان فن کا اتفاق ہے کہ تمام ست سئی میں اس دوہے کی نظیر مشکل سے نکلے گی - هندی شاعری میں تو اس کا جواب ہی نہیں - سچ تو یہ ہے کہ دوہا ہے بھی بے نیاز ستائش ' واہ کیا لطافت خیال ہے ' زیورات کی عظمت اس نسبت عجیب نے کس قدر بڑھا دی ہے ' پائے نگاہ پونچھنے کے لئے پا انداز —— گویا ' نگاہ اس کے کعبہ رخ کے طواف کے لئے بڑھے تو پہلے زیورات کے پا انداز سے اپنے پاؤں پونچھہ لے -

دوہے کے دلپذیر اثرات اعجاز سے کم نہیں - مگر یہ سب اعجاز پاانداز کے دم قدم تک ہے ' یہ لفظ نکال لیا جائے تو دوہے کی محفل ہی درهم و برهم ہوتی جاتی ہے -

تافتہ رنگ

छुटी न सिसुता की झलक, झलक्यो जोबन अंग।
दीपति देह दुहून मिल, दिपति ताफता रंग॥
बि० स० १७

چھٹی نہ سسوتا کی جھلک جھلکیو جوبن انگ
ویپت دیہہ دھن مل - دیپت تافتہ رنگ
بہاری ست سئی دوھا نمبر ۱۷

لفظی ترجمہ :—

بچپن کی جھلک ابھی نہیں گئی ہے - رنگ شباب بھی
جھلکنے لگا ہے ' دونوں کے ملنے سے (اس محبوبہ نوخیز کا)
جسم رخشِ تافتہ رنگ (دھوپ چھاؤں) کی طرح درخشاں
ہو رہا ہے -

بہاری نے اس دوہے میں حسن خیال و لطافت بیان کی ساز کاری سے اپنے حسن تصور کو بہترین رنگ میں پیش کیا ہے - محبوبۂ نوخیز کا بچپن ابھی پورے طور پر رخصت نہیں ہوا ہے ' عہد طفلی کا ماہتاب جاتے جاتے اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے - ادھر شباب کی آمد آمد کے آثار ہیں - خورشید جوانی کی شعاعیں پھوٹنے لگی ہیں دونوں کے اتصال جمیل نے اُس کے جسم رعنا کو رخشِ تافتہ رنگ کی طرح درخشاں کر دیا ہے - تافتہ رنگ ایک کپڑا ہوتا ہے - جس میں گنگا جمنی تانے بانے ہوتے ہیں - دونوں کے (امتزاج) سے درخشانی پیدا ہوتی ہے - اس کپڑے کو دھوپ چھاؤں کہتے ہیں - طفلی و شباب کے دلاویز امتزاج کی اس سے زیادہ مکمل اور کشش انگیز تصویر شاید ہی کھنچ سکے -

یہہ حقیقت محتاج اشارہ نہیں کہ یہہ دوہا بھی "رخت تافتہ رنگ" ہی کے غرور پر اپنے حسن و کشش کا مدعی ہے - یہ نہ ہو تو پھر دھوپ ہے نہ چھاؤں' —— بس ایک معمولی سی بات رہجاتی ہے -

شبیہ

लिखन बैठि जाकी सबिह, गहि गहि गरब गरूर ।
भये न केते जगत के, चतुर चितेरे कूर ॥
बि० स० ५३४

لکھن بیٹھے جا کی شبیہہ گہ گہ گرب گرور
بھلے' نہ کیتے جگت کے چتر چتھیرے کور

اس دوہے میں شبیہہ کے علاوہ اور بھی عربی و فارسی الفاظ ہیں -

گہ گہ' (گاہ بگاہ) .

گرور' غرور

لفظی ترجمہ :—

اُس (محبوب) کی شبیہہ کھینچنے کے لئے ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار دنیا کے کامل ترین مصوروں نے کوشش کی مگر ہر بار بیوقوف بن کر رہگئے (حتیٰ کہ یہہ بھی معلوم نہ کر سکے کہ نا کام رہنے کا باعث کیا ہے) -

بعض شرح نویس اس دوہے کو محفل مجاز سے اٹھا کر خلوت حقیقت تک لیگئے ہیں' ممکن ہے' دوہا اپنی مجازیت کے اعتبار سے اُن کے لئے کچھہ زیادہ کشش نہ رکھتا ہو' اس خوش فہمی کے کیلئے انہیں اختیار ہے' مگر مصور ازل کی تصویر کھینچنے کا خیال ہی کس دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے ؟ وہاں تو عرفان و ادراک کا ملتہا " ماعرفنا "

کے سوا کچھہ بھی نہیں - پھر خدائے برحق نے اپنے بہت سے بندوں کو بھی تو اس حد تک بدیع الجمال بنایا ھے کہ اُن کے متعلق '

کلک نقاش کشد حسرت تصویرش را

کہکر ھی " حق عرفاں " ادا ھو سکتا ھے -

بہاری کا دوھا ' بظاھر کسی اھمیت سے خالی نظر آتا ھے ' وہ یہہ نہیں بتاتا کہ آخر منتخب روزگار مصوروں کی نا کامی کا باعث کیا ھے - لیکن حقیقت یہ ھے کہ یہہ " پردہ داری " ھی دوھے کا سب سے بڑا حسن ھے - شاعر صرف یہی تو کہنا چاھتا ھے کہ دنیا بھر کے مصور تصویر کھینچنے میں کامیاب تو کیا ھوتے ' وہ تو یہ بھی نہ جان سکے کہ ھر بار تصویر کھینچنے میں کیوں نا کام رھتے ھیں - بہاری مصوروں کے جہل و لا علمی پر کیسا لطیف طنز کستا ھے ' یہ لکھکر کہ ان بیوقوفوں کو اپنی نا کامی کا سبب بھی معلوم نہ ھو سکا -

دوھے میں جس بلند تخئیل کو ملفوظ کیا گیا ھے وہ بڑی حد تک لفظ " شبیہہ " سے وابستہ ھے ' تمام صداقت اسی " شبیہہ " میں کھنچ کر رہ گئی ھے -

هندی اور سنسکرت میں اس مفہوم کے لئے بہت سے لفظ ھوں گے ' مگر شاید اُن میں وہ وسعت نہ ھو جو شبیہہ میں نظر آتی ھے ' نقش و تصویر تو صرف ظاھری صورت نگاری تک محدود رھتے ھیں - مگر شبیہہ پر مظہر اتم ھونے کا اطلاق ھو سکتا ھے -

منھہ زور

लाज लगाम न मानहिं, नैना मो बस नाहिं ।
ये मुँहजोर तुरंग लौं, ऐंचतहू चलि जाहिं ॥

बि० स० २६९

لگے لگام نہ مانہیں نینا موبس ناہیں
یہ منہہ جور ترنگ لوں اینچت ہو چلی جاہیں

بہاری ست سئی دوہا نمبر ۲۶۹

لفظی ترجمہ :—

(ایک وارفتۂ دید کہتی ہے) آنکھیں میرے بس میں نہیں - حیا و شرم کی لگام انہیں روکنے سے مجبور ہے - یہ تو منہہ زور گھوڑے کی طرح کھینچتی ہی چلی جا رہی ہیں -

محبوبۂ حیا افروز کو نظارہ محبوب کا موقع اتفاقاً مل گیا ہے - اب شرم و حیا کا تقاضا نگاہوں کو اس طرف دوڑنے سے روک رہا ہے ' مگر نگاہیں ہیں کہ منہہ زور گھوڑے کی طرح لگام کی پروا کئے بغیر ' برابر اس طرف کھنچی چلی جا رہی ہیں -

کیسی دل دوز مصوری ہے کسی کے جنوں نظارہ کی - نہ دیکھنے والوں کی شرم ہے ' نہ نسائیت کا پاس ہے - نہ قیود اخلاق کی پروا ' بس وہ ہیں اور اُن کا نظارہ ' فطری شرم و حیا ' ہزار اندیشوں کا واسطہ دیکر نگاہوں کو روکنا چاہتی ہے ' مگر منہ زور گھوڑا لگام کی پروا ہی کب کرتا ہے -

بہت ہی پیاری تشبیہ ہے ' مگر یہاں بھی کم بخت " منہ زور " اپنے زور شور پر اتراتا ہوا نظر آتا ہے -

فانوس

बाल छबीली तियन मैं, बैठी आप छिपाय ।
अरगट ही फ़ानूस सी, परगट होति लखाय ॥
बि० स० ५२४

بال چھبیلی تین میں بیٹھی آپو چھپائے
ارگٹ ہی فانوس سی پرگٹ ہوت لکھائے

بہاری ست سئی دوہا نمبر ۵۲۴

لفظی ترجمہ :—

خواتین کے مجمع میں وہ دوشیزۂ ناز آفرین ہر چند اپنے کو چھپائے ہوئے بیٹھی ہے - لیکن پھر بھی سب سے الگ فانوس کی طرح درخشاں نظر آتی ہے -

کسی تقریب نشاط میں محلے کی عورتیں جمع ہیں - ایک دوشیزۂ نازنین بھی شریک ہے - بڑی بوڑھیاں اُسے سب کے بیچ میں بٹھا دیتی ہیں - وہ خود شرم و حیا کی گود میں سمٹی ہوئی سی بیٹھی ہے - مگر "فروغ روے آتشیں" کہیں چھپانے سے چھپتا ہے - اتنے هجوم میں بھی وہ فانوس کی طرح درخشاں نظر آتی ہے -

بہاری نے معصوم دوشیزہ کو فانوس سے تشبیہ دے کر اپنے کمال شعریت کا ثبوت پیش کیا ہے - اس نے شرم و حیا کو پردۂ فانوس اور دوشیزہ کو شمع سے تعبیر کیا ہے - —— حجاب دوشیزگی سے شمع جمال کا فروغ کچھ اور بڑھجاتا ہے ' یہ حقیقت اس دوہے سے بہ حسن و خوبی واضح ہو رہی ہے -

تنویر جمال کی یہ کائنات صرف "فانوس" کے حسن تزئین کی رهین منت ہے ' یہ نہ ہو تو خانۂ بے چراغ کا عالم نظر آئے گا -

ان دل‌نشین تراکیب و تشبیہات کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا ' کسی دوسرے موقع پر اس موضوع پر اس سے بھی زیادہ دلچسپ تفصیلات پیش ہو سکیں گی -

اس مختصر سے مضمون سے ملک‌الشعرا بہاری لال کی شعریت لطیف کا وہ رخ اهل نظر کے سامنے آجائے گا جسے فارسی زبان و ادب کے غازے نے جنت نگاہ و خیال بنایا - مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اسی خصوصیت و امتیاز کی بدولت بہاری اپنے زمانہ کا تنہا هندی شاعر تھا -

تبصرے

عربوں کی جہاز رانی

(از سید سلیمان ندوی صاحب - اسلامک ریسرچ ایسوسی‌ایشن)

بمبئی کا سلسہ ۵ -

اس رسالہ میں اِن چار خطبوں کو جمع کیا گیا ہے جو بمبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی سر پرستی میں سنہ ۱۹۳۱ع میں دیے گئے تھے - ابتدا میں عربی لغات ' زمانہ جاہلیت کے اشعار اور قرآن‌شریف کی آیتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عربوں کو جہاز رانی سے قدرتی شغف تھا اور انہیں جہاز رانی کے متعلقات سے کافی واقفیت تھی - اس کے بعد اسلامی دور کی ابتداء سے عہد عباسیہ اور عہد فاطمیہ تک کے عربوں کے بحری کارناموں پر اجمالی نظر ڈالی ہے - پھر ان کے تجربات کے متعلق علمی تحقیقات کا تذکرہ کیا ہے اور اخیر میں جہاز رانی کے آلات ' جہاز سازی کے فن اور جہازوں کے عملہ اور افسروں کے متعلق معلومات بہم پہونچائی ہیں - غرض اس دو سو صفحوں کی مختصر کتاب میں بہت سا دلچسپ مواد اکٹھا کر دیا ہے -

عربوں کے بحری سفروں کی تاریخ اس قدر پرانی ہے کہ اس کا آغاز تاریخ کی آنکھوں سے بھی اوجھل ہے - علم‌الانسان کے ماہر یہ بتلاتے ہیں کہ کسی بعید زمانہ میں مصر اور عرب کے جہاز راں بحر ہند اور اس سے ملے ہوے سمندروں کا دورہ کیا کرتے تھے اور اسلام کے بہت پہلے سے

عربوں نے ہندوستان اور دیگر ممالک میں اپنی بستیاں بسائی تھیں - ظاہر ہے کہ عرب فن جہاز رانی اور مشرقی ممالک کے جغرافیہ سے عرصہ دراز سے آشنا تھے - ان کی معلومات سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو پہونچتی رہتی تھیں - جب اسلام کا طلوع ہوا تو عربوں کی زندگی میں انقلاب پیدا ہوا اور ان کی بحری تاریخ نے نیا ورق پلٹا - اس تاریخ کی مجمل کیفیت مولانا سید سلیمان ندوی کے خطبوں میں موجود ہے - یہاں پر اس کارنامے کی کچھ اہم باتوں کی جانب توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے - پہلی بات تو یہ ہے کہ واسکو ڈے گاما سے بہت پہلے عربوں کو یہ معلوم تھا کہ اسپین سے بحری راستہ افریقہ کے مغربی ساحل سے ہوتے ہوے جنوب کو مڑتا ہے اور وہاں سے بحر ہند میں پہونچا دیتا ہے - اور واقعہ تو یہ ہے کہ افریقہ کے مشرقی ساحل سے ہندوستان تک پہونچانے کا سہرا احمد بن ماجد کے سر ہے نہ کہ واسکو ڈے گاما کے - اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ عربوں نے یہ بھی دریافت کر لیا تھا کہ جو راستہ بحر ہند سے بحر چین اور وہاں سے شمالی بحرالکاہل کو جاتا ہے وہی آبنائے برنگ (Behring) میں سے گذر کر آرکٹک میں پہونچا دیتا ہے اور آرکٹک سے اوقیانوس میں اور وہاں سے طارق کے ذریعہ بحیرہ روم کو چلا جاتا ہے - ان معلومات کی بناء پر وہ اس نتیجہ پر پہونچ گئے تھے کہ سمندر الگ الگ نہیں ہیں بلکہ "پانی کا ایک ہی عظیم الشان دائرہ ہے جو ان سب ملکوں کو محیط ہے " -

نہر سویز کا تخیل بھی سب سے پہلے انہیں کے ذہن میں آیا - عمرو بن عاص کی خواہش تھی کے بحر روم اور بحر احمر کے بیچ کی زمین کو کاٹ کر سمندروں کو ملا دے لیکن خلیفہ عمر نے اس تجویز کو رد کر دیا - گو نہر سویز تو نہ بن سکی مگر دریاے نیل سے ایک نہر ۶۹ میل

لمبی نکالی جس کے ذریعہ کشتیاں نیل سے بحر احمر میں جاتی تھی -

علمی کارناموں میں قطب نما کا استعمال بھی جسے یورپ والوں نے عربوں سے سیکھا قابل ذکر ہے - گو عرب اس کے موجد نہیں تھے لیکن مقناطیسی سوئی سے جو کام انھوں نے لیا وہ اس کے موجدوں نے بھی نہیں لیا - انھوں نے ایسے قطب نما بنائے جن پر سمتوں کے دوائر اور قیاسات بنے ہوتے تھے -

عربوں کی بحری فتوحات اور بحری اقتدار کی تاریخ بمنزلہ ایک ایپک کے ہے جس کا تصور ہر ایشیائی کے دل کو گدگدا دیتا ہے - لیکن ابھی وہ نقاش نہیں پیدا ہوا جو اس تصویر میں رنگ بھر کے دکھلادے - مولانا سید سلیمان کی تصنیف ایک خاکہ پیش کرتی ہے - لیکن افسوس پیاس کہاں بجھہ سکتی ہے - ضرورت ہے کہ کوئی مصنف موضوع کی عظمت کے شایان شان کتاب تصنیف کر دے -

جس وقت یہ کتاب لکھی جائے تو کچھہ امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے - پہلے توجہاں تک لسانی تو جیہات ہیں ان کو پورا کرنا ضروری ہے - ایک ہندوستانی ادارہ ہرگز قابل معافی نہیں اگر وہ ہندوستانی الفاظ کی صحیح تحقیق نہ پیش کر سکے - مثلاً صفحہ ۱۸ اور ۱۹ پر جو ہندی کے الفاظ دیے گئے ہیں ان کی تحقیق تشفی بخش نہیں - صفحہ ۱۹ پر لکھا ہے " ساحل کے معنی میں ایک اور نیا لفظ پار شاید سنسکرت یا فارسی سے آیا ہے " - یہ شاید کیوں ؟ پار سنسکرت نہیں ہے - سنسکرت لفظ واتک سے بگڑ کر واز بنا اور اس سے پار - غراب کے اشتقاق کے بارہ میں بھی غلط فہمی ہے اور لاطینی یونانی اور یوروپی الفاظ بھی زیادہ تحقیق چاہتے ہیں -

واقعات کے بارہ میں بھی ملکی تاریخوں سے مدد لینے کی ضرورت ہے - صفحہ ۶۳ پر حبیب بن مرہ کا اجین پر قابض ہونا اور گجرات کا فتح کرنا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا ہے -

صفحہ ۷۲ پر سمندر ہرکند بحر ہند کا مترادف ہو سکتا ہے مگر خلیج بنگالہ زیادہ صحیح ہے -

شلاھط سے کیا مراد تھی یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا - ابن خوردادبہ نے جاوا کے بعد شلاھط جزیرہ کا نام دیا ہے - ادریسی اس کی تائید میں کہتا ہے کہ جاوا سے شلاھط کا فاصلہ قریب دو فرسنگ کے ہے - مگر سلیمان اور یعقوبی شلاھط کو ایک سمندر بتلاتے ہیں - سلیمان تو کہتا ہے کہ رامنی (سماترا) کے جزیرہ کے ایک طرف بحر ہرکند ہے اور دوسری طرف بحر شلاھط - یعقوبی کلاہ بار کے بعد شلاھط کے پانچویں سمندر کا نام لیتا ہے - اسی طرح کلاہ بار کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے خلیج بنگال مراد ہے - کلاہ کہیں جزیرہ ہے کہیں سمندر -

صندر فولات سلنگا پور نہیں بلکہ وہ جزیرہ ہے جس کا موجودہ نام کونڈور پولو ہے اور جو دریائے میکانگ کے دھانہ پر واقع ہے -

---

شعلے

مصنفۂ مسٹر احمد علی ' نیا سلسار الہ آباد

اس چھوٹے سے رسالہ میں جس کے صفحوں کی تعداد ۱۶۴ ہے قریباً ایک درجن شذرات ' افسانے اور کردارنگاری کے ادبی ٹکڑے شامل ہیں - اگر ادب سے مراد وہ آئینہ ہے جس میں سماج کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے تو یہ رسالہ اس مقولہ کا معقول ثبوت پیش کرتا ہے - ہندوستان

کی زندگی میں جو تلاطم برپا ہے اور ہماری ذہنیت کے بنیادی اصولوں کے متعلق جو کشاکش جاری ہے یہ ادبی کارنامہ اس کا مظاہرہ ہے - آرٹ کیا ہے ' اس کا مقصد کیا ہونا چاہیے ؟ آرٹ ایک نمائش عمل ہے یا مظہر جذبات کسی معاشری نظریے کا علم بردار ہے یا صرف انسانی تخیل کی پرواز ' یہ سوال ہیں جو جواب طلب کرتے ہیں اسی کے ساتھ اور مسئلے بھی وابستہ ہیں - انسانی زندگی کا کیا نصب‌العین ہے اور کوئی نصب‌العین ہونا بھی چاہیے یا نہیں ؟ سوسائٹی کی رہنمائی کن اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے - اگر کچھ اصول ہو سکتے ہیں تو ان کا تعلق محض انسانوں کے سیاسی تعلقات سے ہونا چاہیے یا جنسی تعلقات سے بھی - غرض کہ اس طرح کے اکثر سوالات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں - لیکن یہ ظاہر ہے کہ مسٹر احمد علی ان گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں - نہ میرے نزدیک ان کو اس کی فرصت ہی ہے - جہاں امنگ یہ ہو کہ جوش و خروش کے سیلاب میں سماجی تعمیر کی بنیادیں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں اور لطف اس میں ہو کہ عتاب و نفرت کی دبی چنگاریوں کو ہوا دے دے کر تخریبی جذبہ کا خطرناک آتش‌خانہ بنا دیا جائے وہاں صبر کہاں - حق و ناحق کی تمیز سے کیا واسطہ - لیکن سچ یہ ہے کہ مصنف کے انقلابی جوش میں ایسا معصومانہ انداز ہے کہ اس سے طبیعت میں حدت نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس کی شوخی ایک گونہ تفریح کا سبب ہے -

مسٹر احمد علی مصلح ہیں یا نہیں افسانہ گو ضرور ہیں - ان کے بیان میں ایک قوت ہے جو دل کو کھینچتی ہے - ان کے طرز میں ایک روانی ہے جو ذہن کو اپنی رو کے ساتھ بہا لے جاتی ہے - وہ عوام کے رسوم

فقروں کو اس سلیقہ سے استعمال کرتے ھیں اور دلی کے کرخنداروں کی محبوبہ بول چال کو اس خوبی اور قدرت کے ساتھہ کام میں لاتے ھیں کہ دل کو گدگدا دیتے ھیں ان کی زبان میں وہ چٹخارہ ھے کہ جس کی پڑھنے والے ھی نہیں وہ خود داد دیتے ھیں - گو ان کی تصنیف میں ابھی پختگی نہیں ھے لیکن قصہ گوئی کا مغز موجود ھے - شعلے ایک نمونہ ھیں جو اس مستقبل کی توقع دلاتے ھیں جسے ضرور شاندار ھونا چاھیے - ھاں شرط یہ ھے کہ حضرت مصنف افسانہ کی لطافت کو نظریوں کے بوجھہ سے دبا نہ دیں -

(ت - چ)

کلام جوھر

شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - دھلی

صفحات ۱۳۰ - قیمت ۸ آنہ

یہ مولانا محمد علی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ھے جس کو مکتبہ جامعہ نے جدید ترتیب اور نظرثانی کے بعد شائع کیا ھے - مولانا مرحوم کی شہرت ھندوستان میں ایک زبردست قومی راھنما اور ایک بےمثل انشاپرداز کی تھی - ان کے دل میں مذھب و وطن کی خدمت کی ایک آگ دبی تھی جو زمانہ کی ھوا پاکر بھڑک اٹھی -

ان کی شاعری کی ابتدا کیسے ھوئی اور شاعری کا مذاق کیسے پیدا ھوا - ان کی تحریر سے جس کو مولوی عبدالماجد دریابادی نے اپنے دیباچہ میں نقل کیا ھے یہ پتہ چلتا ھے کہ ان کے بچپن کے زمانہ میں رامپور

میں گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا - داغ ' امیر ' تسلیم ' جلال ' عروج سب رامپور کے آسمان سے نورافشانی کر رہے تھے ' جس سے خود مولانا کے خاندان میں شعرگوئی کا شوق پیدا ہوا - ان کے خاندان کے کئی آدمی داغ کے شاگرد ہوئے - اس سلسلہ سے وہ کبھی کبھی داغ کے مکان پر جایا کرتے تھے اور ایک دفعہ داغ کے سامنے انہوں نے داغ ہی کی ایک غزل خوب کوک کر پڑھی تھی - داغ پر بڑا اثر ہوا اور وہ اس ' بچے ' کو برابر بلایا کرتے تھے -

اپنی شاعری کے متعلق مولانا مزاحیہ انداز میں فرماتے ہیں کہ ' میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی لونڈ پر کودا ہوں - اسے ہاتھی بناکر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں ' - داغ کے ساتھ رہنے کا یہ اثر ہوا کہ مولانا میں شاعری کا مذاق ابتدائے عمر ہی سے پیدا ہوگیا - پہلے اشعار یاد رکھتے تھے مگر بعد کو کہنے بھی لگے - ان کے ابتدائی کلام میں داغ کا اثر خاصا ہونا چاہئے تھا مگر یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ داغ کا اثر خال خال ہے ' ایک غزل کا ایک شعر ہے جو سنہ ۱۸۹۸ع میں لکھی گئی -

غبـار کا خط ہے کـہ دل ہے کسـی دلـدادہ کا
کچھ تو ہے تم نے جو مٹھـی میں چھپا رکھا ہے

لیکن اسی کے بعد کی ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے -

یہ کیا آئے ہوئے بیٹھے ہیں بالیں پر عیادت کو
اجل کو فکر ہے تجھ سے زیادہ میرے درماں کا

نکالا پھر سے پر دل میں رکھا دست وحشت نے
خدا کی شان ہے رتبہ ہو یہ خار مغیلاں کا

آگے چلکر تو انہوں نے غالب کی پیروی شروع کی تھی اور داغ کا کوئی اثر تک نہ تھا - ان کی شاعری کا کیا موضوع تھا ؟ بڑے بڑے شعرا جب کچھ کہنا چاہتے ھیں تو کوئی نہ کوئی مسئلہ ان کے سامنے ہوتا ھے اور وہ اس کے کسی نہ کسی پہلو پر غور کرتے ھیں - اس کو تخئیل کی نظر سے دیکھتے ھیں اور پھر اس کو شعر میں ادا کرتے ھیں - جس طرح فلسفے میں کسی چیز پر نظر ڈالنے کے کئی پہلو ہوسکتے ھیں اسی طرح شاعری میں بھی کئی پہلو ہوتے ھیں یعنی بعض شعرا انسان اور کائنات کے تعلق کو واضح کرتے ھیں - بعض انسان اور بزم قدرت کے سلسلہ کا ذکر کرتے ھیں اور بعض انسان اور انسان کے درمیان ان رشتوں کا ذکر کرتے ھیں جن سے انسان جماعت میں رہ کر ہر حیثیت سے عمدہ زندگی گزار سکے - اول الذکر کا شمار صوفیانہ شاعری میں ہوگا - دوسرے کا نیچرل شاعری میں اور تیسرے کا اخلاقی یا سیاسی شاعری میں - بقول ٹی - ایچ - گرین کے سیاست اخلاق کا ایک گوشہ ھے - یہاں فرد اور جماعت کے تعلقات اور جماعت کی آزادی اور حق و انصاف کا سوال ہوتا ھے - مولانا محمد علی اسی آخری طرز کے شاعر ھیں اور چونکہ اس کا سرا بھی مذہب سے ملا ہوا ھے اس لئے انہیں مذہبی شاعر کہہ سکتے ھیں - مگر یہ واضح رھے کہ وہ صوفی قسم کے شاعر نہ تھے - نیچر کی رنگینیاں ان کی نظر میں نہ تھیں - وہ تو انسان کی اجتماعی زندگی میں اس کی روح کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے - جب انہوں نے آنکھ کھولی تو یورپ کے ظلم و ستم دیکھے اور معرکۂ بلقان میں یورپ کی وہ ' انسانیت ' بھی دیکھی جس کے لئے مولانا شبلی نے کہا تھا کہ -

لہو کی چادریں دیکھی ھیں رخسار شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پر خوں بھی دیکھے ھیں

اس پر ان کا دل بھر آیا اور آزادی اور انصاف کی حمایت میں وہ گویا جلتی آگ میں کود پڑے - اور جتنی قربانیاں اس راہ میں وہ کرسکتے تھے انہوں نے کیں - ان کے دل کا یہی سوز شعر کی صورت میں نکلتا ہے اور جو اشعار انہوں نے اس انداز میں کہے ہیں وہ آج زبان زد ہر خاص و عام ہیں ' یہی وجہ ہے کہ شاعری کے لئے جس اخلاص و صداقت کی ضرورت ہے وہ ان کے یہاں کافی طور پر موجود ہے - مگر ان کی شاعری کا انداز جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں بالکل جداگانہ ہے - بعض حضرات کو ان کا کلام شاید پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو کیونکہ ان کے کلام میں اس قسم کے اشعار نہیں ہیں جنہیں گاکر لوگ ڈھولکی پر رقص کرسکیں - وہ خود ایک جگہ کہتے ہیں -

مقتل ہے دلا ' رقص کی محفل تو نہیں یہ

مقتل کے اس انداز نے جس میں " تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزو ست " کی شان پائی جاتی ہے زمانے کے دھارے کو پھیر دیا - حالی نے سنہ ۱۸۷۸ع میں مسدس لکھا (اتفاق سے یہی سال مولانا محمد علی کی پیدائش کا بھی ہے) جس میں کہتے ہیں -

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

لیکن اس کے قریب چالیس برس بعد مولانا محمد علی کہتے ہیں -

میرے لہو سے خاک وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

بعد کو سر محمد اقبال نے قرطبہ کو مخاطب کرکے کہا ہے -

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ میرے خون جگر میں

ایک وہ وقت تھا کہ دریا میں جزر کے بعد مد کا کہیں پتہ نہیں تھا اور پھر ایک وقت وہ آیا جب ' حسینوں ' کی حنابندی کے لئے نہ صرف جگر میں کچھ خون باقی ہے بلکہ اس میں رنگ بھی ہے - زمانہ نے رنگ بدلا اور خزاں میں بہار کی کیفیت پیدا ہوئی بڑی حد تک یہ اسی شخص کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کا کلام بعضوں کے نزدیک بےمزہ ہے - مگر ان کے دل میں حرارت کا ایک خزانہ تھا - اس کا کچھ حصہ شعر کی صورت میں نکلتا تھا - جو ان کی طبیعت کا رنگ تھا وہی ان کی شاعری میں جھلکتا ہے - سچائی اور انصاف کو جان دےکر حاصل کرنے کو کس عمدہ طریقہ سے ایک غزل میں یوں ادا کیا ہے -

دور حیات آئےگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری انتہا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

خسرو تیری دوروزہ ' میرا پیمان ہے ازل کا
پابند جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

بعض بعض اشعار میں غزل کا عام رنگ بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا -

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

شکوہ صیاد کا بےجا ہے قفس میں بلبل
یاں تجھے آپ ترا طرز فغاں لایا ہے

ہے ظلم بہت عام ترا پھر بھی ستمگر
مخصوص یہ انداز جفا میرے لئے ہے

غرض مولانا کی شاعری میں یہی ایک رنگ ہے جو شروع سے آخر تک جھلکتا ہے - ایک جگہ کہتے ہیں -

نہ بھائےگا تمہیں قصہ عزیزو! عہد رفتہ کا
یہ کیا کہئے ہمیں تو اک یہی افسانہ آتا ہے

البتہ بیجاپور جیل کی ان کی ایک غزل ہے جس میں کسی حد تک اجتماعی رنگ کے بجائے انفرادی رنگ ہے -

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں

چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہیں ہیں ان میں سادگی کا کافی لطف ہے -

نام پر اس کے سب جو دے بیٹھا
وہی اک ہے جو نام کرتا ہے

آج کرلو جو کرسکو ' کل تک
کون جیتا ہے کون مرتا ہے

ان کی آخری غزل بڑی سادہ اور اثر میں ڈوبی ہوئی ہے -

جو مجھے درد آشنا کردے
اے خدا نالہ وہ عطا کردے
کوئی اتنا نہیں زمانے میں
جو میرے درد کی دوا کردے

(د - ح)

کسان : اس کے افلاس کے اسباب اور ان کا علاج

مصنفہ چودھری مختار سنگھ—ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ - نئی دہلی صفحات ۳۷۵ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ -

ہندستان کے کسانوں کے افلاس اور ان کے افلاس کے متعلق چودھری مختار سنگھ کی یہ ایک جامع تصنیف ہے - اصل کتاب انگریزی زبان میں تھی - محمود علی خاں صاحب نے اس کا اردو ترجمہ شائع کرکے اس کی بیبہا معلومات کو عام کردیا ہے -

ہندوستان کی آبادی کا کوئی ۸۵ فی‌صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے - ان میں بیشتر کسان تو شہر کے قریب ہونے سے وسائل آمد و رفت کی آسانی سے شہری زندگی کی اچھائیوں اور برائیوں کو دیکھنے لگ گئے ہیں مگر ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا گاؤں اس دور ترقی میں بھی وسائل آمد و رفت سے محروم ہے اور ان کے یہاں اب تک بچارے مکوں کے اپنی دہن کے فلہ ہی سے سارا کام نکلتا ہے -

اگر آپ کسی ہندوستانی گاؤں میں جائیے تو آپ کو جو چیز نہایت واضح طور پر نظر آئیگی وہ ان گاؤں والوں کا افلاس ہوگا - ان کے چیتھڑے جو وہ بدن پر لگائے رہتے ہیں ان کی فاقہ کشی کی زندگی ان کی کثرت اموات ' ان کا گندہ طرز بود و ماند ' یہ سب ان کے افلاس کی طرف اشارہ کرتے ہیں - انیسویں صدی کے وسط سے اواخر تک ہندوستان قحط کا آماجگاہ بنا تھا اور یہی مسئلہ ہماری سرکار کے زیر نظر رہا یعنی قحط اور اس کے دفعیہ کی تدبیر مگر آج ہندوستان میں تقریباً اس مسئلہ نے دوسرا پہلو بدل لیا ہے یعنی جو قحط کبھی کبھی آیا کرتا تھا وہ اب ہندوستان کے سر پر مستقل طور پر مستولی ہوگیا ہے اور اس نے اب غربت اور فاقہ کشی کی شکل اختیار کرلی ہے - دادا بھائی نوروجی - ولیم ڈگبی اور اومیش چندر دت نے اپنی اپنی کتابوں میں اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور خوب داد تحقیق دی ہے اور علاج کے نئے راستے بتائے ہیں مگر بدنصیب ہندوستان روز بروز افلاس کے گڑھے میں گرتا چلا جارہا ہے -

کسان کی مجموعی آمدنی کے متعلق اس طرف چالیس پچاس برسوں میں بہت توجہ کی گئی ہے - انیسویں صدی کے آخر میں کسان کی آمدنی کا اوسط دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تیس روپیہ سال فی کس ہے ' اس کے بعد بیسویں صدی میں بھی کئی بار اس مسئلہ کی طرف لوگوں نے توجہ کی - مثلاً پروفیسر شاہ اور پروفیسران وادیا اور جوشی وغیرہم نے ہندوستان کی جو مجموعی آمدنی بتائی ہے وہ بعض کے نزدیک تیس روپیہ سے کچھ زائد ہے اور بعض کے نزدیک اس کی تعداد سیکڑہ تک پہونچتی ہے - لیکن اگر آخری رقم بھی شامل کرلی جائے تب بھی ہندوستان کا کسان افلاس کے بارگراں سے اٹھ نہیں سکتا -

کہاجاتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ افلاس کا سبب بین‌الاقوامی کسادبازاری ہے جس کا اثر ہندوستان پر پڑنا لازمی تھا اور اس کسادبازاری میں چونکہ زراعت کو زیادہ نقصان پہونچا ہے اس لئے ہندوستان زراعت پیشہ ہونے کے باعث اس دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا - حالات کا غور سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا افلاس ایک وقتی چیز نہیں ہے بلکہ اس نے ایک کہنہ مرض کی صورت اختیار کرلی جو مریض کو اندر ہی اندر گھلا رہا ہے - اس مرض کے مختلف اسباب ہیں - چودھری مختار سنگھ صاحب نے اس کتاب کے پہلے تین حصوں میں اس افلاس کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے مختلف اسباب بتائے ہیں - مثلاً کسان کی جہالت ، آب پاشی کے ذرائع کی کمی ، زراعت کو تجارتی اصول پر چلانے کی عدم صلاحیت ، برطانوی حکومت کا قیام جس نے قدیم دیسی نظام زندگی بدل تو دیا مگر اس کے بدلے میں جو چیز عطا کی اس میں سوائے پیچیدگی ، اضطراب ، کس مپرسی ، فاقہ کشی اور غربت کے اور کچھ نہیں - اس سلسلہ میں چودھری صاحب نے ان اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کو آج‌کل کالجوں کے پروفیسران اپنے لکچروں میں طوطی کی طرح دھراتے ہیں اور جن کی قرار واقعی کوئی اصلیت نہیں اور اگر ہے تو اتنی کہ یورپ یا انگلستان کے فلاں پروفیسر یا ماہر اقتصادیات نے یوں بیان کیا ہے - وہ اسباب یہ ہیں مثلاً اضافۂ آبادی ، بارش کی قلت ، فضول خرچی ، مہاجن کی تگ و دو وغیرہ وغیرہ -

آخری باب میں چودھری صاحب نے اس افلاس کے علاج کی طرف توجہ کی ہے - اور فرماتے ہیں کہ ہندوستانی کسان کا افلاس دور کرنے کے لئے حسب ذیل چیزوں کی ضرورت ہے - تنظیم ، دیہی مال کی ترویج ،

صنعت کا فروغ ' تعلیم کا عام ہونا ' زمین میں کسان کا مالکانہ حق تسلیم کیا جانا ' مشترکہ کاشت کا نظام جاری ہونا ' زمینداروں کو ساقط الملکیت قرار دینا ' آبپاشی کی اصلاح اور دیہی صنعتوں کو رواج دینا - ان میں سب چیزیں قابل قدر ہیں مگر انہوں نے ایک اور چیز پر زیادہ زور دیا ہے جو واقعی قوم کو پستی سے بلندی پر پہونچا سکتی ہے اور وہ ہے تقدیر پرستی کے خلاف منتظم طور پر جہاد کرنا - آج ہندوستان صرف اپنی تقدیر پرستی کےپرانے فلسفہ میں گرفتار ہے اور یہی نہیں کہ اسکو چھوڑنا نہیں چاہتا ہے بلکہ اسکو سائنس اور موجودہ زمانہ کا علمی رنگ دیکر اور استوار کرنا چاہتا ہے ' اس تقدیر پرستی سے ہزاروں عیوب پیدا ہوتے ہیں - خود اعتمادی اُٹھ جاتی ہے اور واقعیت سے انسان کوسوں دور ہو جاتا ہے - قوائے عمل سرد ہوجاتے ہیں اور سچ پوچھئے تو زندگی کا وہ چولہا جس میں سے بجلی پیدا ہوتی ہے ٹھنڈا ہو جاتا ہے - پھر ساری ترکیبیں خواہ وہ کتنی عمدہ کیوں نہ ہوں بیکار ہیں - تقدیر پرستی ممکن ہے خالص فلسفہ اور علم کے لئے عمدہ چیز ہو اور شاید عقیدہ کو اتنا پختہ کردے کہ عمل مفقود ہو جائے مگر انسان جب تک معاشرت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اسکی فطرت اس نظام زندگی سےبغاوت کریگی اور اگر ایسا نہ ہوا تو ذلت پست ہمتی اور کم اخلاقی کا گڑھا منھ پھیلائے ہوئے اسکو ہر وقت ایک ابدی سکون کی دنیا میں پہونچانے کے لئے تیار ہے - چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ" اگر کسی قوم یا جماعت میں سے خود اعتمادی اُٹھ جاتی ہے تو پھر ترقی کا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوتا - طویل اور مسلسل تباہی کی وجہ سے لوگ قسمت کے چکر میں پڑگئے ہیں اس لئے اگر انہیں ترقی کی صورت معلوم بھی ہوجائے تب بھی وہ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے - لہذا سب سے پہلے ان میں

حوصلہ مندی کا تخیل پیدا کرنا چاہئیے...... یہ بات ان کے ذہن نشین کردینا چاہئیے کہ اپنے مستقبل کو تم خود بنا اور بگاڑ سکتے ہو اور تمہاری قسمت خود تمہارے ہاتھ میں ہے " بقول شاعر

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

آگے چلکر چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ " چاہے قدیم نظام ہندوستان کے حالت کے موافق تھا یا نہ تھا لیکن اب سنہ ۱۹۳۵ ع میں یہ ممکن نہیں کہ پچھلا زمانہ لوٹ آئے - اب لوگوں کو قدیم اور ابتدائی طرز زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرنا ایک مہمل سی بات ہوگی...... موجودہ اور آئندہ نسلوں کو قدیم طرز زندگی پسند نہیں ہوسکتی چاہے اس میں کتنی خوبیاں کیوں نہ ہوں اور نہ پچھلا زمانہ اب واپس آسکتا ہے ....قدیم صورت حالات کی واپسی کا خیال کرنا بھی عبث ہے اور ہماری نجات بھی اسی میں ہے کہ ہم اس نام نہاد مہذب دنیا کے موجودہ اصولوں کی پیروی کریں "

چودھری صاحب نے کسانوں کی حالت کا بڑی غائر نظرسے مطالعہ کیا ہے اور یہی بات ہے کہ انکی کتاب بے مزہ اور پھیکی نہیں ہے - اور وہ جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اگر لوگ اس پر عمل کریں تو یقیناً ہندوستان بہت جلد ترقی کرسکتا ہے - کتاب نہایت قابل قدر ہے اور جسطرح ہندوستان کے کسانوں کی حالت کا ایک نہایت صاف اور دلکش آئینہ ہے اسی طرح تجویز علاج میں بھی کافی حکمت پسندی اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے -

(د)

مسدس حالی

صدی ایڈیشن - صفحات ۱۸۰ - ملنے کا پتہ حالی

پبلشنگ ہاؤس دھلی - قیمت ایک روپیہ -

پچھلے سال پانی پت میں مولانا حالی کے پیدائش کی سویں سالگرہ بڑے آب و تاب کے ساتھ منائی گئی تھی - اس تقریب کی یادگار میں کار کنان حالی پبلشنگ ہاوس نے مسدس حالی کا صدی ایڈیشن شائع کیا - کتاب اعلی طباعت اور اعلی کتابت کا ایک گرانقدر نمونہ ہے - شروع میں ڈاکٹر عابدحسین صاحب نے اس زمانہ کی ہندوستان کی حالت اور حالی کے کارنامہ پر روشنی ڈالی ہے' پھر تقریظات کے سلسلہ میں اول سر سید کے اس مشہور خط کی بجنسہ نقل ہے جو انہوں نے شملہ سے مولانا حالی کو مسدس پر مبارکباد کے طور پر لکھا تھا اور مسدس کی تیاری پر فخر کیا تھا - پھر علامہ اقبال کا ایک قطعہ اور مولوی عبدالحق ' سر راس مسعود ' مولوی حبیب‌الرحمان شروانی اور مولوی عبدالماجد دریابادی کی تقریظیں ھیں - مقدمات کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی اور خواجہ غلام‌السیدین کے دو مضامین ھیں - پھر مولانا حالی کی ایک تصویر اور ان کی تحریر کا فوٹو - پھر مولانا حالی کا دیباچہ اور مسدس شروع ہوتا ہے- آخر میں فرہنگ اور ایک نقشہ ہے جس سے اسلام کے عروج کا حال معلوم ہوتا ہے - انکی خوبیوں کے باوجود کارکنان نے قیمت صرف ایک روپیہ رکھی ہے - ضرورت ہے کہ لوگ انکی ہمت افزائی کریں تاکہ ساتھ ساتھ مولانا حالی کا کلام بھی زندہ رہے -
(و)

مکتوبات نیاز

جناب نیاز فتحپوری کے کچھہ خطوط کا مجموعہ ہے جسے نگار بک ایجنسی نے لکھنؤ سے شایع کیا ہے - قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھہ آنہ

ہے - ابتدا میں اُن کی ایک مختصر سی تمہید بھی شامل ہے جو
اِن بے شمار معمّوں کی تعداد میں ایک اور معمّے کا اضافہ کرتی ہے - اس کا
ماحصل یہ ہے کہ ان خطوط میں سے کچھ زمانۂ قیام بھوپال میں لکھے
گئے ہیں جن کی نقلیں جناب قمر مرحوم نے رکھ چھوڑی تھیں اور کچھ
خطوط اس سے بھی پہلے کے ہیں جن کی نقلیں باوجود " حد درجہ
بے پروا " ہونے کے جناب نیاز نے رکھ چھوڑی تھیں - ان کی اشاعت کا خیال
اس ماضی سے متعلق ہے جس کی یاد اب بھی نیاز صاحب کو اکثر ستایا
کرتی ہے اور جسے وہ اپنے حال و مستقبل سے وابستہ کرنے کے لئے یہی
کرسکتے تھے کہ اس کے " باقی ماندہ آثار و نقوش " کو محفوظ کردیں - ان
نقلوں میں سے اکثر ایسی تھیں جن میں کوئی تاریخ درج نہ تھی اس لئے
اوروں کو بھی بلا صراحت تاریخ شائع کر دینا بہتر سمجھا گیا اور چونکہ
جن احباب کے نام یہ خطوط لکھے گئے تھے ان میں اکثر اب موجود نہیں
اس لئے اس تعین کو بھی نظر انداز کردیا گیا - اور خاتمے میں اس طرح
مہر ڈال کر کہ " اب یہ تمام ہرزہ سرائی گویا صحیح معنی میں
ہرزہ سرایانہ انداز سے پیش کی جارہی ہے " نیاز صاحب نے اس آخری
مشکک سے بھی مصالحت کرنی چاہی ہے جو باوجود ان کی مذکورہ
تشریح کے ان مکتوبات کے سر پیر سمجھنے سے قاصر ہے -

خطوط کا عام قاعدہ یہی ہے کہ مکتوب الیہ کا نام ضرور دے دیا جاتا ہے
جس سے کاتب و مکتوب دونوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کسی
قسم کے شبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی - نیاز صاحب کا یہ لکھنا کہ ان
میں سے اکثر حضرات اب موجود نہیں ممکن ہے صحیح ہو لیکن ان میں
سے وہ خطوط بھی تو کافی تعداد میں ہوں گے جو جنگ عظیم کے بعد لکھے
گئے ہیں - آخر ان حضرات کے نام دے دینے میں کیا حرج تھا جو ابھی

لک زندہ ھیں ؟ پھر یہ بات بھی سمجھہ میں نہیں آتی کہ خطوط کی نقلیں بطور یادگار رکھہ لی گئیں اور تاریخ کچھہ میں درج کی اور کچھہ میں نہیں حالانکہ ایسی صورت میں تاریخ کا درج کر لینا بہت ضروری تھا - اس سے زیادہ حیرت اس پر ھے کہ شائع کرتے وقت جن خطوط میں تاریخیں تھیں وہ بھی اُڑا دی گئیں - ان تمام باتوں سے ایک قسم کی یکسانیت ضرور پیدا ہوگئی جو پسندیدہ ھے اور ھر قسم کی ذمہداری سے نجات بھی مل گئی جو اس سے بھی زیادہ پسندیدہ ھے - ایک بات البتہ رھی جاتی ھے - تمہید سے معلوم ہوتا ھے کہ یہ خطوط نیاز صاحب کے دوران قیام بھوپال اور اس سے پہلے کے لکھے ہوئے ھیں ' لیکن اس میں کچھہ خطوط ایسے بھی ملتے ھیں جو انہوں نے اپنے موجودہ قیام لکھنؤ میں لکھے ھیں ' مثلاً خط نمبر ۱۹۱ جس میں جمالستان کی ایک جلد بھیجنے کا تذکرہ ھے جسے کچھہ عرصہ ہوا انہوں نے لکھنؤ سے شائع کیا ھے - دوسرا خط نمبر ۱۷۹ ھے - جن لوگوں نے نگار میں نیاز کے فسانہ طراز قلم سے "موج کوثر و تسلیم" بہتے ہوئے دیکھا ھے سمجھہ سکتے ھیں کہ یہ دو تین برس سے پہلے نہیں لکھا جاسکتا تھا - خط نمبر ۱۲۲ بھی حال ھی کی تحریر ھے کیونکہ اس میں بھی اسی کا حوالہ ھے - اور اسی طرح کے نہیں معلوم کتنے خطوط ہوں گے جن میں ان کی تاریخ کے متعلق کوئی اندرونی شہادت نہیں ملتی - ممکن ھے کہ یہ سب حافظہ کی فروگذاشت ہو جس سے کسی کلیہ کے ماتحت ہمیشہ کوئی بڑا نتیجہ نکال لینا شائد درست نہیں -

جو لوگ انگریزی ادب سے واقف ھیں وہ الگزنڈر پوپ اور ھوریس وال پول کے مکتوبات کی طرف سے ناقدین کی بدظنی سے آگاہ ہوں گے - نیاز کے مکتوبات کی مثال ھوریس کے اُسی مجموعے سے ھے - اتنا تو

نیاز صاحب بھی اقبال کرتے ھیں کہ انھوں نے خطوط کی نقلیں رکھہ لی تھیں جس سے کم از کم بات قطعي طور پر ظاهر ھے کہ خط لکھتے وقت مصنف کو یہ خیال رھا ھوگا کہ کبھی وہ دوسروں کی نظر سے بھی گذریں گے - اس لئے اگر مکاتیب کا امتیازی وصف کہ ان میں لکھنے والے کی شخصیت نظر غیر سے محفوظ ھوکر بےپردا ھوجاتی ھے ایک بڑی حد تک ان خطوط میں مفقود ھوجائے تو جائے عجب نہیں - شروع سے آخر تک انداز میں ایک مستقل تصانیف کی سی ھمواری ھے - اس کی ادبی نزاکتیں اور لطافتیں تکلفات و تصنعات سے گراں بار ھیں - اگر کہیں سادگی ھے تو وہ جو بناوٹ سے پیدا کیجاتی ھے ' بیساختگي ھے تو وھی جو غور و فکر کی پردہ پوش ھے - تحریر کی شوخی اور بے باکی غیر ارادی اور غیر محسوس نہیں - ھر ادا گو بظاھر ایک نظر کے لئے مختص معلوم ھوتی ھے مگر عام تماشائیوں کی نظر سے باخبر ھے اور داد طلب - پھر ان تمام باتوں کی ساری وجہ صرف اتنی کہ نیاز صاحب نے ان مکتوبات کی نقلیں پہلے ھی سے محفوظ کرلی تھیں کس قدر ناکافی ھے اور کتنی معصوم -

غالب کی طرح نیاز صاحب نے بھی القاب میں بڑی جدتوں سے کام لیا ھے اور " امے " کے ابتذال سے لےکر " مطاعی الاجل " کے اثقال تک بہت سے القاب وضع کر ڈالے ھیں - غالب ھی کیطرح انھوں نے بھی مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ھے ؛ فرق یہ ھے کہ غالب کے یہاں یہ مکالمہ بالمشافہہ معلوم ھوتا ھے ' نہ صرف اس لئے کہ وھاں مکتوب الیہ سے بھی ھم واقف ھوتے ھیں بلکہ اس لئے بھی کہ اکثر کے نام خطوط کا ایک سلسلہ ھے جس سے ھم ان معاملات اور اشخاص سے جن کا تذکرہ مراسلات میں ھوتا ھے بہت کچھہ آگاہ ھو جاتے ھیں اور ساتھہ ھی ساتھہ مکتوب الیہ کے انداز اور اسکے

جواب کا بھی قیاس کر سکتے ہیں - نیاز صاحب کے مخاطب غائب ہیں - بلکہ ایک ریڈیو پر بولنے والے کی طرح وہ ایک مفروضہ مخاطب کو سامنے رکھ کر ساری دنیا سے کچھ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - انہوں نے اپنے خطوط کے سلسلوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا - چنانچہ ان کے دو سو اٹھارہ خطوط تقریباً دو سو اٹھارہ اشخاص کے نام معلوم ہوتے ہیں حالانکہ با وصف اڈیٹر نگار اور مصنف ترغیبات جنسی وغیرہ ہونے کے ان کے احبّاء کی فہرست اتنی طویل قرین قیاس نہیں - پھر لوگ شیخ صاحب ' مہر صاحب ' مرزا صاحب ' خاں صاحب اور مولانا وغیرہ کہکر مخاطب کئے جاتے ہیں اور اس غیر دلچسپ یکسانیت کو دور بھی کیا جاتا ہے تو کسی زید ' عمر ' بکر قسم کے نام سے - اس سے قطع نظر کرکے معاملات کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ آپ کو بڑی گہری باتوں کا رازدار بنایا جا رہا ہے لیکن ساری گفتگو استعارات و کنایات میں ملیگی - اس قسم کے خطوط کی اشاعت در اصل بھری محفل میں بیٹھکر رمز و کنایہ میں باتیں کرنا ہے -

اب دیکھنا یہ ہے کہ مکتوبات نیاز کا بہ حیثیت مجموعی کیا اثر پڑتا ہے اور وہ پبلک کے لئے کس قسم کا ادب فراہم کرتے ہیں - اس سے قبل آپ کی نظر سے اکثر اکابر کے خطوط گذرے ہونگے ' آپ نے اردو میں غالب ' سر سید اور شبلی وغیرہ کے خطوط پڑھے ہونگے جن سے آپ ان بزرگوں کی ذہنی زندگی کا قریب سے مطالعہ کر سکے ہونگے ؛ زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے اصولوں اور نظریوں سے واقفیت حاصل کی ہوگی اور ان کے برتنے کا ڈھنگ دیکھا ہوگا - نیاز صاحب سن و سال کے اعتبار سے کافی مسن ہیں اور باوجود تصویر میں اپنے انداز نشست کے ۵۰ سال سے شائد ہی کم ہوں - اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ تمام خطوط زمانہ قیام بھوپال تک کے ہیں تب بھی نیاز صاحب کم از کم اس حد سے بہت

پہلے تجاوز کر چکے تھے جب انسان صرف جذبات کی پوٹلی ہوتا ہے اور وہاں پونہچ چکے تھے جب وہ زندگی کو بڑی سنجیدگی سے لیتا ہے اور اپنے ہر عمل میں فکر و غور کو دخل دینے لگتا ہے - پھر نیاز صاحب کے مشن کو دیکھئے جس کی تبلیغ وہ زمانۂ بھوپال سے کر رہے ہیں - قرآن و حدیث پر ان کے مبسوط مباحث، سیاست و معاشرت پر ان کے طویل مقالے - کیوں نہو آخر وہ انسانیت کے علمبردار ہیں، مصلح قوم ہیں، ہادی ملت ہیں اور ایک نئے انقلاب کے پیام بر - اس لئے اگر ہمارے ذہن میں پہلے ہی سے ان کے مکتوبات کا کوئی معیار متعین ہو جائے اور ہم اس سے کچھ توقعات قائم کرلیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں - ہم دیکھنا چاہیں گے کہ نیاز صاحب اپنے اقوال میں جس سطح پر رہتے ہیں اسے اپنے افعال میں کہاں تک قائم رکھتے ہیں، ہم جاننا چاہیں گے کہ اپنے نصب العین کی جستجو میں وہ کس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوئے، ان کو کن مادی مشکلات سے سابقہ پڑا اور زندگی کے دیگر دشوار گزار مراحل کیسے طے کرتے رہے - یہ وہ امور ہیں جن کے رازدار ان کے احبا ہی ہوسکتے ہیں اور اسی میں ہمارے لئے بھی درس بصیرت ہے - لیکن آپ مکتوبات کے صفحات الٹ جائیے - آپ کو ایک بہت بڑا عنصر ان خطوط کا ملیگا جن میں وہ اپنے دوستوں سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں اور جن میں جگہ جگہ رندی و ہوسناکی کا اظہار کیا گیا ہے - اس کے علاوہ چند خطوط ایسے بھی ملیں گے جن میں کسی سنجیدہ مسئلہ پر کچھ رائے زنی کی گئی ہے لیکن ان میں طعن و طنز، تمسخر و استہزاء کا رنگ غالب نظر آئیگا - کہیں کچھ خطوط ایسے بھی مل جائیں گے جن میں شعر و شاعری کا تذکرہ ہے - لیکن یہ آخری دو عناصر عملی اور غیر اہم

هیں اور غالباً صرف تنوع پیدا کرنے اور ضخامت بڑھانے کے لئے شائع کردیئے گئے ہیں ' کیونکہ ظاہر ہے کہ اس عہد ماضی سے کہ " جسکی یاد اب بھی مجھکو (نیاز صاحب) ستایا کرتی ہے " اور جسے وہ اپنے مکتوبات کو شائع کرکے زندہ کرنا چاہتے ہیں ' ان کا کتنا تعلق ہوسکتا ہے - اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ ایسے جملے اور فقرے بھی ملیں گے جس سے نیاز صاحب کی آزادی مشرب ' وسعت ظرف ' اور علوے حوصلہ کا ثبوت ملتا ہے لیکن پھر بھی یہ فیصلہ باقی رہ جاتا ہے کہ کتنی چیزوں کا تعلق ان کے دل سے ہے اور کتنی باتوں کا دماغ سے - مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں " باور کیجئے ' میں ہرگز نوازش کا مستحق نہیں ' مجھ پر احسان کرنا ' مجھے ہلاک کرنا ہے - نمرود کی خدائی میں رہتا ہوں اور اسی میں جان دینا پسند کرتا ہوں - آپ کیوں اپنا دل دکھائیں " - اب یہ فیصلہ ناظرین کریں کہ یہ خودداری ہے یا صرف تحریر کا بانکپن -

ان تمام باتوں سے قطع نظر کرکے ذرا ان خطوط کو بھی دیکھئے جو نیاز صاحب کی زندگی کے دور تغزل کی یادگار ہیں جن کو شائع کرکے آج بھی وہ آسودگی حاصل کر رہے ہیں - اس میں شک نہیں کہ حسن مذاق سے بڑی بڑی تلافیاں کی جاسکتی ہیں اور نیاز کے زور قلم نے ایک بازاری غزل کی فضا میں باوجود اس کے سفاک معشوق اور رقیب روسیاہ ' ناصح مشفق اور عاشق زار کے کافی رنگینی اور شعریت پیدا کر دی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ زاہد کی طرح رند بھی بسا اوقات ریاکار ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ پہلا صرف دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اور دوسرا اپنے کو بھی - ان خطوط میں آپ کاتب کو مختلف حالتوں میں پائیں گے - کبھی وہ " ہلاک " ہوا جا رہا ہے ' کبھی " کپڑے پھاڑ کر " نکل جانے پر آمادہ ہے ' ہر جگہ

اس کی باتیں بغاوتی معلوم ہونگی - وہ ایک رقاصہ کی خاطر اپنا سر بھی پٹک دینے کے لئے تیار ہوگا (ملاحظہ ہو خط نمبر ۱۷۳) مگر آپ کو یہی شبہہ ہوگا کہ وہ ایکٹنگ کر رہا ہے ـــــ سنجیدگی اور متانت ' غور و تعمق در کنار ' ان کی ہنسی بھی جھوٹی ہنسی معلوم ہوگی اور ان کی آزاد زندگی میں ایک سستے قسم کی آوارگی کے جملہ علامات ملیں گے - پھر وہ اپنے دوستوں کو جس طرح مخاطب کرتے ہیں ' ان کی طرف سے جن جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور جس سطح پر وہ کو ان سے گفتگو کرتے ہیں بہت معمولی اور بسا اوقات پست اور عامیانہ معلوم ہونے لگتی ہے جس کی وجہ سے نیاز کے حلقۂ احباب کی حیثیت رتن ناتھ سرشار کے الفاظ میں " یاران سرپل " سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی -

یہ صحیح ہے کہ بہت سے بزدل انسان ایسے ہیں جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کو غیر ذمہ دارانہ طور پر ٹھکرا کر رومانی اور افسانوی دنیاؤں میں پناہ لیتے ہیں - لیکن جب ملک کا ایک مشہور اہل قلم جو مذہب و سیاست میں کچھ مخصوص اصولوں کی اشاعت کررہا ہے ' جو شعر و ادب ' فلسفہ و تاریخ ' غرضکہ ہر علم و فن پر مجتہدانہ رائےزنی کرتا ہے اور اس نوع کے مکاتیب کو اپنے عہد ماضی کے " باقی ماندہ نقوش و آثار " کی حیثیت سے اپنے حال و مستقبل سے وابستہ کرنا چاہتا ہے ' تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ کس کو کیا کہیں - معلوم ہوا کہ تھوڑی سی ذہنی استعداد اور چند دنوں کی مشق و مزاولت ایک شخص کے لئے کافی ہے کہ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے سنجیدہ اور برگزیدہ مسائل پر رائےزنی کر کے "آخری لفظ" کہتا رہے عام اس سے کہ اس کی زندگی ایک سڑک پر چلنے والے عامی کی زندگی سے بھی فرو تر ہو -

بہرحال مجبوری ہے - ہاں اگر اس کے متعلق خود نیاز صاحب کی آخری راے پر مفاہمت کرکے مکتوبات سے لطف اٹھایا جاے تو شاید کوئی مضایقہ نہو کہ ان کی دیگر تصانیف کی طرح یہ 'تصنیف' بھی دلچسپ ہے اور ان کی مخصوص ظرافت اور رنگینی بیان کی حامل -
(ص - ا - ص -)

ترانۂ عاشق

پنڈت گردھاری موہن کول عاشق دہلوی ' ملنے کا پتہ ' کتب خانہ دین محمدی ' بل روڈ لاہور ' قیمت ا روپیہ -

عاشق صاحب کی غزلوں کا یہ پہلا مجموعہ کتابت و طباعت کی پاکیزگیوں کے ساتھ ایک خوبصورت جلد میں شائع ہوا ہے' پنڈت گوپی کشن صاحب مدن رئیس کشمیر نے ایک صفحہ میں شاعر کا تعارف کرایا ہے ' اور دوسرے احباب نے دیوان کی مدح میں نظمیں اور تاریخیں لکھی ہیں' "بیان شاعر" کے عنوان سے شاعر کا ایک صفحہ کا دیباچہ ہے جس میں اپنی عروض اور زبان سے ناواقفی پر معذرت لکھی گئی ہے ' عاشق صاحب مقامی استادوں کی صف میں شامل ہیں ' ان کا کلام پرانے رنگ کا ہوتا ہے ' وہ قدیم اساتذہ کی مشہور غزلوں پر طبع آزمائی فرماتے ہیں ' اور سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں لکھتے ہیں ' بااینہمہ وہ جدید رنگ سے بھی ناواقف نہیں ہیں ' چند عنوانات مثلاً ترک دنیا ' فریاد گل ' خواب دنیا ' نئی جنت ' مرثیہ عاشق ' حسن سراپا ' خواب ' آرزوے شام ' انتظار شام ' بچوں کے لئے تحفہ ' پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے ' اور گو یہ مستقل نظمیں نہیں ہیں تاہم مسلسل غزلیں ضرور ہیں ' بعض غزلیں ظریفانہ انداز میں لکھی ہیں ' اور ان میں بےتکلف انگریزی الفاظ کو جگہ دی ہے " -

دیوان ردیف وار مرتب ہے ' لیکن خواہ مخواہ ردیفوں کے پورا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ' مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ خاصا دلچسپ ہے ' اور یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ عاشق صاحب اپنے فن میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں ' طباعت کی عجلت میں بعض فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہیں ' جن کو قلم سے درست کیا گیا ہے ' بعض جگہ ترتیب میں بےترتیبی ہے ' جس کی اصلاح ممکن نہ تھی -

(س - ا)

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۶	اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ع	حصہ ۴

اردو نظم کے ایک منتخب مجموعے کی ضرورت

(از مولوی عبدالسلام ندوی)

هندوستان بلکہ کل ایشیا میں شاعری زیادہ تر تفریح اور دلچسپی کا ذریعہ خیال کی گئی ہے ' اس لئے شاعری کے متعلق جو ادبی کام کئے گئے ' وہ بھی زیادہ تر تفریح اور دلچسپی کے خیال سے کئے گئے - نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کے کاموں کا جو بلند علمی معیار قائم ہوسکتا تھا ' دفعتاً پست ہوگیا ' اور اب رسم و رواج اور الف و عادت کی وجہ سے کسی کو اس پستی کا احساس تک نہیں ہوتا - بہرحال اس قسم کے کاموں میں نظم کے مجموعہائے انتخابات کو خاص طور پر علمی اہمیت حاصل ہے - اگرچہ اردو زبان میں منتخب اشعار کے بہت سے مجموعے موجود ہیں ' لیکن افسوس ہے ' کہ اس تفریحی دلچسپی نے اس اہم اور مشکل ادیبانہ کام کو اس قدر آسان ' اس قدر پست ' اور اس قدر مبتذل بنا دیا ' کہ اصناف شاعری میں صرف غزلوں کا انتخاب کیا گیا جو زیادہ تر عام دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں اور بقیہ اصناف شاعری کو ناقابل اعتنا قرار دیا گیا ' اور غزلوں کے انتخاب میں بھی اس کے سوا اور کوئی معیار قائم نہ کیا جاسکا ' کہ جو اشعار منتخب کئے گئے ' وہ انتخاب

کرنے والوں کو ذاتی طور پر پسند آئے ' اور ان سے ان کے تفریحی جذبہ کو تسکین حاصل ہوئی - لیکن ظاہر ہے کہ انتخاب اشعار کا یہ کوئی قابل اعتماد علمی معیار نہیں ہے - ممکن ہے ' کہ ایک چیز ایک شخص یا بہت سے اشخاص بلکہ کل دنیا کو پسند آئے ' لیکن بااینہمہ اصول فن کے مطابق نہ ہو ' لیکن افسوس ہے کہ ہماری زبان میں منتخب اشعار کے جو مجموعے موجود ہیں ' ان کی بڑی تعداد اسی دلچسپی سے تعلق رکھتی ہے ' لیکن یہ دلچسپی بھی کوئی دقیق و عمیق چیز نہیں ہے ' بلکہ بالکل سطحی اور عامیانہ ہے - میر ' سودا ' ناسخ ' آتش ' امیر و داغ ' اصغر و جگر ' فانی و جوش ' دور قدیم و جدید کے مشہور شعرا ہیں ' اور ان کا نام ہر کوچہ و بازار میں لیا جاتا ہے اس لئے عام طور پر ان کے اشعار سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے ' اور جب کسی کے دل میں انتخاب اشعار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ' تو وہ اپنی مرغوب بلند آشیاں کو تاکتا ہے ' اور اپنے ذاتی رجحان سے مختلف نوعیت کے انتخابی مجموعے تیار کرتا ہے ' مثلاً بعض لوگ ان کے دیوان یا مجموعۂ نظم کو اس قدر نچوڑ لیتے ہیں ' کہ اشعار کی تعداد اس قدر محدود ہوجاتی ہے ' کہ ان سے کسی شاعر کے تمام مضامین میں شعر یا تمام محاسن کلام کا اندازہ نہیں ہوسکتا - اصغر کے سو شعر اور جگر کے سو شعر کے نام سے جو مجموعہائے انتخابات شائع ہوئے ہیں ' وہ درحقیقت اصناف شاعری میں صنف غزل کے حمائل شریف ہیں ' جن میں انتخابی اشعار کی تعداد کے کم کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ عالم شعر میں ان سے زیادہ بلند اشعار کا وجود اور امکان نہیں - گویا انتخاب کرنے والوں نے اس طریقہ سے اپنے حسن انتخاب اور دقیق‌النظری کی داد لینی چاہی ہے ' خود ان شعراء کے کلام کے حسن کو بالذات نمایاں کرنا نہیں چاہا ہے ' بلکہ ان کا

حسن فصلی طور پر نمایاں ہوگیا ہے - اس کے بخلاف کچھ لوگوں نے خاکساری سے کام لیا ہے ' اور اپنی حیثیت کے بجائے خود ان شاعر کی حیثیت کو نمایاں کرنا چاہا ہے جس کے اشعار کی خوبیاں وہ اپنے انتخابات کے ذریعہ سے ظاہر کرنا چاہتے ہیں ' اس لئے ان لوگوں نے اس لے کو اس قدر بڑھا دیا ہے ' کہ یہ انتخابات سو شعر کے بجائے ہزاروں اشعار کا مجموعہ ہوگئے ہیں ' گویا ایک شاعر کے متعدد دیوانوں سے چھانٹ کر ایک مستقل دیوان تیار کر لیا گیا ہے ' اور اس کے ذریعہ سے یہ دکھلایا گیا ہے ' کہ ان شعراء نے اس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار کہے ہیں ' کہ اگر ان کو جمع کردیا جائے تو ایک بڑا ضخیم دیوان تیار ہوسکتا ہے - غرض ہماری زبان میں انتخابی اشعار کے جس قدر مجموعے موجود ہیں ان میں خود انتخاب کرنے والوں نے اپنی حیثیت نمایاں کی ہے ' یا جس شاعر کے اشعار انتخاب کیے ہیں ' اس کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے - خود اشعار کے عیب و ہنر یا اس عیب و ہنر کی جامعیت کو نظر انداز کردیا ہے ' جس کا نتیجہ یہ ہے ' کہ اس وقت انتخابات کے مختصر مجموعے موجود ہیں ' ان میں بہت سے مغلق ' مبہم ' اور بےمعنی اشعار شامل ہیں ' لیکن چونکہ انتخاب کرنے والے اس قسم کے اشعار کو جذبات عالیہ کی مثال میں پیش کرتے ہیں ' اس لیے ان کو نظر نہیں آتا کہ اغلاق و ابہام غزل کا سب سے بڑا عیب ہے - اس کے بخلاف جو مجموعے نہایت طویل ہیں ' ان میں پسندیدہ اشعار کے ساتھ ایک حصہ غیر پسندیدہ اشعار کا بھی شامل ہے ' جس سے انتخاب کا مقصد پورا نہیں ہوتا ' اس کے ساتھ یہ انتخابات کسی علمی اصول پر مبنی نہیں ہیں - مثلاً اگر ہم یہ جاننا چاہیں ' کہ ہماری زبان میں کتنے اشعار ہیں جن کے الفاظ فصیح ہیں ' کتنے اشعار

هیں جو معنی کے لحاظ سے بلیغ هیں ' کتنے اشعار هیں جو تصوف و اخلاق کے مسائل پر مشتمل هیں ' کتنے اشعار هیں جن میں تغزل کی شان پائی جاتی هے ' اور کتنے اشعار هیں جو معاملہ بندی سے تعلق رکھتے هیں ' تو اردو زبان کے کسی مجموعہ انتخاب سے هم کو یہ اور اس قسم کے دوسری ادبی خصوصیات کا پتہ نہیں چل سکتا ' اور جب یہ قید لگا دی جائے ' کہ ان سوالات کے جوابات کے لئے محض سادہ اور معمولی اشعار مطلوب نہیں هیں ' بلکہ اس کے ساتھ ان کو رنگین ' بلند ' اور نادر بھی هونا چاهیے ' تو انتخابات کے یہ مجموعے بالکل بےکار ثابت هوں گے ' اور هم کو اصول فن اور اصول تنقید کے مطابق ایک نئے مجموعہ انتخاب کی ضرورت هوگی -

یہ تو منتخب اور خوشگو شعراء کے کلام کے انتخابات کا حال هے ' لیکن اس سے بھی زیادہ پست اور اس سے بھی زیادہ مبتذل وہ انتخاب کلام هے ' جو شعرائے اردو کے تذکروں میں پایا جاتا هے - جس طرح هماری اردو شاعری فارسی شاعری کی ایک نامکمل نقل هے ' اسی طرح هماری تذکرہ نویسی بھی پرانی تذکرہ نویسی کا ایک ناتمام عکس هے ' ایران میں تذکرہ سے مقصود صرف عمدہ اشعار کا انتخاب هوتا تھا ' چنانچہ ایران کے ابتدائی تذکرے صرف انتخابات هیں - مرزا صائب کا انتخاب آج بھی موجود هے جس میں کسی شاعر کا حال برائے نام بھی نہیں صرف اشعار هی اشعار هیں لیکن انتخاب اس درجے کا هے کہ هزاروں تذکرے اس پر سے نثار کردئے جائیں - والہ داغستانی اور آتش‌کدہ میں اگرچہ حالات بھی هیں ' لیکن اصل خصوصیت موجود نہیں - عمدہ اشعار کا انتخاب هی ان کا مطمح نظر هے - لیکن همارے تذکرہ نویسوں نے اس خصوصیت کو بالکل نظر انداز کردیا هے ' اور بالکل رسمی طور سے شاعر کے کلام سے چند

اشعار کا انتخاب کر لیا ہے ' لیکن ان منتخب اشعار کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے ' کہ ان کو محض اس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے ' کہ جس شخص کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ خدا نخواستہ کوئی فقیہ یا محدث نہیں ہے ' بلکہ اردو زبان کا ایک شاعر ہے - اس سے بہتر تو یہی تھا ' کہ ہر شاعر کے حالات میں اس کی چلد پوری پوری غزلیں درج کردی جاتیں ' جس سے اس کی تمام شاعرانہ خصوصیات کا اندازہ ہوجاتا - مولانا حسرت موہانی نے متعدد شعراء کے دواوین کا جو انتخاب کیا ہے ' وہ اس حیثیت سے قابل قدر ہے ' اور مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بھی معلوی طریقۂ انتخاب اختیار کیا ہے ' اور میرے خیال میں جس طرح اردو زبان میں ان کا تذکرہ تمام تذکروں سے بہتر ہے ' اسی طرح ان کا یہ طریقۂ انتخاب بھی اور تذکرہ نویسوں سے بہتر ہے ' کیونکہ اس میں ایک معنویت پائی جاتی ہے ' اور اس کی بنیاد صداقت کے ساتھہ ایک علمی اصول پر بھی ہے - میں نے ایک اور مجموعہ انتخاب بھی دیکھا ہے ' جس میں ناسخ ' آتش ' اور آباد کی تمام ہم طرح غزلیں ایک ہی صفحے کے تین کالموں میں بالمقابل درج کی گئی ہیں ' اور میری رائے میں یہ انتخاب بھی ایک علمی حیثیت رکھتا ہے ' کیونکہ اس کے پڑھنے سے ہم کو کم از کم ایک ہی دور کے تین مشہور شاعروں کی ہم طرح ' ہم قافیہ اور ہم ردیف غزلوں کے موازنہ کا موقع ملتا ہے ' اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک دور کے معاصر شعرا مثلاً میر ' سودا ' مصحفی ' انشاء ' داغ ' امیر اور جلال وغیرہ کے دواوین کا انتخاب بھی اسی اصول پر کرنا اردو زبان اور اردو شاعری کی ایک قابل قدر خدمت ہے - اسی سلسلہ میں اس قسم کے مجموعۂ انتخابات بھی شامل ہوسکتے ہیں ' جن سے اردو زبان اور اردو شاعری کے کسی خاص مرکز مثلاً دکن'

دلی ' لکھنؤ ' اور پٹنہ کی شاعرانہ خصوصیات اور تفرق و برتری کا اندازہ ہوسکے ' اس لیے شعرائے دکن ' شعرائے دلی ' شعرائے لکھنؤ ' اور شعرائے پٹنہ کی ہر طرح غزلوں کا انتخاب بھی اگر الگ الگ جلدوں میں کیا جائے ' تو اس قسم کے انتخابات کی ایک علمی حیثیت قائم ہوسکتی ہے -

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا ' کہ ہماری زبان میں تفریحی انتخابات تو بہت زیادہ ہیں ' لیکن علمی انتخابات بالکل نہیں ہیں ' ایسی حالت میں ہندستانی اکیڈیمی مستحق مبارک باد اور اس کے فاضل سکریٹری مستحق شکریہ ہیں کہ انہوں نے اردو زبان اور اودو شاعری کی اس کمی کو محسوس کیا ' اور مختلف دوروں کے شعراء کے کلام کے انتخاب کا کام وسیع پیمانہ پر جاری کیا ' اور اس کی بنیاد علمی اصول پر رکھی ' اور متعدد جلدوں میں ایک ایسا انتخاب تیار کرانا چاہا -

(۱)—جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو ' بلکہ وہ ہر صنف پر حاوی ہو -

(۲)—ساتھہ ساتھہ تاریخی اصول بھی مدنظر رہے ' تاکہ شعر اور اس کے زمانہ کا تعلق نمایاں ہوجائے اور زبان کی تدریجی ترقی کی منزلیں نگاہ کے سامنے آجائیں .

(۳)—نہ اتنا مختصر ہو ' کہ شاعر کی خصوصیات اور اس کے عمدہ کارنامے نمایاں نہ ہونے پائیں نہ اتنا طویل ہو کہ اس میں رطب و یابس اشعار بھی شامل ہوجائیں -

یہ علمی اصول یقیناً قابل قدر ہیں ' لیکن اس جامع انتخاب کی ضرورت ہے ' جو ہمارے لئے معلم اور استاد کا کام دے اور ہم کو یہ بتائے ' کہ اصول تغزل کے مطابق غزل کس کو کہتے ہیں ' قصیدہ کے لئے اصول فن کے مطابق کیا کیا خصوصیات درکار ہیں ' مثنوی کی حقیقت

کیا ہے ؟ اردو زبان میں اصول فن کے مطابق کن کن شعراء نے مرثیے کہے ہیں - غرض ہم کو ایک ایسا انتخاب درکار ہے ' جو اصول فن کے مطابق ہمارے سامنے تمام اصناف سخن میں سے بہترین اشعار کا ایک گلدستہ پیش کردے ' اور ان کے پڑھنے سے اردو شاعری کی ہر صنف کا ایک ایسا صحیح مذاق پیدا ہوسکے ' جو اصول فن کے بالکل مطابق ہو - میں یہ محض کوئی خیالی یا ظنی بات نہیں کہہ رہا ہوں ' بلکہ اس قسم کی مثالیں موجود ہیں ' جن سے ثابت ہوتا ہے ' کہ انتخابات نے بگڑے ہوئے مذاق کی اصلاح کرکے شعر و سخن کا نہایت عمدہ اور صحیح مذاق پیدا کیا ہے ' مثلاً مرزا مظہر جانجاناں نے خریطۂ جواہر کے نام سے فارسی اشعار کا جو مختصر سا مجموعہ انتخاب تیار کیا تھا ' اس کی نسبت ثقات دلی کا بیان ہے ' کہ دلی میں فارسی شاعری کا عمدہ مذاق صرف اسی انتخاب سے پیدا ہوا ' اور میں خیال کرتا ہوں ' کہ دلی میں اردو شاعری نے جو سنجیدہ قالب اختیار کیا ' اس میں اور اسباب کے ساتھ اس انتخاب کو بھی ضرور دخل ہوگا - فارسی غزلوں کا ایک اور انتخاب اس سے پہلے مرزا صائب نے کیا تھا ' جس کی نسبت مولانا شبلی علیہ الرحمہ شعرالعجم میں لکھتے ہیں ' کہ

> مرزا نے فن سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا کہ قدماء اور متاخرین کا کلام انتخاب کرکے ایک بیاض مرتب کی جو سخنداں کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہے ' مرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے ' اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے ' لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صحیح تھا ' اس لئے بلند اور نادر اشعار انتخاب کئے ہیں ' اور جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دئے ہیں ' وہی اس کے تمام

دیوان کا عطر ہے ' میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ
حیدرآباد میں دیکھا تھا جو خود مرزا کے ایک شوقین
شاگرد نے ایران میں نہایت اهتمام سے طیار کرایا تھا ' ہر
شاعر کے نام کے ساتھہ اس کے اشعار کی تعداد بھی هندسوں
میں لکھہ دی ہے ' اخیر میں مختصر سی عبارت ہے جس
میں انتخاب کا حال لکھا ہے ' معلوم ہوتا ہے کہ اہل فن
اس بیاض کی نقلیں لیتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھاتے
تھے ' والہ داغستانی نے ریاض الشعراء میں جا بجا اس کے
حوالے دئے ہیں - میں نے اس بیاض کے تین نسخے دیکھے
ہیں جن میں ایک خود میرے کتب خانہ میں ہے -

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے ' کہ اشعار کا انتخاب محض تفریح و دلچسپی کی چیز نہیں ہے ' بلکہ وہ سخن دانوں کے لئے دلیل راہ کا کام دے سکتا ہے ' اور ایرانی شعرا نے اس کو نہایت اهمیت دی ہے -

عربی اشعار کے جو منتخب مجموعے تیار کئے گئے ہیں ' وہ اردو اور فارسی مجموعہاے انتخاب سے بھی زیادہ جامع ' زیادہ مکمل ' اور زیادہ علمی اصول پر مبنی ہیں - سب سے پہلے ابو تمام نے جو بحتری کا حریف اور متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے ' عربی اشعار کا ایک مجموعہ انتخاب تیار کیا ' جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے ' اور فن ادب کی جان ہے - اہل فن کا بیان ہے ' کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے ' خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا - تبریزی شارح حماسہ نے لکھا ہے ' کہ اہل ادب اور اہل ذوق نے اشعار عرب کا جو انتخاب کیا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ' ایک تو یہ کہ پورے پورے قصائد انتخاب کر لئے ہیں ' اور اس قسم کے انتخابات میں

بہترین قصائد وہ ہیں جو مفضلیات کے نام سے مشہور ہیں ' دوسرے یہ کہ قصائد یا قطعات کے صرف جستہ جستہ برگزیدہ اشعار کو انتخاب کر لیا ہے ' اور اس قسم کے انتخابات میں بہترین انتخاب حماسہ ہے ' جس کو ابوتمام نے ایک رئیس کے کتب خانہ کی مدد سے طیار کیا ' اور اس رئیس کے خاندان نے اس کو مدتوں اس کتب خانہ میں نہایت بخل کے ساتھ محفوظ رکھا ' پھر عمان کے ایک شخص نے اس کو اس کتب خانہ سے نکالا اور رفتہ رفتہ اہل ادب میں اس قدر مقبول ہوا کہ انہوں نے اس کے علاوہ اور تمام انتخابات کو نظر انداز کردیا - مقطعات یعنی عرب کے جستہ جستہ اشعار کا یہ بہترین انتخاب حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے -

باب حماسہ—یعنی وہ اشعار جو شجاعت ' جنگ ' اور غارت گری وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں ' اور اس کو ایک محدود معنی میں رزمیہ شاعری کا انتخاب بھی کہہ سکتے ہیں -

باب المراثی—اس میں وہ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں جن میں مشہور و محبوب اشخاص کی موت پر اظہار رنج و غم کیا گیا ہے ' اور ان کے اخلاقی اوصاف بیان کئے گئے ہیں -

باب الادب—یعنی اُن اشعار کا انتخاب جو محاسن اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں -

باب النسیب—یعنی عاشقانہ اشعار اور اسی کو غزل بھی کہہ سکتے ہیں -

باب الاضیاف والمدائح — یعنی وہ اشعار جس میں مشہور اشخاص
کی تعریف کی گئی ہے ، بالخصوص ان کی
مہمان نوازی کے واقعات و حالات بیان کئے گئے ہیں -
درحقیقت مدحیہ قصائد کا انتخاب ہے ، اسی لئے
اس کو باب الاضیاف و المدائح کہتے ہیں -

باب الہجو — اس میں عرب کی بہترین ہجووں کا انتخاب کیا
گیا ہے -

ان کے علاوہ اور بھی چند چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں ، جو بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے -

اردو زبان میں جو انتخابات کئے گئے ہیں ، ان میں آسانی کے خیال سے زیادہ تر مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے ، حالانکہ بہت سے گمنام شاعر بھی خوش گو و نغز گو ہوئے ہیں ، لیکن ان کے کلام کی جستجو میں کسی نے گھر سے باہر ایک قدم بھی نہیں اٹھایا ہے - مگر ابو تمام نے چونکہ نہایت وسیع النظری اور ایمان داری کے ساتھہ اشعار عرب کا انتخاب کیا ، اور ایک رئیس کے کتب خانہ میں بیٹھہ کر ہزاروں کتابوں کے مطالعہ کے بعد منتخب اشعار ڈھونڈھ نکالے ہیں ، اس لئے اس نے اس کے برعکس روش اختیار کی ہے ، یعنی مشہور شعراء کے کلام کو سرے سے ہاتھہ ہی نہیں لگایا ہے ، کیونکہ ان سے تو ہر شخص واقف ہے ، بلکہ ان شعراء کے کلام کا انتخاب کیا ہے ، جو نہایت کم گو غیر معروف اور گمنام تھے ، یہاں تک کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں ، جن کے کہنے والے کا نام ہی سرے سے معلوم نہیں - اب اگر حماسہ اور اردو زبان کے مجموعہائے انتخاب کا موازنہ کیا جائے ، تو صاف طور پر ثابت

هوجائے گا ' کہ اردو زبان میں جو مجموعہائے انتخاب تیار کئے ہیں ' وہ ادیبانہ جد و جہد کی منزلوں سے بہت دور ہیں -

بہرحال ابوتمام کی یہ ادیبانہ جد و جہد کامیاب ہوئی اور اس کے اس انتخاب کو اس قدر حسن قبول حاصل ہوا ' کہ اس زمانہ کے ادباء نے اور دوسرے انتخابات کو بالکل نظر انداز کردیا ' اور حماسہ ابوتمام کا کلمہ پڑھنے لگے ' اور متعدد ادیبوں نے خود بھی اسی طرز پر شعرائے عرب کے کلام کے منتخب مجموعے تیار کئے - چنانچہ اس طرز پر جو مجموعہائے انتخاب تیار ہوئے صاحب کشف‌الظنون نے ان کی تعداد دس سے زیادہ بتائی ہے ' لیکن حماسۂ ابوتمام کی شہرت نے ان کو اس قدر گمنام کردیا ' کہ آج عام طور پر ان کے نام و نشان نہیں ملتے - ان میں صرف ایک مجموعۂ انتخاب کا نام حماسہ ابوتمام کے ساتھہ لیا جاسکتا ہے ' جس کو ابوتمام کے حریف و معاصر بحتری نے ابوتمام کی ریس میں خلیفۂ متوکل کے وزیر فتح بن خاقان کے لئے تیار کیا تھا - اگرچہ یہ مجموعۂ انتخاب بھی حماسۂ ابوتمام کے درجہ کا نہیں ہے ' تاہم اس میں متعدد خصوصیات ایسی موجود ہیں ' جن کی وجہ سے اس کو ایک خاص ادبی اہمیت حاصل ہے ' اور ہم اردو اشعار کے انتخاب میں اس کی تقلید کر سکتے ہیں -

(ا)—اس کی ایک خصوصیت تو یہ ہے ' کہ بحتری نے اس کی ترتیب اہل عرب کے مضامین شعری پر رکھی ہے ' یعنی جن جن مضامین پر شعرائے عرب نے اشعار لکھے ہیں ' ان کو عنوان یا باب قرار دیا ہے ' اور اس کے تحت میں عمدہ اشعار انتخاب کئے ہیں ' مثلاً نفس کو مصائب کے برداشت کرنے پر کیوں کر آمادہ کیا جاسکتا ہے ؟ ننگ و عار سے بچنے کے لئے موت کو کیوں کر گوارا کیا جاسکتا ہے ؟ کون لوگ ہیں

جن کی دوستی پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا - چوں کہ اس قسم کے مضامین بکثرت ہیں اس لئے اس کے ابواب کی تعداد ۱۷۴ تک پہنچ گئی ہے ' اور اس میں شعرائے عرب کے تمام بنیادی مضامین کے متعلق عمدہ اشعار منتخب کرلئے گئے ہیں -

(۲)—دوسری خصوصیت یہ ہے ' کہ اس میں نہایت کثرت سے شعرائے عرب کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے - چنانچہ جن شعراء کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے ' ان کی تعداد تقریباً ۶۰۰ ہے ' اور یہ سب کے سب یا تو جاہلی شعراء ہیں ' یا انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا ہے ' اور جن کو اہل ادب کی اصطلاح میں مخضرم کہتے ہیں -

(۳)—تیسری خصوصیت یہ ہے ' کہ جس قدر اشعار انتخاب کئے گئے ہیں ' وہ سب کے سب عمدہ ہیں اور ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو ذوق سلیم کو ناگوار ہو -

(۴)—چوتھی خصوصیت یہ ہے ' کہ کوئی شعر تہذیب و شایستگی کے خلاف نہیں ہے ' یہاں تک کہ اس مجموعہ میں سرے سے عاشقانہ اشعار کا انتخاب ہی نہیں کیا گیا ہے -

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے ' کہ عربی و فارسی میں جس قدر مجموعہائے انتخاب تیار کئے گئے ہیں ' ان کی بنیاد محض تفریح و دلچسپی پر نہ تھی ' بلکہ ان میں بہت سی معنوی خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا تھا - اس لئے یہ زبان لٹریچر اور شاعری کی ایک حقیقی خدمت تھی ' اور اگر ہم اسی طریقہ پر اس کام کو کرنا چاہتے ہیں ' تو ہم کو اردو زبان کے تمام معروف و غیر معروف شعراء کا کلام نہایت عرق ریزی سے فراہم کرنا چاہئے ' اور صاحب دیوان شعراء کے مطبوعہ و قلمی دواوین کا ایک عظیم‌الشان کتب خانہ جمع کرکے ابوتمام کی طرح ایک

وسیع مدت میں ایک جامع مجموعہ انتخاب تیار کرنا چاہئے ' جس کی جلدیں اردو شاعری کے تمام اصناف پر مشتمل ہوں ' مثلاً ایک جلد میں غزل کے بہترین اشعار کا انتخاب ہو ' ایک جلد میں بہترین قصائد و قطعات منتخب کئے جائیں ' ایک جلد مثنوی کے منتخب و مسلسل اشعار پر مشتمل ہو ' ایک جلد میں بہترین مراثی جمع کئے جائیں ' ایک جلد میں ہجو کے عمدہ اشعار چن لئے جائیں ' ایک جلد ان اشعار پر مشتمل ہو ' جو مناظر قدرت سے تعلق رکھتے ہیں ' ایک جلد میں عمدہ صوفیانہ اور اخلاقی اشعار جمع کئے جائیں - غرض اردو شاعری جن جن اصناف پر مشتمل ہے ' ان سب کے انتخابات الگ الگ جلدوں میں کئے جائیں ' اور منتخب اشعار کے شروع کرنے سے پہلے شاعری کی حقیقت پر مفصل بحث ہو ' پھر ہر جلد پر الگ الگ مقدمے لکھے جائیں ' جن میں اس صنف کی تعریف اس کے لوازم اوصاف اور شرائط کا بیان ہو ' مثلاً غزل کی حقیقت کیا ہے ؟ غزل کے لئے کس قسم کے الفاظ اور کس قسم کے مضامین کی ضرورت ہے ؟ اردو میں غزل گوئی کے کتنے اسٹایل قائم ہوے ' اور ان میں کون سا طرز اصول فن کے مطابق ہے ؟ اسی طرح قصیدہ ' مرثیہ ' ہجو ' اور مثنوی وغیرہ کی حقیقت اور ان کے لوازم و اوصاف پر بحث ہو ' اور اس بحث کے بعد ہر صنف کے صرف وہی اشعار انتخاب کئے جائیں جو عمدہ ' نادر اور بلند ہونے کے ساتھ اس تعریف سے مطابقت رکھتے ہوں ' اور ان پر شاعری کی وہ تعریف صادق آسکے ' جو اس انتخاب سے پہلے کی گئی ہے - اس موقع پر میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے ادبی رسالوں میں شاعر کی حقیقت اور دوسرے اصناف سخن کے متعلق جو مضامین نکلتے رہتے ہیں وہ محض سطحی اور عامیانہ ہوتے ہیں ' اور اس قسم کے عامیانہ مضامین پر اس انتخاب

کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی - ہمارے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے - مولوی محمد الیاس برنی نے اس اصول کے مطابق ایک ابتدائی اور نامکمل کوشش کی ہے ' اور چند خاص اصناف شعر کے متعلق متعدد مجموعہاے انتخاب تیار کئے ہیں ' جن کو بہت کچھ مقبولیت حاصل ہوئی ہے ' لیکن یہ صرف ان اصناف کا مجموعہ ہے ' مجموعۂ انتخاب نہیں ہے - اس لئے اب ہمارا کام یہ ہے ' کہ اس طریقۂ انتخاب کو جس کی بنیاد معنویت پر ہے ' اور بھی زیادہ ترقی دیں ' اور اس قسم کی بلند نظمیں اور نادر اشعار انتخاب کریں ' جن سے اردو شاعری کا کمال ظاہر ہو ' اور اس قسم کے مجموعہاے انتخاب کے تیار ہونے پر ممکن ہے ' کہ آج تک ہم نے اردو شاعری کے متعلق جو تنقیدی نظرئے قائم کئے تھے ' وہ بدل جائیں ' مثلاً آج دلی کے مقابل میں لکھنؤ کی شاعری نہایت مبتذل معلوم ہوتی ہے - لیکن ممکن ہے ' کہ ان ہی مبتذل گو شعراء کے کلام عمدہ اشعار کا اس قدر ذخیرۂ فراہم ہوجائے ' جس کی تعداد شعر اے دلی کے منتخب کلام سے کم نہ ہو - غزل گوئی میں میر صاحب کا درجہ مسلم ہے ' لیکن اس انتخاب میں یہ ممکن ہے کہ مصحفی نیز شعرائے قدیم میں اور بھی کچھہ لوگ ان کی ہمسری کا دعویٰ کرنے کے قابل ہوجائیں - اب تک امیر کو داغ کا حریف و مد مقابل سمجھا جاتا ہے ' لیکن اس انتخاب سے غالباً معلوم ہوجائے گا ' کہ داغ کے اصلی حریف امیر نہیں بلکہ حکیم سید ضامن علی جلال ہیں ' اور ان کو نہ صرف امیر پر ترجیح حاصل ہے ' بلکہ اس انتخاب کے بعد ممکن ہے کہ داغ کے مقابلے میں بھی ان کی ترجیح کا دعویٰ کیا جائے - لیکن اس انتخاب سے بہرحال یہ ظاہر ہوجائے گا کہ اردو شاعری کے دور آخری میں لکھنؤ نے بھی ایک ایسا شاعر پیدا کردیا جس کو شعرائے دلی کی صف میں کھڑا

کہا جاسکتا ہے ' سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ شعرائے دور جدید کے کلام کی بہت سی خامیاں اور کمزوریاں دور ہوجائیں گی ' اور ان کی شاعرانہ ترقی کے لئے اور بھی نئے نئے میدان نکل آئیں گے -

غرض شاعری کے متعلق جس قدر مباحث پیدا ہوچکے ہیں اور جس قدر پیدا ہوسکتے ہیں ' ایک طرف تو سب کا فیصلہ اسی انتخاب سے ہوجائے گا ' دوسری طرف اگر انتخاب کا مقصد صرف تفریح و دلچسپی ہی کو قرار دیا جائے ' تب بھی یہ مجموعہ ہر ذوق شعری کی تسکین کا باعث ہوگا -

هندی زبان اور مسلمانوں کا طبعی میلان

از

(مولوی نورالحسن نیر کاکوروی - بی - اے - ال - بی)

جس طرح انسان کا چہرہ اس کے اندرونی حالت ظاہر کرتا ہے اُسی طرح ہر قوم کا لٹریچر اُس کے عادات و خصائل کا آئینہ ہوتا ہے - عربی زبان کو دیکھئے قوم کی بہادری ' شجاعت ' سخاوت ' خوش خلقی اور اولوالعزمی ' اس کے الفاظ و محاورات سے ظاہر ہے - فارسی زبان کو لیجئے شیراز و صفاہان کی عیش پسندی اور شیریں بیانی ہر فقرے سے عیاں ہے - انگریزی زبان سے اہل فرنگ کی چستی اور چالاکی کا اندازہ ہوتا ہے - اور ہندی زبان کے دلکش نغمے علم موسیقی کے کمالات اور مادر وطن کی کرشمہ سازی کا اعلان کرتے ہیں - سنسکرت اب ہندوستان میں بولی نہیں جاتی اور مدت سے تصنیف اور تالیف کا سلسلہ اُس زبان میں بند ہے لیکن یہاں کی بھاشا کا تمام ملک میں ہنوز ڈنکا بج رہا ہے -

بھاشا کی شاعرانہ خوبیاں

بھاشا کی شاعری میں سب سے بڑی خوبی جس کی وجہ سے اس کو فارسی ' عربی ' اور اردو پر افضلیت حاصل ہے یہ ہے کہ فطرت کے حسب حال اُس میں مرد کا عورت اور عورت کا مرد سے تخاطب ہے - یہی سبب ہے کہ اس زبان میں شاعری کرنے والے کے قلب میں جو ولولے اور جذبے ' عشق ' محبت

اور لطف و انبساط کے پیدا ہوتے ہیں سن و عن سچے ہوتے ہیں اور کاغذ پر آکر قلب کی بالکل صحیح ترجمانی کرتے ہیں - دوسری خوبی زبان بھاشا کی نرمی - اس میں کھلاوٹ اور لوچ ہے - اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ غزل گوئی کے لئے (جس کا حسن اُسی وقت نکھرتا ہے جب اس کی زبان میں نرمی اور طرز ادا میں سادگی ہو) بھاشا زبان جس سیدھے سادے اور نغمہ ریز الفاظ میں اپنی واردات قلبی کو ادا کرتی ہے نہایت مناسب ہے -

مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے هندی زبان کو اپنا نہیں سمجھا اور اس لئے بیگانگی اور بےتعلقی برتی لیکن چند سال ہوئے کہ رسالہ الندوہ میں اُن بےدریغ فیاضوں کا تذکرہ نہایت تفصیل کے ساتھ شایع ہوا تھا جو سنسکرت اور بھاشا کی تالیفات و تصنیفات کی حفاظت و اشاعت اور تراجم کے لئے اپنے عروج و اقبال کے وقت مسلمانوں کے ملحوظ خاطر تھیں - اِس کے علاوہ مسلمانوں نے خود بھاشا زبان میں کیا کیا تصنیفات کیں اور بھاشا کی شاعری میں کیا درجۂ کمال حاصل کیا اس مضمون کا موضوع ہے -

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بھاشا یا بھاکھا کی شاعری جذبات اور تاثرات کا ایک لبریز جام ہے جس کو منھ لگاتے ہی موسیقیت اور ترنم شاعر کے دل و دماغ پر ایسا قوی تصرف کرتے ہیں جو کسی دوسری زبان کو بھولے سے بھی نصیب نہیں ہوا -

عموماً یہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکھا میں شاعری کی داغ بیل ڈالی وہ حضرت امیر خسرو ہیں - لیکن حق یہ ہے کہ اس سلسلے کا پتا آگے تک چلتا

بھاشا کی شاعری کے متعلق عام خیال

ہے - اور تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ مسعود سعد سلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر گزرا ہے مسلمانوں میں سب سے پہلے اُسی نے بھاشا زبان شروع کی۔اور یہ قصہ حضرت امیر خسرو سے دو سو برس پہلے کا ہے - مسعود سعد سلمان کی بابت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہندی میں ایک دیوان لکھا تھا - تذکرۂ مجمع الفصحا کی عبارت شاہد ہے: " الحاصل وے را سہ دیوان بود ' تازی ' ہندی ' پارسی " - ایرانی نکتہ چین والہ داغستانی کا خیال تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی زبان میں اس قدر کمال نہیں پیدا کرسکتا کہ اس میں شاعری کرسکے - لیکن خدا بھلا کرے مولوی غلام علی آزاد کا انہوں نے یہ شبہہ اس طرح رفع کردیا -

" مسعود سعد سلمان گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور میں ہوا تھا - اس لئے ایک ہندی نژاد کا ہندی میں اس درجہ باکمال ہونا کچھہ بعید نہیں " - افسوس ہے کہ کلام ناپید ہے -

حضرت امیر خسرو کی ولادت بارھویں صدی عیسوی میں ہوئی - امیر خسرو نے سنسکرت اور بھاکھا میں جو کمال پیدا کیا وہ محتاج بیان نہیں ہے - مثنوی نہ سپہر میں انہوں نے خود اپنے سنسکرت پڑھنے اور سیکھنے کا ذکر کیا ہے -

افسوس ہے کہ ان کا بھاکھا کا خالص کلام ناپید ہے - صرف وہ اشعار زبان زد خاص و عام ہیں جن میں اُنہوں نے فارسی اور بھاکھا کو سمو دیا ہے - مثلاً

چوں شمع سوزاں چوں ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

حضرت خسرو کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے جس میں انہوں نے فارسی ، ترکی ، هندي اور عربی کے الفاظ جمع کئے ھیں -

موو میاں چھوٹکی نمل

فارسی ترکی هندي عربی

حضرت خسرو کی شخصیت هندي ادب میں مسلم ہے اس لئے زیادہ حالات اور کلام نہیں لکھا جاتا ہے البتہ مکرنیوں اور بابل کے موجد ہونے کی وجہ سے کچھہ مکرنیاں ہدیۂ ناظرین ھیں - اور بابل آپ کی بہت درد انگیز اور محشر خیز ہے اس لئے اس کو بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے :—

نبولی کی پہیلی

تروو سے اِک تریا اُتری اُس نے بہت رجھایا
باپ کا اُس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھہ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

آئینہ کی پہیلی

فارسی بولی آئینہ ترکی سوچی پائی نا
هندی بولتے آرسی آئے منہ دیکھو جو اسے بتائے

ناخن کی پہیلی

بیسوں کا سر کاٹ لیا نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے
دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے

بانس کا مندر وا کا باسا ' باسے کا وہ کھاجا
سلگ ملے تو سرپر واکھیں وا کو راو راجا
سی سی کرکے نام بتایا ' تا میں بیٹھا ایک
اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال
عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

مکرنی [۱] ۱—سگری رین موہے سنگ جاگا | بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا | اے سکھی ساجن' نا سکھی دیا
مکرنی ۲—سرب سلونا سب گن نیکا | وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہو وے کون | اےسکھی ساجن ' ناسکھی لون
مکرنی ۳—وہ آوے تب شادی ہوئے | اُس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول | اےسکھی ساجن' ناسکھی ڈھول

اَنمل—کھیر پکائی جتن سے - چرخہ دیا جلا - آیا کتا کھا گیا -
تو بیٹھی ڈھول بجا - لا پانی پلا -

اسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انھیں کا ایجاد ہے -

ڈھکوسلا—بھادوں پکی پہیلی ' چو چو پڑی کپاس - بی مہترانی
دال پکاؤ گی ' یا ننگاھی سو رہوں -

چوبیری

اوروں کی چوبیری [۲] باجے چھوکی آٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے نہیں آئیں سارے شہری

---

[۱]—مکرانیوں کے موجد تھے -

[۲]—بادشاہ کے ہاں اس زمانہ میں چوبیری نوبت بجا کرتی تھی -

صاف صوف کر آگے راکھے جس ناھوں توسل
اوروں کے جہاں سہلک سماوے چھوٹے وھاں موسل

ملذما

سکھی بابا لے موری کاھکو بیاھی بدیس -
ھمتو ھیں توری بیلے کی کلیاں ' گھر گھر مانگی جائیں - ھمتو ھیں توری کھونٹے کی گیاں ' ھانکو جدھر ھلکنجائیں - ھمتو ھیں توری انگنا کی چڑیاں - دور جائیں اڑ جائیں -
میکے میں توری لاڈلی بیٹی - میکاھی بیاھا رچاو -
بھائیوں کو دینا محلے دو محلے ھم کو دیا پردیس - سونا بھی دینا روپا بھی دینا - دینا رتن جڑھاو رے - ایک نہ دینی سر کی رتلگی ساس نند موری بول رے -
طاقوں بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں - چھوڑا سہیلیوں کا ساتھ ری - آنبوا تلے سے ڈولا جو نکسا - کوئل کوک سناو رے - کوکیں بھری موری کاری کوئلیا -
ھم چلے پی کے دیس رے - نلکے پیوروں مرا بابل جو گاڑا - سہدھی ڈولا تھا تب رے - ڈولے کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا - آپا پرایا دیس رے -
مھری چچی مھرے محلوں کی رانی ھم توری باندی گلام رے - آمھر خسرو یوں مکھ بولے جم جم رھو سہاگ رے -

---

کبیر—رامانند کا سب سے لیق اور مشہور چیلا تھا - کہتے ھیں کہ کبیر جلاھا تھا اور مسلمان بھی -

لیکن ایک روایت اس کے متعلق یہ بھی ہے کہ وہ کسی بیوہ برہمنی سے پیدا تھا اور اُس برہمنی نے کتمان حق کی خاطر کبیر کو کسی تالاب میں پھینک دیا تھا - کسی جولاہے کی نظر پڑ گئی اُن دونوں میاں بیوی نے اس کو نکالا اور گھر لاکر اس کی پرورش کی - چونکہ اس کا کوئی رہبر (گرو) نہ تھا اس لئے وہ رامانند کا شاگرد (چیلا) بنگیا -

سکندر لودھی بادشاہ نے لامذہبیت کے سبب اس کو قید کیا - بعد کو رہا ہوا اور مگہر ضلع گورکھپور چلا گیا وہیں مر گیا - شاعرانہ حیثیت سے کبیر کا درجہ بہت ممتاز ہے - بنارس میں کبیر چورہ کے مقام پر اس کی کل تصانیف موجود ہیں -

دوھرا

دین گنوایو دُنی سے دُنی نہ آیو ساتھ
پھر کلہاڑی ماریوگا پھل اپنی ہاتھ
کبیر سریر سرائے دنیا ہے کیوں سوے سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

ان کا کلام مقبول خاص و عام اور زبان زد خلائق ہے اس لئے صرف ایک دوھرے پر اکتفا کی گئی -

زمانۂ قدیم میں ابو معشر فلکی نے دس سال ہندوستان میں رہکر سنسکرت کے علوم و فنون حاصل کئے -

ابو ریحان بیرونی نے سولہ برس کی محنت اور جانفشانی کے بعد سنسکرت میں کمال پیدا کیا اور ہندوؤں کے علوم و فنون پر مفصل اور مبسوط کتاب لکھی -

فیروز شاہ نے کتابوں کا ترجمہ کرایا -

دربار اکبری نے سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کرانے میں شاہانہ فیاضیاں دکھائیں -

شہزادۂ دانیال کو ہندی زبان کے ساتھ دلچسپی تھی -

آزاد بلگرامی نے ہندی صنائع و بدائع پر مضامین لکھ کر اپنی طباعی اور علمی قابلیت کا ثبوت دیا -

قاسم فرشتہ نے اختیارات قاسمی لکھ کر ہندوں کے علم طب (ویدک) کو زبان فارسی میں منتقل کیا ' اس کا ثبوت ان کی کتابوں سے مل سکتا ہے - اگرچہ یہ واقعات زمانۂ حال کے تعلیم یافتہ ہنود کے کانوں تک نہیں پہونچے لیکن مسلمانوں کی علمی انجمن کے پارینہ افسانے خیال کئے جاتے ہیں - اور اسی لئے ہم ان کو از سر نو دوہرانا پسند نہیں کرتے -

لیکن ایک عام غلطی کا ازالہ ضروری تصور کرتے ہیں ' عام خیال یہ ہے کہ شاہان ہند میں سب سے پہلے اکبر بادشاہ نے ہندو پنڈتوں کو دربار میں شرف حاضری بخشا اور سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کرائے - حالانکہ شہنشاہ اعظم اکبر سے پیشتر سلطان زین العابدین نے اس علمی صیغے کا بنیادی پتھر رکھا تھا - امتداد زمانہ کی وجہ سے کلام ناپید ہے -

ملک محمد جائسی

ملک محمد جائسی نے حضرت امیر خسرو کے بعد شیر شاہی دور میں آنکھیں کھولیں - صاحب پدماوت کی شہرت ہندی ادب میں مسلم ہے - سنہ ۱۵۴۰ع میں مثنوی پدماوت تصنیف کی - جو اب بھی موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے - نکتہ شناسوں کا دعوی ہے کہ قدرت زبان اور سادگی بیان کے لحاظ سے مثنوی پدماوت کسی طرح راماین سے کم نہیں ہے -

ملک صاحب موصوف کبیر کی تعلیمات سے متاثر تھے - راجہ صاحب امیٹھی ان کی بہت آؤ بھگت کرتے تھے - امیٹھی میں ان کا مزار مرجع خلائق ہے -

پدماوت کے سوا دو کتابیں اکھراوٹ اور دوسری کا نام معلوم نہیں بھاشا زبان میں لکھیں تھیں جن کے زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت نہیں آئی - افسوس ہے کہ کلام بے حسی زمانہ کے سبب مفقود ہے۔ اکثر مقامات پر تلاش کی گئی لیکن نہ مل سکا -

بیشک اکبر کے زمانے میں ہندی کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وزراء ، صالدین اور شہزادگان تک ہندی زبان میں شاعری کرنے لگے - شہزادۂ دانیال کے ضمنی تذکرے میں تزک جہانگیری اس بات پر روشنی ڈالتی ہے -

" بہ‌نغمۂ ہندی مائل بود - گاہے بزبان اہل ہنود بہ اصطلاح ایشاں شعر می گفت " -

عہد جہانگیری میں فواصی نام ایک شاعر تھا جس نے طوطی نامے کو جو نثر میں تھا اس طرح نظم کیا تھا کہ شعر کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا ہندی میں تھا -

ملا نوری ایک کہن سال بزرگ تھے قصبۂ اعظم پور کے قاضی زادوں میں اُن کا شمار تھا - فیضی سے ان کا بہت یارانہ تھا - وہ جو کچھ کہتے فارسی میں کہتے تھے لیکن کبھی کبھی ہندی کے باغ کی بھی آبیاری کرتے - ریختہ (اردو زبان) کی ترکیبیں بھی ان کے کلام میں اکثر ملتی ہیں - چنانچہ تذکرۂ شعرا میں میر حسن نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے -

هر کس که خیانت کند البته بترسد

بیچارۂ نوری نه کرے هے نه ڈرے هے

اکبری اور جہانگیری حکومت میں سب سے زیادہ اس فن میں جس شخص نے شہرت اور ناموری حاصل کی وہ شیخ شاہ محمد تھے - جن کی عرفیت فرملی تھی - ان کا وطن قصبۂ بلگرام تھا - ایک دن شکار میں اپنے ساتھیوں سے چھٹ کر راستہ بھول گئے - چلے جاتے تھے که ایک هندو لڑکی سے ملاقات هوئی اس کی بذله سنجی اور حاضر جوابی پسند آئی اپنے ساتھ حصار لے گئے اور اس کی تربیت کی - چنانچه اکثر دوهے اور کبت نیز لڑکی (چمپا نامی) سے سوال اور اس کے جواب ان کے کلام میں بہت مقبول هیں -

سوال شاہ محمد :—کم درگ ٹھُوی سنار - لیکن نہیں پکھار -

جواب لڑکی :—جم آیو بھایو نہیں - ملن هتی تو درس بن -

سوال شیخ :—جل تھن بھر اگ رپ هارے باهن سوے -

چلیا دئی پر هٹاے یه جوری تہاری هوے -

جواب چمپا :—روپ کلو اون جگ هسن تجئے کم کی کہاد -

هوں تہ پوچھوں ساہ یه کہاں بساے بہاد -

شیخ صاحب کے اشعار اور کبت نہایت کثرت سے غلام علی آزاد نے سرو آزاد کے دوسرے حصے میں نقل کئے هیں - نیز طور کلم میں بھی اس کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود هے -

خانخاناں	دور اکبری کا مشہور و معروف هندی شاعر عبدالرحیم خانخاناں سنه ۱۵۵۳ع و سنه ۱۶۲۷ع میں هوا هے -

وہ بیرم خاں کا لڑکا تھا - بیرم خاں کی کمک سے اکبر کو عہد

طفلی میں نعمت و تاج حاصل ہوا تھا نہ‌خدا اس کا حق اکبر نے دونوں (باپ بیٹوں) کو یہ دیا کہ ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا - عبدالرحیم دربار اکبری کا گل سر سبز اور اس کے نورتن کا ایک رتن خیال کیا جاتا تھا - تزک جہانگیری میں لکھا ہے "خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائی روزگار بود زبان عربی ' ترکی ' فارسی و ہندی میدانست و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتیٰ کہ علوم ہندی بہرۂ ذاتی میداشت ' بزبان فارسی و ہندی شعرنیکو میگفت" -

وہ عربی ' فارسی ' سنسکرت اور ہندی ادبیات کا بڑا ماہر تھا - اور ہندی کے مشہور شاعر گنگ کوی کا مربی بھی - علاوہ اس کے وہ سیرچشم مشہور بھی تھا - چنانچہ ذیل کا مقولہ اسی کے زبانی ضرب‌المثل ہو گیا -

نقل :-" خانخاناں کھانے میں بطانہ " یہ پوشیدہ احسان کرنے پر بولا جاتا ہے - ان کا تخلص رحیم اور رحمن تھا -

اُن کے دوہے بہت ہیں ملاحظہ ہوں -

جو بھاوے سو کر للا اِنہیں بساندہ یا چھوڑ
ہیں توہے سو برن روپ کے اے مورے درگ چور

اگرچہ یہ دوہا معیار تہذیب سے بہت گرا ہوا ہے لیکن خوبی بیان اور طرز ادا نے مجبور کردیا کہ درج کیا جائے -

رحمن دھاگا پریم کا جن توڑو چٹکائے
توڑے پہ جڑے نہیں بیچ گانٹھ پڑ جائے

جے رحیم تن من دیو ' کیو ہردے میں بھون
تاہے دکھ سکھ کہے کی رہی کتھا اب کون

بالم تـوا نکـریاں اُلٹ سبھاؤ
الٹ پیٹھ ملجھیاں ار میں گھاؤ

برہ بری لکھ جُوگنو کہہ آئی کے باو
آرے اُو بھج بھمکرے برست آج انگار

اس میں شبہ نہیں کہ تیموری سلاطین بھاشا کی شاعری کی عزت افزائی اور قدر اسی طرح کیا کرتے تھے جس طرح وہ اپنی شاہی زبان فارسی کی - اسی سبب سے ہندی بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی جاتی تھی - عہد جہانگیری میں راجہ سورج سنگھ نے جب کسی ہندو شاعر کو دربار میں پیش کیا اور اُس نے اچھوتے مضمون کی ایک نظم شہنشاہ جہانگیر کے سامنے پڑھی تو بادشاہ نے بےچوں ہوکر اس کو ایک ہاتھی انعام میں دلوایا - چنانچہ تزک جہانگیری میں یہ واقعہ لکھا ہے - '' ایں تازگی مضمون از شعرائے ہند کم بگوش رسیدہ بہ جلدوے ایں مدح فیلے باو مرحمت کردم '' -

تزک جہانگیری میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ہندی کے وہ اشعار جن کا مطلب یہ ہے '' کہ اگر آفتاب کا کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی - اس لئے کہ جب آفتاب گہن میں آتا تو اس کا بیٹا اس کی قائم مقامی اور ضیا پاشی کرتا - اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ حضور (جہانگیر) کے والد (شاہ اکبر) کو خدا نے ایسا بیٹا عنایت فرمایا کہ اس آفتاب عالمتاب (اکبر شاہ) کے انتقال کا رعایا برایا پر کوئی اثر نہیں ہوا '' - اسی کو جہانگیر بادشاہ نے فارسی میں ترجمہ کرایا -

اشعار فارسی یہ ھیں :—

گر پسر داشتے جہاں افروز　　شب نہ گشتے ھمیشہ بودے روز
زاں کہ چوں او نہفت افروز　　بہ نمودے کلاہ گوشۂ پسر
شکر کن بعد اوچناں پدرے　　جا نشیں گشت ایں چنیں پسرے
کہ زشلنقار گشتن آن شاہ　　کس بماتم نکرد جامہ سیاہ

تحقیقات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی تصانیف کے ساتھ مسلمانوں کی دلچسپی اس درجہ پر پہونچ گئی تھی کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابیں ازبر یاد کیا کرتے تھے - تذکرۂ ہفت‌اقلیم میں ہے کہ میر ہاشم محتشم مہابھارت کے صفحے کے صفحے زبانی سنایا کرتے تھے - " امروز در ہند است ، تمام کتاب مہابھارت راکہ مستجمع اسامی غریبہ و حکایات است در ذکر دارد " -

اس مسئلے میں حیرت انگیز امر یہ ہے کہ شہنشاہ غازی اورنگ زیب کو لوگ نہایت متعصب کہتے ھیں اور عام خیال یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے علوم و فنون اور زبان سے بےحد متنفر تھا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے زبان بھاشا میں جس قدر اس کے زمانے میں توجہ کی اس کے پیش روون کے زمانے میں نہیں کی تھی -

دیکھئے ایران کا مشہور شاعر ضمیر تھا وہ دور عالم گیر ھی میں ایران سے آیا اور شاہی منصب دار مقرر ہوا - اُس نے بھاشا میں انتہائی کمال حاصل کیا - گو وہ زبان بھاشا اور سنسکرت کا صحیح تلفظ بھی نہیں ادا کرسکتا تھا ، تاہم ایسا مشاق ہوگیا کہ اس میں برجستہ اشعار کہا کرتا تھا - اور ہندی راگ کی مشہور کتاب پارجاتک کا ترجمہ اس نے فارسی میں کیا - مولوی غلام علی آزاد نے یدبیضا میں اس کے حالات لکھے ھیں اسی تحت میں عبارت ذیل بھی لکھی ہے :—

" در عهد عالم گیر بادشاه از ولایت ایران به هند آمده و در سلک منصب داران شاهی انتظام داشت - وبا وجود آنکه به هند آمدہ زبان این ولایت آموخت - امّا بواسطۂ جدت ذهن در نظم هندی طبع اوآنقدر دخیل شد که از جمله استادان فن برآمد - زبانش به تلفظ این زبان خوب نمیگردید - امانظم او بسیار پخته واقع میشد - ترجمۂ پار جاتک در فن قصه نغمات هندي از وست - در هندی پلتهی تخلص میکرد " -

شہنشاہ عالمگیر هی کے دور حکومت میں ایک شاعر گزرا ہے جس کا تخلص دانا تھا اس کے بارے میں یدبیضا میں مولوی غلام علی آزاد اس طرح لکھتے ہیں :—

" نظم هندي بسیار خوب گفته "

دور اورنگ زیب عالمگیر میں بھاشا کی زباندانی اور شاعری کا چسکا لوگوں کو اس قدر پڑگیا تھا کہ بڑے بڑے علماء متشرع اور حضرات اولیا اور صوفیا اس میں کمال پیدا کرتے تھے -

شیخ غلام مصطفیٰ کمبھوهی جن کا تخلص انسان تھا بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں - ان کا وطن مرادآباد تھا - تحصیل معقولات حضرت ملا قطب‌الدین سہالوي (جد بزرگوار حضرت مولانا بحرالعلوم) کي خدمت بابرکت میں کی - اکتساب فن حدیث محدث دهلوي کے خاندان سے کیا - تصوف میں ان کے هادي شیخ جان محمد شاهجهان‌آبادي تھے - علم طب ' تنجیم ' خطاطی ' فن سپه گري ' غرض سب چیزوں میں کامل و اکمل تھے عهد عالمگیري میں منصبداري کے عهدۂ جلیلہ پر مامور ہو کر صوبۂ دکن گئے اور تھوڑے دنوں کے بعد مستعفی هو کر پلٹ آئے - سنہ ۱۱۴۲ھ میں بمقام ایلچپور وصال هوا -

هندی زبان اور بھاشا کی شاعری میں ان کا درجہ مولوی غلام علی آزاد کی عبارت ذیل سے معلوم ہو سکتا ہے - "علم هندي بخشینگے که اکثر براهمه حل فوائض از خدمت شیخ میکردند - و شعر هندی نیز خوب میگفت - صنادید شعرائے هندي در حضور او سرخروی اوردند و اصلاح کبت و دوها میگرفتند -

علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی - آپ حسینی واسطی سید ہیں اور مولوی غلام علی آزاد کے نانا بھی - سن ولادت سنه ۱۰۷۱ھ ہے - حضرت علامہ شیخ نورالحق ابن شیخ عبدالحق محدث دهلوی کے شاگرد رشید تھے - تفسیر ' حدیث ' فقه ' لغت ' تاریخ اور موسیقی میں کامل تھے - هندی زبان کے ممتاز شاعر تھے - هندی بھاشا آپ نے هری بلهی مصر بلگرامی سے پڑھی - فارسی قصیدوں میں بھی کبھی کبھی بھاشا بول جاتے ہیں -

سورٹھا

کہوں کہاں لو بھید پیارے تیرے چرن کے
جانےان چھانی چھید چھن بچھرت جاکے ہرے

بروا

تلک دیسا کے چتے مور بچاؤ جل اوپر چھونٹی کو تنکو هی ناؤ

بروا

بھوکت لکھ من تھا کہو نہیں آپاؤ برھمن کا ہے نه بیوے انتی نساؤ

ایک فارسی قصیدے میں لکھتے ہیں -

اسیس دے کے کہے هندوی میں یوں سمت
رهے جگت میں اجل هاس یه وزیر سدا

سنه ۱۱۳۸ھ میں بمقام دهلی دنیا فانی سے راهی ملک بقا ہوئے -
ان کے علاوہ اور بہت سے باکمال گزرے ہیں جن کو بھاشا زبان کی انشاپردازی

اور شاعری آل تمغا ہوئی - اور جن کے حالات مختصر تذکروں میں مل سکتے ہیں - کیا ان واقعات کے بعد بھی یہ شک قابل قبول ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ہندی لٹریچر پر توجہ نہیں کی اور جو کرتا وہ کافر کہلاتا تھا - بھاشا کی سریلی صدائیں اس قدر سرور انگیز تھیں کہ محمد شاہ کے زمانے میں جب راجہ جےسنگھ نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے رصد خانہ قائم کیا اور فن ریاضی میں بڑا اہتمام و انتظام کیا تو علماء اسلام نے اس کے حکم سے چغملی کی شرح اور بعض دوسری کتابوں کا ترجمہ بھاشا زبان میں کیا - چنانچہ سبحۃالمرجان فی آثار ہندوستان میں مولوی غلام علی آزاد نے خوب لکھا ہے -

"ہندوستان کے علماء نے جےسنگھ کے حکم سے شرح چغملی اور دوسری کتابوں کا جو علم ہیئت و ہندسے میں تھیں ' عربی زبان سے ہندی میں ترجمہ کیا " -

شرح چغملی اس قدر دشوار کتاب ہے کہ آج تک اس کا ترجمہ اردو میں کوئی صاحب نہ کرسکے ' اسی سے قیاس کرنا چاہئے کہ علماء کی بھاشا دانی کس پائے کی تھی کہ انہوں نے ایسی مشکل کتاب کا ترجمہ کیا - یہی زمانہ تھا جب سید غلام علی بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کے علم و ادب میں چار چاند لگا دئے - انہوں نے اکتساب سنسکرت کی خاطر بنارس کا دور دراز سفر کیا اس لئے کہ اس زمانے میں ریل نہ تھی - اور وہاں رہ کر اس کو درجۂ کمال پر پہونچایا -

ہندی راگ راگنی میں اس درجہ کمال پیدا کیا کہ لوگ ان کو نایک کہنے لگے -

انہوں نے فن موسیقی کے متعلق بھی دو کتابیں تصنیف کی ہیں - ایک ناد چندرکا اور دوسری مدھنایک سنیکا - بھاشا میں ان کا تخلص مدھیانگ تھا -

کلام کا نمونہ یہ ہے -

جو چترا نن چت چڑھے ' نیہ بڑھے ' بدھم بیداُن گرنتھن گاے -
بہارنی بھوری کری بہرین ' جپ ' جوگلی ' جوگ اتھ گنائے -
جو مکھ جوت جگی ' تہکی مدھلاپک گھونگھٹ چلچل نائے -
جھلین دوکول چھے ' جھلکی ایکچھ براجت آچھ رجھائے -

خلاصہ اشعار کا یہ ہے کہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر جھلکی خوشنما معلوم ہوتی ہیں - اس کی خوبی نہ فرشتوں کے وہم و گمان میں پیدا ہوسکتی ہے اور نہ کتب آسمانی میں ان کی تعریف دکھائی دیتی ہے - گویائی کی طاقت خود محو حیرت ہے اور زاہد مرتاض عبادت الہی سے زیادہ اُس کا مدح خواں ہے - نقاب ان کی آنکھوں کی خوبصورتی اور ان کے حسن کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتی بلکہ باریک دوپٹا جو اس وقت اس پر زیب دے رہا ہے اس کے حسن کو اور دوبالا کئے دیتا ہے - ہم ان کے اتنے ہی کلام پر بس کرتے ہیں -

سید رحمۃاللہ ' سید خیرالدین بلگرامی کے صاحبزادے تھے - سنہ ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوئے بہت بڑے فقیہ اور عالم تھے - اور بھاشا زبان کے بڑے مانے ہوئے استاد سلطنت کی طرف سے دو صدی منصب اور جاگیر مقرر تھی - اس زمانے میں بھاشا کا مشہور شاعر چنتامن تھا - اس کا ایک شاگرد سید رحمت‌اللہ کا شہرہ سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چنتامن کا دوہا سید صاحب کے سامنے پڑھا :—

" ہیو ہرت ارکرت ات چنتامن چین
وامرگ نینی کے لکھے واھی کے سے نین

سید رحمت‌اللہ نے اس دوہے میں غلطی نکالی - جب چنتامن نے اپنی غلطی سنی تو اس کو تسلیم کر کے اس کی اصلاح کر دی- چنتامن

نے سید صاحب موصوف کی مدح میں ایک دوھا بھی لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے :—

گرب گھ سنگھ، جھون سبل کل گاج من، پربل باج دل ساج دھایو
بجت اک جمک، گھر گھنگ دندبھون کی، ترگ کھر دھمک بھوتل ھلیو

ان کی نظموں کا مجموعہ بھاشا زبان میں ہے - جس کا نام چوبھم پرکاس ہے - آزاد بلگرامی نے ان کا کلام بہت جمع کردیا ہے - دو ایک دوہے ہدیۂ ناظرین ہیں -

دوھا

کاری ستکاری کری کھری سرس سکمار
لوٹن ھاری جگت کے لوٹن ھاری بار

بروا چھند

الہ نام پوتھی پر لکھی اتھ بھاے
جھون جراے کونیکو بھال سہاے

ایضاً

چکھ جوگی کلتھاگرین، ارن، سہام اور سیت
آنسو بوند سیمرن لین درشن بھچا ھیت

مطلب یہ ہے کہ آنکھیں ایک ریاضت کیش جوگی کے مثل ہیں جو سرخ، سیاہ، سفید دانوں کی مالا پہنے ہوئے اور آنسوؤں کی تسبیح لئے ہوئے دیدار کی بھیک کی طالب ہیں - یہاں آتش کا ایک شعر پڑھنا لطف سے خالی نہیں ہے جو ہم‌آہنگ ہے اس دوہے کا -

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

دوہا

کر اُچائے ' جسہائے تہہ دھاری بھیج یہ بھائے
سلو چھلا ودی چمک ہوئی گرے بھوم پر آئے

سید رحمت‌الله نے ۱۳ تاریخ ربیع‌الاخر سنہ ۱۱۱۸ھ میں وصال الی‌الحق فرمایا -

سید غلام نبی ' بلگرام کے باشندے اور سید عبدالجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے - سنہ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے ان کے ماموں اس زمانے میں شہنشاہ غازی اورنگ‌زیب کے ہمراہ دکن پر لشکرکشی کر رہے تھے - بھانجے کی خبر ولادت جب کانوں تک پہونچی تاریخ سال ولادت کی فکر دامنگیر ہوئی اسی فکر میں سوگئے اور خواب میں یہ مادۂ تاریخ نکلا -

ع : نور چشم باقر عبدالحمید

علامہ موصوف کی یہ پیشین‌گوئی تھی کہ یہ لوکا شاعر ہوگا - خدا کی قدرت یہ پیشین‌گوئی صحیح نکلی -

اگرچہ عربی ' فارسی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے ' لیکن بھاشا کی شاعری میں حد درجے کا کمال تھا - بھاشا میں آپ کا تخلص درس لین تھا - جس کا لفظی ترجمہ معنو دیدار ہوسکتا ہے -

میرزا مظہر جان‌جانان جیسے باکمال بزرگ نے بھاشا کی شاعری میں آپ ہی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا - فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے - نواب صفدرجنگ کی رفاقت میں سنہ ۱۱۶۳ھ میں جنگ افاغنہ کے معرکے میں جام شہادت نوش فرمایا - مولوی آزاد بلگرامی سے رسم اتحاد بہت تھی اس لئے انہوں نے تاریخ کہی -

ع : رقم کرد ہے ہے غلام نبی -

آپ کی تصانیف سے رس پربودھ النکار ' نکھشک درپن کتابوں کا پتا چلتا ہے - لیکن آپ کا اصلی شاہکار رس پربودھ النکار ہے - یہ علم بدیع پر بہترین کتاب ہے - نمونۂ کلام ملاحظہ ہو -

لالا مری بیٹھتی چھتے یہ من ہوت بچار
کوئل مکھ سکھی ناسکت پیا چتوں کو بہار

ایضاً

پیتم چلے کمان جو کو گوسا سونپ کے
میں کری ہوں قربان جب پائے ہوں

ایضاً

" توحید " تہری مئورتھ کو ہوت ہے سبھن لوک تون ہی ہوئی آکاش کرت نکھت اودت ہے -

تون ہی چارو تکو سھل تر پس پلچھی ہوت ' تون ہی میکھ بوجی کوت اور اکوت ہے -

تون ہی بن ناری بھرتا کی رسلھن ہوت ' تون ہی ہوے کے سکر لسیمپ اپن تھن لوت ہے -

جاگ پریں جھونتوں جھوں سبھن لوک ہوت ' تھوھی آتما بچاری لوگ جاگت کو ہوت ہے -

---

شاہ کاظم قلندر تکیۂ کاظمیہ کاکوری کے بانی سنہ ۱۱۵۷ھ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد حضرت شاہ محمد کاشف قلندر نے بیٹے کو معرفت فی زھد و ریاضت ' علم و فضل اور خانقاہ میراث میں دیا - حضرت شاہ کاظم قلندر حضرت شاہ باسط علی قلندر کے مرید اور خلیفۂ تھے ان کا مزار تمگرہ ضلع الہ آباد میں اب بھی مرجع خلائق ہے- ہندی میں ماہر تھے -

آپ کی ایک مطبوعہ ضخیم کتاب نغمات‌الاسرار معروف بہ شانت رس موجود ہے جس میں ان کی ٹھمریاں ، دوہے وغیرہ سب موجود ہیں - یہ کتاب اس قدر ٹھوس ادبی مجموعہ ہے کہ آج بہت کم لوگ اس کو سمجھ سکتے ہیں - چنانچہ چند ٹھمریاں نذر ناظرین ہیں -

ہجر و درخواست وصل و مناجات

دلدار دلم بردی و در بزم نمی آئے -
جی ترسے درسنکا یہہ کب لو غم کھائے
بے مہری تــا کے کنی از عاشق بیچارہ
پیارے جو درسن جی جائے بن پائے مر جائے
چــہ بــود بقدمت چــوگدارا بنوازی
تک آو دیا کرکے کہاں ایسے چرن پائے
باشم نگران وصل ترا ہر شب اے ماہ
جر جر کٹے دن کہتی کا ہمری بسرآئے
در بزم تو کاظم برسد روز و شب افسوس
ہم پونہچیں سیہا بیچ یہہ کب اوسر آئے

در بیان عشق در مجازے و عبرت بحقیقت

سکھی موہے اب نیہر نہ سہاے آئے پونہچے دن گونی کے
ہویکے بیکانے نیہر کے ہمکا پیــا جب پٹھوؤ بــولاے
سنگ چلے کو ہمیں اکیلے پیــا تین ملیــو جــاے
دیکھے پیا میں بلی دلہنہ کیسی جیــو یہــہ ســوچ ڈراے
ہونیہوں نر گنی نار پیا کو کا مکھہ دیکھون دیکھائے
سسرا کہاں جہاں پیو ہی نیہروا یہی جگ جــانو بلــاے

کونے بھرم جگ نیہر سا   پیو کو جو دیکھساں بھولاے
بھاگ بڑے کاظم کے ھین جلکا   پیو سا نیہر آے
اون کون بن پیو پایو جگما   جگ جیو کیو رہو پیما سماے

ٹھمریاں

در دفع اوہام باطلہ و اطلاع بکمال قرب

اري سکھی کوي موھے دیو بتاے
کونے نگر پیا مور بست ھے
یاھی کھوج میں بھس گئی سب
درس نپاے ھاے
کولی نہاوت دور نپٹ ھے
کوئی کہے نکٹ بلاے
سوجھہ پرے نہ پیا موھے نیرے
دور سکے کو جاے
واکی نگر کی نگری کوی پھونچے
سن لے ھمسے آے
دور کہی جن پیا کی نگریا
اون دیا تو ھے بھرماے
تھسی تو پیو سی بیچ نہیں کچھہ
بار نہ بیچ سماے
بھرم چھانڈ لے گیان کاظم تیں
کچھہ دن نیہہ لگاي
پیو پاوے آپ میں آپکو پیامون
جاے وہ بھرم ھراے

در پند و نصیحت آمیز مناجات

جاگ ہوے کی نین کھول کونی نیند آے
پیا نہوے سنگ کیسے نیندیا سہاے
دن تو گئے کہاے کہاے رین گئی سوے سوی
بیس گئی کہوے کہوے ہاے ہاے
آبہوں سب سے توز توز جوز جوز آسون نیہہ
نئی نئی چھٹین دیکھہ آے آے آے
دیت ہمیں بھولاے سبہی مرت لوک آئے
آے دیں نہ دیہہ ٹہیں بہولاے جاگو دی نہ دتن بہولاے
دھیان سیکھہ آو سادھن سنگ بیٹھہ بیٹھہ
ہمت سے بیہج نام پیکو کنٹھہ لے لگاے
بنتی کروں سانجہہ بہور عرض کروں ہاتھہ جور
اوگن لکھہ مور پیا مکھہ نہ لے چھپاے
واری واری جاے باسط پسر کاظم
دگرو بتاے دیہو رھو سہاے

حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی سنہ ۱۱۷۳ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے ' تحصیل علوم ظاہری و باطنی حضرت مولانا محمد فخرالدین دہلوی سے کی - انیس سال کی عمر میں مولانائے دہلوی کے دست حق پرست پر بیعت کی - پھر مرشد کی اجازت سے بانس بریلی چلے گئے کچھہ دنوں کے بعد رام پور مراجعت فرمائی اور وہاں حضرت شاہ عبداللہ بغدادی سے بیعت کی - اور ستتر سال کی عمر میں راہی ملک عدم ہوئے - کسی شاعر نے اُن کے وصال کی تاریخ ایران سے لکھہ کر بھیجی تھی یہاں خوف طوالت کی وجہ سے نظر انداز کی جاتی ہے -

شاہ صاحب موصوف صرف عالم باعمل ہی نہ تھے بلکہ بہت بڑے صوفی مشرب شاعر بھی تھے - جہاں انہوں نے فارسی اور اردو میں گل بوٹے کھلائے ہیں وہاں ہندی گیان دھیان کے چٹکلے بھی پیش کئے ہیں جو ہم نذر ناظرین کرتے ہیں :—

ہولی

صُمٌ بُکمٌ عُمیٌ ہوکے حق سے دھیان لگاؤ جی
بھرنگی کی سرت جما کے اپنی آپ گماؤ جی
پاک منزہ پورے ہو سبحانی گن گاؤ جی
نیاز کہا جب اللہ کو کون رہا فرماؤ جی

ایضاً

جوگنیاں کا بھیس بنائے کے پی کو ڈھونڈن جاؤں
نگری نگری دوارے دوارے پی پی بلند سناؤں
درس سبھ کاری جگ مان ہو کے درشن بھیچھا پاؤں
تن من جوبن اُن پر واروں تب میں نیاز کہاؤں

شاہ صاحب موصوف کی ایک بہت ہی پردرد اور قیامت خیز بابل بھی ہے لیکن بڑی کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکی -

حضرت شاہ تراب علی قلندر فرزند ارجمند حضرت شاہ کاظم قلندر بمقام کاکوری سنہ ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے - تحصیل علوم ظاہری اور باطنی اپنے والد صاحب حضرت عارف باللہ شاہ کاظم قلندر سے کی - تیس سال سے زیادہ اکمل و افضل باپ کی تعلیم و تلقین اور فیض روحانی آپ کے رگ و پے میں راسخ ہوگئی اس پر شاہ صاحب کے ذاتی مجاہدات و ریاضات نے آپ کو فنافی اللہ کر دیا -

شاہ تراب علی قلندر نے طالبان حق کی اکثر رہنمائی کی اور ان کو سلوک کے کٹھن مرحلے بڑی آسانی کے ساتھ طے کرا دئے - ۹۳ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے - آپ کا مزار کاکوری میں مرجع خلائق ہے -

کتابیں آپ نے بہت تصلیف کیں لیکن زیر بحث اس وقت آپ کا ہندی کلام ہے جو معرفت اور حقانیت سے لبریز نظر آتا ہے -

تھمری

مورے نین لاگے گوئیاں کہو اور سنگ کاہے
میں تراب کی ہوں پیاری مورا جی وہی کا چاہے
مورے نین لاگے گوئیاں......سنگ کاہے
ہمہ شہر پر ز خوبان منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بہ کس نگاہے
آؤ پِھروا ہمرے مندروا بہت کرو نا ہمکو تنگ
بہت لگائے بدنام بھئے ہم تم دونوں ایکے رنگ
دور رہت ہو کاہے ہمسے میں تو مرت ہوں یاھی غم سے
تم جگ جیو تراب کے دم سے سکھ مان رہو نت واکے سنگ
مورے نین لاگے.........کاہے

تھمری

وا تو لگو ہے تراب کے گروا | جا سو لگی توری آس سکھی ری
گھاؤ لگاوت میہ ماں کاری | بہہ دئے ماری بدریا کاری
برست ہی ماں تم گھر ناھی | ترست ہے برمن دکھیاری
بلد پرت یہ آگ لگت ہے | رو رو آنسون بھیجت ساری
برسن ماں کوؤ درسن پاوے | ہو تو پنا یوں ایکو باری
درد تراب کسی کا جانے نو | دیکھے جو ناری بھد سو اناری

بابل

اب تو چلی میں دیس بدیس   بابل توری نگری چھوٹی
بہرن پھر کٹھن ہے آون   آس ملن کی ٹوٹی
سسرے جات ہوں سنگ پیا کے   مات پتا سے روٹھی
سہاں هلست میں اس روت ہوں   جس کوئی ماری کوٹی
سانچا میت کوئی نا جگمان   بہت جگت کی جھوٹی
سسرے کی لیک تراب سو پوچھو   نیہر سمجھو چھوٹی

ملار

جارے پتنگوا لے آؤ کھبریا   بلماب رہے پیا کوو کی نگریا
آوت میلگھو نہیں جلت جگاون   چھائے رہی یا ہی دیس بدریا
آوت آوت برسن لاگے   کا یہہ دیس کی پھوٹے ڈگریا
پپیہا کبھوں پیو پیو کرت ہے   میں تو رتت ہوں آٹھو پہریا
مکھ هیرت موھے کل نہیں نسدن   کہیں آنگن کہن جاؤں اٹریا
آپ نہ آئے نہ پتیا بھیجی   بیتی ہے برکھا یوں ہی سگریا
کو سمجھاوے تراب پیا کو
کوؤ تو ناھیں واکو دوسریا

میاں وجہن ایک بزرگ سادات پسندید میں سے تھے یہ گیارھویں صدی ھجری میں پیدا ہوئے بڑے صوفی اور کامل بزرگ تھے - حضرت شاہ تراب علی قلندر سے اکثر ملنے آیا کرتے تھے - هندی کا ایک دیوان غیر مطبوعہ ان کی یادگار ہے -

الف - بے - میاں وجہن کے عنوان سے ایک نظم ہدیۂ ناظرین ہے -

الف ایک بھورنگی سائیں   ھر گت میں واکی پرچھائیں
جہاں دیکھو تہاں روپ ھی نیارا   ایسا ھی بھورنگی پیارا

وجھن کہے تو کیا کہے کہلے کی نہیں بات
سلدر سمایو بوند میں یہہ اچرج ہزو دیکھات

یہ بن گرو کہون بہید نہایا دھرتی سے اکس لو دھایا
پہلی پہنت گرو تہن کرئیے پریم نگر میں تب پگ دھرئیے

بن گر وجھن جو کوئی لہت ھی بسن رنگای
یہہ نچکی تم جانیو وہ دور اور سی جای

تے تب جوگ تہرا بن آئی ھے جب بھرن یہہ دیدھا جلی ھے
دیلی تو من میں کپٹ کی ٹاٹی جھن سب کھول کہا ھی ماٹی

جو ملکی میں میں اور تہیں تہیں کا بلدھے تار
وجھن صاحب ابھی ملے تلک نہ لاگے بار

ٹے ثابت ھو دھیان جو لاگے آپ ھی آپ بہرم سب بھاگے
اچھا جاپ لو جب رہے بھائی چھوٹ جائی درپن کی کائی

وجھن کہت سو جاپ کر بیٹھہ رھو دھیان لگائی
سوت نرت وہ راکھی سوانس نجائی

جہم جگت میں اور بسئی ہون جب تو ھے اِکلا کے پلی ھوں
ابھی تو وے سلگیں نہیں چھوتے دن دوپہر جن پہلتی لوتے

کہلے کو تو پانچ ھیں اور ھیں وے پورے بیس
اونھیں کے کارن ناملے ابھیں لو جگدیس

حے حد بہر یہہ بہول ھے تہری ایکو بات نہ مانے میری
اب لو توي ایسا ھوي جاتسا جیسی کوئی بھلا مدہ ماتا

کابہی تہی مدہ تہری اور کہاں گیا تہا چہت
ایسی کایا پائے کے جو ھر سے کی نہ ھیت

خے خاملد کہا انہوں سے نہارے　　موند دیکھہ توں دسو دوارے
سن پڑے ھے انہد کا باجا　　پرجاہے ہوئی جلی ھے راجا

سبھی سازیں ھوں بجیں اور ایسے مچے ھوں راگ
وجہن جاکو سن پڑے بڑے ھوں واکے بھاگ

دال دیا من موں جو راکھی سو راکھی　　پریم کا رس کیسے نا چاکھی
بن مدہ پیئے ہوے متوارا　　نس باسر وہ کرے نجارا

جھوٹے جگت موں ائی کے کرپا کرم تو مان
دیا دھرم نہ چھانڈئے جو لے کہت موں پران

ذال ذوق جب لو نہوں آوے　　کتلو چھے کوو من بھٹکاوے
ہردے لگے نہ پریم کی کانسی　　کیسے ملے کھو ابناسی

جب لون تن ناھوں جرب اور من ناھیں مرجاب
تب لون مورت سہام کی وجہن کہاں دکھاب

رے راز موں ایسا کھولا　　جیسا کچھہ منصور تھا بولا
سو سب سلی رھا تو کورا　　جان پرت مت لوکگی چورا

لاج کو کاجل نہوں توری سو نہن ڈالے دھوے
وجہن کہت کیسے بھلا درسن پیکے ہوے

زے زر دیکھہ جو بھولا رھئی ھے　　سگری بھس اکارتھ جلی ھے
پریم بھگتی کا مدہ پیے چوکھا　　مت جلی ھی سب من کا دھوکا

ہوا نسے کہا کہہ اوا تھا یہاں کئی کیا آئے
جھوٹے مایا دیکھہ کے ایسا کہا بھولاے

سین سہج کا سرکھہ لے لٹکا　　کاھیکو ات اوت پھرت ھے بھٹکا
سوچ نکر ایھوں ھی سبھیرا　　ترکتی کوتمھن کر دے تیرا

اکہہ جگن کا جگن ہے شو وچہن دیا بتاے
جو سائیں کرپا کرے تو سبھی بات بن جاے

شین شور تن میں ہی جھکا   ابھیں لسونا چھہلے وھکا
دن بھر لکھا کرت ہی پاتی   سانجھہ بھئی دی سووت تاتی

سادھ سے کچھہ پرچے نہیں اور چورن سے بوہار
وچہن کہا دیکھ تو بھول رہا سنسار

صاد صوری صاد کو چھہلی   کٹھن پری کا ہوتی نہ کہئے
یہ سمجھلے اپنے من ماہیں   ہونا رہی رچا جو سائیں

آسن مار کے بیٹھہ رہو من میں راکھہ تو دھیر
صاحب کے پرتاب سے کٹ جئی سب بھیر

ضاد ضرورت اتنا کیجے   نس دن نانو بلکی کا لیجے
میں تو من میں یہی بچارا   تب ہوی ہے تہرا نظارا

وچہن جگت میں آنکی چاہیں ہو کچھہ گیان
نبی کا نانو سمرن کرے علی سے راکھے دھیان

طے طالب تو کہاں ہی پورا   پریم نگر کا نانگی ناد تہورا
وہ کے آگے اور ہے چلنا   سہج نہیں صاحب کا ملنا

پیرنگر کو پہنچ کے نبی نگر کو جاے
تب وچہن کہت کے اندر ہرکا ہیکا دیکھاے

ظے ظاہر باطن ہے وہی   وہی وہی سب وہی وہی
جہنے اپنی منمیں یہ بوجھا   ہر ہر میں ہروا کو سوجھا

پریم کی ندی گہری بھری سے جو کوو اوترا پار
عاشق اور معشوق میں تب رہو کون بچار

عین عشق کا پھندا ہے نیارا وہاں دوجہ کا نہیں گذارا
سیس کاٹ کے ہاتھہ جو دھرتیے تب درشن پی کے وہ کرلیے

گلی سانکری بہت ہے اور نیرے ہیں سب گانو
ٹھوکر کھونت بچاپکی سنبھل کے دھرنے پانو

غین غـــرورنے کھیل بگارا دیکھہ پڑا نہ پھکم پہارا
اور ہی باتن رہتے راجی کہا ہارا جات ہے باجی

بازی میں کہو کا رہا اکلے راکھا ہے داون
ہرسی جیتا چاہت سی صاحب کا چت ناوں

فے فرمان طلب کا ائی ہے کا مکھہ لے گھر پھکے جلی ہے
وا دن کا کچھہ سوچ نہ کہلے ہـــر کا ناوں کبھوں نہ لیلے

آگی کہوں تو ناسلی ابہوں کہت ہوں چیت
یکدن پھر پچھتایگا جب چڑیاں چگ جیں کھیت

قاف قول تیرا ہے جھـــوٹا اور جو ڈھنگ دیکھوں سو انوٹہا
سدا کیا سادھن کی بـــانی تہہ پر اب لون بھیا نہ کہانی

جو مت کا ہلا نہ ہو اونکی کون ہے بات
پہلی تو سوچت نہیں پھر پاچھے کو پچھتات

کاف کرم اون بڑا ہے کہلیا سانکھہ جلم ایسا ہے دیہلیا
آپ چھپی اور کـــوئی اوکہـــارا یہہ تو من میں سونچ گوارا

رہکا بدلا ایک ہے سو میں دیا بتـــاے
ہر مہرت تـــو ہی جای پہلے آپ ہراے

لام لوبھہ کی چھوڑ دے باتیں میں جو کہوں سو سیکھہ لے کہاتیں
اس لگ ہے پی سے جی تورا چندر کو جیسے چہت چکورا

جو تو پریم کے رنگ میں تن من لئے رنگاے
پہلے بور میں ڈبکی لو یہہ کدھر دھوں جاے

مہم متحلت جھلی من میں ماماما گھر میں رہی رہی جہی بن میں
گلے پڑے جب پریم کی پھانسی کہاں کی اجودھیا کہاں کی کاسی

جاکے ہردے لگت ہے وجہن پریم کا بان
چھوٹ جات سب نگم اور بھول جات ہی گیان

نوں نہیں دوجا کرو جگ میں آپہی آپ رما ہے سب میں
ہت چت سے سن لے یہہ بیان کہل جہن ہیں تیرے دھیانکی نیدان

وجہن کہت سو بوجہہ لے یہی راکہہ لو بوجہہ
یکدن یاہی بوجہہ میں ہوے جئی ہے سب سوجہہ

واو وہی ایک یار ہے تیرا تہکی کلی کہے نا پھیرا
درجن بہی مہت بلائی سمجھا نا مورے سمجھای

میں جانا تہا چتر ہے تو بڑا نادان
کیسو میں سمجھاوت رہوں ایکو کلی نا کان

ہی ہادی ایسا تو پائی واہو تے اپنا چت نہ لگاے
یہی سچ موہن ہے ادہکاری دیکلی کا گت ہوگی تہاری

یہن کے ہارے ہار ہے اور یہن کے جیتے جیت
وجہن کہت سو مان لے صاحب سوں کر پیت

یے پیاری ہر سے جو کرنا یہہ انچہر ہردی بیچ دھرنا
پلت پلت بن جئی ہے ایسا کوئی دنن منصور تہا جیسا

وجہن انچہر ایسے کہے ہیں سادہن کے ہتہار
برہا کے میدان میں پہنے کے راکہن ہار

سودا — سنہ ۱۱۲۵ ھجری میں بمقام دلی پیدا ہوئے - ان کے اسلاف کابل کے باشندے تھے - چنانچہ مرزا صاحب کے والد بزرگوار مرزا محمد شفیع ہندوستان میں بغرض تجارت آئے اور آب و دانے نے ان کو ایسا پکڑا کہ پھر یہیں کے ہو پڑے -

مرزا سودا رواج ہیرپند کے موافق پہلے تو سلیمان قلیخاں وداد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ حاتم سے تلمذ حاصل کیا اور اردو شاعری کو معراج کمال پر پہونچا دیا -

ساٹھ برس کا سن تھا کہ دھلی کو چند وجوہ سے خیرباد کہکر فرخ آباد گئے اور نواب بنگش کے یہاں فروکش ہوئے — اواخر عمر میں لکھنؤ کو اپنا مسکن قرار دیا اور نواب شجاعت علی خاں والی اودہ کی ملازمت اختیار کی - مرزا کو اردو شاعری میں معراج تھی - اس کے ذکر کا یہ وقت نہیں ہے لیکن ہندی زبان میں جو موشگافیاں اور تراش خراش کی ہے اس سے ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے - تذکرۂ آب حیات میں مولانا آزاد رقم طراز ہیں -

" مرزا اکثر ہندی کے مضمون اور الفاظ نہایت لطیف طور پر تضمین کرکے زبان ہندی کی اصلیت کا حق ادا کرتے تھے " -

چنانچہ اُن کی اکثر پہیلیوں ' قصیدوں اور مرثیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا سودا کو ہندی زبان میں بھی کافی عبور تھا - چند پہلیاں ' قصیدے ' اور مرثیے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن کا پڑھنا لطف سے خالی نہیں ہے :—

پہیلي شمشیر

سر پر نکھلی مکھ پر بار   اس نار کا ہے یہی بچار
جیتے ہم کرے وہ دو   جب وہ ناری بھاری ہوے

پہیلی سہر

ایک نار بھونرا سی کالی　　کان نہیں وہ پہنے بالی
ناک نہیں وہ سونگھے پھول　　جگتا عرض اُتنا ہی طول

پہیلی سہر

سیام برن ایک دیکھی نار　　پاؤں دو آنکھیں چار
اچھے کرتب ایسے کرے　　جو پی کے بدلے آپ ہی مرے

پہیلی پرچھائیں

عجب طرح کی ہے اِک نار　　اُس کا کیا میں کروں بچار
وہ دن ڈوبے پی کے سنگ　　لاگ رہے نس واکے انگ
دیا برے تو وہ شرمائے　　ڈھگ سے سرک وہ دور ہوجائے

پہیلی خط

ایک نار سب ناری میں پیاری　　آدھی گوری آدھی کاری
دیکھو واکا اُلٹا طور　　گونگی آپ بکاوے اور

پہیلی باز

بعض بات کہی نا جائے　　ناری ہوکر نر کہلائے

پہیلی نرگس

تریا ایک سبھا کے بیچ　　روپا سونا واکے سیس
میہنا جیسے واکے پاؤں　　چھری جیسے واکا ناؤں

پہیلی دودھ دھی

ایک نر کا اِک نربن آوے　　سبھی کہا یہ جم جم آوے
واکے ہوت مکھن نر ناری　　نر پیارو اور ناری کو پیاری

پہیلی فربال

ایک نار تریائی　　ہلے جلے نہ چلنے کہلے

پہیلی بادکش

ایک پرکھہ وہ سب کو بھاوے بناس میں کوئی ہاتھہ نہ لاوے
میں کہدیا واکا نـاؤن بوجھہ پہیلی یا چھانڈ دے گاؤں

پہیلی بندوق

ایک متواری ہے ھتھیاری پر پر طوطا پالے
اُلٹا ہاتھی اپے بھیتر ڈالے اور نکالے

پہیلی انبہ

ایک تـرور کا پھل ہے تـر پہلے نـاری پیچھے نـر
وا پھل کے یہ دیکھو حال باھر کھال اور بھیتر بال

پہیلی قندیل

سہرا باندھا پاؤں پر اور سلنگ ہوے اس کے سب ساتھی
پیٹ میں واکے آگ لگادي گلے میں اس کے ڈالے پھانسی

مرزا سودا نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے :—

فجر ہوتے جو گئی آج میری آنکھہ جھپک
دی وہیں آکے خوشی نے در دل پر دستک

اس مطلع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ھندي اور سنسکرت زبان سے بخوبی واقفیت رکھتے ھیں نیز ان کو شوق تھا کہ ایسے الفاظ لکھے جائیں کہ عوام ان کے معنی نہ جان سکیں - ملاحظہ ہو :—

ڈھولے پہچ اُس کے نے گردن کا بڑھایا یہ حسن
جلوہ گـر شمع ہو جیسے تہ داماں شمک
ساعد دوست حنا بستہ کی ایسی حرکات
شاخ میں گل کے یوں پہلے سے جوں آئے لچک

دیکھے جو اس کے کچوں کو یہ لیقن ہو اوسے
تلہو یہ تسان کے یہاں کام کا اوترا ہے کتک
آوے جس بزم میں اس ساق بلوریں کا ذکر
جلوۂ شمع کا پسامال حسد ہو وے نمک
پشت پا چھیلے روئے لیلی سے مجلوں کا دل
خون فرہاد سدا شیریں سے چاہیے وہ کفک
گو ترا وضع زمانہ ہے دل افسردہ
پر ہم آئے ہیں ترے گھر میں ادھر دیکھہ تلک
آج وہ دن ہے کہ جس گھر میں تو دیکھے اوسمیں
کہیں ہوتی ہے بھگت اور کہیں اسولک
تار تلبور نہیں رشتۂ زنار فقط
لگے سر سانچ میں تسبیح کے بھی دانوں تک
یعنی نواب سلیمان فر و نام آصف جاہ
عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک
کرنے دیوے نہ رفو چاک کتاں کو انصاف
تا نہ رشتہ کے لئے ماہ کی کھولے پوچک
دور میں اس کے ہے یاں تک تو ملہیات ذلیل
کشمکش ہے یہ نت اُتھہ بنگ سدا زیر کتک
پہل دنیا نہیں کچھہ پہل کا پشے کو کام
حول قوت سے ترے چاہیے تک اس کو کمک
تجکو للکار کے میدان میں صف مردان کے
سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک

وہ جواں تو ہے کہ آگے سے ترے رستم بھی
گو سر مار بغل جائے دبے پاؤں کھسک

کوہ ہر ایک اوچھل کر جو زمیں پر بیٹھے
توڑ کر روے سماں چور کرے پشت سمک

سامنے اس کے وہ چھوٹے ہے پٹاخوں کی لڑی
دافیں ایک مرتبہ سو توپ جو ہم سنگ اٹک

چاہے وہ توڑ کے جوں نیشکر اس کی چھوکو
پاؤں کھجلانے لگے سونڈہ میں لیکر پولک

خیمۂ جاہ کا ترے سو کروں کیا مذکور
ہوے استاد جہاں ترے جلو کی اسپک

آسماں کو نہ کریں اُس کے تلے بے چوبہ
کہ نہت کھلدہ ہے یہ اور نہایت کوچک

اللہ اللہ ترے مطبخ کا تجمل جس کا
طبق روئے زمیں سے ہے بڑا خوان چسک

اُسکے مصرف کے جو دیہات ہیں بس ان میں سے
اپنے مداح کو بھی کردے مقرر مصحک

محتسب سے چلے ہے مست رگڑ کر کاندھا
مغبچہ آیا چلا قاضی کے آگے ندھڑک

دی نہ اجل نے فرصت آہ کیسے ہو میرا نرباہ

مرزا صاحب نے ایک مرثیہ لکھا ہے جس کا ایک بند ہدیۂ ناظرین ہے :—

مرثیہ مسدس معہ دوھرا

کوکہ زیلب پہت کے سر نو نساوے جھلد کھپاؤں
تجھ جیسا اِک پھر گلوان کے کسلوں مکھ دکھلاؤں
پہلڈی نون اُسے جان دے ناھیں کتون ڈھونڈھن جاؤں
جان دساتو جتھی گھبراوت ہے کسلوں بھیج ملگاؤں
پھر امکھلدی حال دی بھن کھبر کب پاے
اُتھی حسیلور بھیجے اُتھی پھیر نہ آئے

اختر—سلطلت اودھ کا مشہور لیکن معزول بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ اختر بارھویں صدی ھجری میں پیدا ھوا - یہ معزول بادشاہ اُن بدنصیب افراد میں سے تھا جن کے عمدہ چال چلن کی تصویر پردہ دنیا پر نہیں آئی اور برائیوں کا فوٹو پبلک کی نگاھوں کا ھمیشہ آئینہ دار رھا -

اس میں کلام نہیں کہ اودھ کا دارالخلافت (اختر نگر) لکھنؤ اپنی زیب زینت ، آرام اور آسایش کے لحاظ سے ایشیائی عیش و عشرت کا دیدہ زیب اور نظر فریب البم تھا - بدنصیب بادشاہ کی رنگ رلیوں کی شہرت تو دور دور ھوئی لیکن اس کے عمدہ عادات و خصائل قاطبتاً فراموش کر دئیے گئے - کم افراد ایسے ھوں گے جو اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ھوں اور یہ خیال کرتے ھوں کہ وہ معزول اختر ھندوستانی راگ میں روح پھونکنے والا اور بہت سے مفید ھنروں کا بانی تھا - اگر آپ کو عیش و نشاط کے سامان دیکھنا ھوں تو آخری تاج دار اودھ کی ٹھمریاں ملاحظہ فرمائیے جن کے لئے درد بھرے دل اور دکھہ والی آنکھوں کی ضرورت ہے -

(۱)

اختر—سیاں جاؤ جاؤ میں نہیں بولتی - دیکھی بہت تہاری
سیاں جاؤ جاؤ میں نہیں بولتی -

ٹھمری—اختر پیا سوں یوں جا کے کہو - چلیا کے بلد میں نہیں کھولتی-
سیاں جاؤ جاؤ........

ارے مکھ دکھلا رے سلولیا پیارے ' کب کی میں تہاری ٹھاری -
راہ تکت ہوں ' درس دکھا جا تہارے تھارے........
سلولیا پیارے - دن بھیکت موہے آوت جاوت رین -
گنت گن گن تارے سلولیا پیارے - ارے مکھ دکھلا رے -
سلولیا پیارے........

(۲)

الجھ رہے ہیں نیناں جوبن پر تمہارے - ترچھی نجریا گھائل کر
ڈاریو نانوں رکھو بانکی - اکھتر پیارے -
اُلجھ رہے نیناں جوبن پر تمہارے........

(۳)

چمک چمک گھر آئے بدروا من دمکت کوندہ کوندہ -
موہے سہس انچروا ڈار دے سائی اکھتر........
نین چوندہ چوندہ - چمک چمک گھر آئے........

(۴)

بھور پرات ہونگے کاھے کام ' رت بسلت اور کریکھشم بھئی اب
باور بھئی سہام تارے گلت پلجلی پئے چاروں جام........
اور کتنا سب ھی بسرائی لہت تمہاوو نام........
چھن اندر چھن دوارے تہاری تن سوکہت ہے گھام -

(۵)

سہاں دئي جھکوا دے گھو ' یہ رت ساون کی بہار -

سیس گھوم گھو جھولے پہ اختر پھلک میں پرت پھوھار -

سہاں دئی جھکوا.........

(۶)

اتنا سندیسا پہونچا ري - سیاں بن ساون کٹھوری.........

لال چھریا من بھاوے اختر نہلن تھر بھاري.........

اتنا سندیسا پہونچاری.........

شاہ حسن علوی ۲۳ صفر سنہ ۱۳۲۱ ھجری بمقام کاکوری پیدا ہوئے - کچھہ دنوں بسلسلہ ملازمت مہن پوری میں رہے لیکن یہ ملازمت ان کے اشغال دیلی میں حارج ہوتی تھی لہذا ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کي - اور بقیہ عمر مشاغل علمی میں صرف کی - اُن کي تالیفات سے ایک کتاب تفریح الاذکیاقی احوال الانبیاء بہت مبسوط ہے - وہ علاوہ علوم ظاہری و باطنی کے اور بھاشا کے بھی ماہر تھے چنانچہ معرفت اور سلوک کی لے سے بھري ہوئي ٹھمریاں سننے کے قابل ہیں -

بہاگ

سجن بن رووت رین گئی

آپ تو جاے سوتن سوے ہمری کھبــر نا لی

بھور بھیو تب ہوں نہیں آئے پھہ نٹی بات بھئی

جن مہمایو پھـروا واکو سکھہ ماں نہ راکھی دئی

موہن سائیں حسن کا سنوارو واکي بہت ہے نٹی

بھیرویں

تم بن کوئی ناہیں ہمرا سنگاتی

ہم رووت تم بن دن راتی

تم تو سوتن مان نت سوت هو ہم جاگت ههں جوبلواں کے مالی
همرے بلاے تم آوت ناههں پٹھوت همکا سندیس نہ پانی
تن من بار جوگن هو جهہوں سوتي مندروا دےهوں مهں باني
موهن سائیں کی مهں بلهاری اپنے حسن کا لگائے لهو چهانی

چٹکلہ

نیهروا ماں رهکے هم پچهتاے

مائی باپ کچهه گن نہ بتاین سسرے ماں هلسهں نند جٹهانی
کهیل کود ساري بهس گنوائی اُمنگی جوانی بهٹی هوں دوانی
بالے پن ماں بهولی کہا بلی مائی کی مهں نے ریت نہ جاني
سسرے ماں جاے کے مکھ دکهلانی نا کؤ چیلهی نا پهچانی

احمد تمهیں حسن کا بکساهیو

همرو پیهروا تمهیں کا مالی

هوری کافی

سانوری کیسی دھوم مچائی

بهری پچکاری کیسر رنگ کی بهرت هیں چتر دکهلاری
ابرا گلال بهرے جهورن ماں چهرکت سب نر ناری

بچت ناهیں اپنی پرائی

جو سکهی آئی سو رنگ مهں بهیجی جو نکسی متواری
تن من کي سدھ نا هی هے تنکو ساري پهرت بورائی

دیت سانوری کی دوهائی

بهیاں پکڑ کے رنگ ماں بورت کیو هے کلور کلهائی
راہ بسات کاهو گسروا لگاوے اب کؤ برج ماں نا آئی

هوت سب کی رسوائی

کہت گوالن مہرن تمہــرے چــرنن سیس نـــوائی
اپنا رنگ برساؤ حسن پر ایسی جگت دیو بتائی
پیت صاحب سوں لگائی

بھیروین

بدسرا نجاؤ پیروا ہمار

بنتی کرت ہوں پیاں پرت ہوں جلم کی چریا تمہار
تمہرے سدھارے جوبنوا اُمنگیں کیسے میں رکھوں سنبھار
مانت ناہیں تو سنگ چلونگی لاؤ نـنـدیا کہـار
مہرن پیا کا دھیان بناؤ حسـن کی اُور نہــار

جنگلہ

کون ہم جلی ہیں آؤ کہار

مائی باپ موری ڈولیا کندھاؤ کسویاں بہنا دیو سنوار
بھرن آؤ توھے گروا لگاؤں بھئی ہوں اچانک چالن ہار
ساس نـنـدیا اور کرھیں کی ری پت ہو دوس اوتار
دیکھوں پیا سوں کیسی بنت ہے یاھی جیا ماں سوچ بچار
احمد تمہیں پوچھو جس کا جاوں کوو ناھیں پوچھن ہار
مہرن پیا سوں ملاؤ حسن کا
میں تمہری بلہار

مرزا اسداللہ خاں غالب گیارھویں صدی ھجری میں پیدا ہوئے -
ان کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے - اس لئے ان کے حالات قلمبند
نہیں کرتے ہیں - البتہ یہ دکھاتے ہیں کہ وہ فارسی اور اردو کے مالک

کامل هی نہ تھے بلکہ هندی زبان میں بھی یکتائے روزگار تھے - اور اس کی شہادت اردوے معلیٰ غالب سے ہوتی ھے -

چنانچہ ان کے خطوط میں اکثر و بیشتر حصہ هندی مثلوں اور مقولوں کا ملتا ھے - اس وقت ہم صرف ایک هی مثل پر اکتفا کرتے ھیں گو کہ حسب ذیل مثل کو کاتب صاحب کی اصلاح کا شرف حاصل ہوا ھے مگر یہاں اس کی تصحیح بھی کر دیگئی ھے - ناظرین ملاحظہ فرمائیں - مرزا تفتہ کے نام ۲۳ ستمبر ۱۸۵۹ع کو غالب نے ایک خط لکھا ھے چنانہ فرماتے ھیں :—

"میری جان کیا سمجھے ہو سب مخلوقات تفتہ و غالب کیونکر بن جائیں ع هر یکے را بهر کاری ساختند - انت مدا سومدا ' مصری میٹھی نمک سلونا - کبھی کسی شئے کا مزا نہ بدلیگا" -

یہ مثل سنسکرت کی ھے اور اس کی اصل یوں ھے -

' انت متا سوگتا ' یہ الفاظ سب زبان سنسکرت سے تعلق رکھتے ھیں - اس مثل کے معنی یہ ھیں کہ آخر عمر میں جو خیال ہو اُسی کے موافق دوسرا جنم ہوتا ھے - حاصل اس کا یہ ھے جو چیز جیسی ہو اس میں ویساهی تغیر بھی ہوتا ھے - مثال کے طور پر مصری میٹھی ھے تو وہ نمکین نہیں ہوتی اور نمک سلونا ھے تو وہ میٹھا نہیں ہو سکتا -

اس مختصر نمونے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ھے کہ مرزا غالب هندی زبان سے بھی واقف تھے - ورنہ وہ بے تکلفی کے خطوط میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرسکتے تھے -

---

مرزا والاقدر بہادر نے ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۳۶ع کو صوبہ اودھ کے دارالسرور میں آنکھیں کھولیں - آپ شاهی سلسلے کی ایک کڑی تھے - محمد شاہ

بادشاہ اودھ نے آپ کو مرزا والاقدر بہادر کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ عرف عام آپ کا وزیر مرزا ہے - شاہی خاندان کے رکن رکین تھے۔ یونائیٹڈ سول سروس کلب (چھتر منزل) کے ممبران عالی وقار میں آپ کا نام تھا - لارڈ کرزن کی زمانۂ وائسرائلٹی میں آپ کی کرسی شہزادگان اودھ کی صف میں تیسرے نمبر پر ہوتی تھی - ہندی زبان کے بڑے ماہر تھے قدر پیا تخلص تھا آپ کی اکثر تصنیفات ہندی زبان میں موجود ہیں - قصے یا کہانی کی صورت میں آپ نے محضرات شاہی کے رسم و رواج پر ایک کتاب ہندی زبان میں لکھی تھی جو ابھی تک کسی دوسری تصنیف میں نظر سے نہیں گزری -

آپ کا انتقال ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۰۲ع میں ہوگیا - افسوس ہے کہ آپ کی تمام تصانیف کس‌مپرسی زمانہ کے باعث زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں اور آپ کے پسماندگان نے بھی اُن کی طرف توجہ نہ کی -

یہاں ہم چند ٹھمریاں ' چشم و دل کے سوال و جواب وغیرہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن سے قدر پیا کی ہندی معلومات کا اندازہ ہوسکتا ہے :—

ٹھمری

میں تو پنیاں بھرن نہیں جیہوں - آج‌تہارے ہو کدر پیا - دیکھو گلی ہے لچ -
میں تو پنیاں بھرن......آج - پنیاں پرت ہوں - کر جوت ہوں -
کاھیکو مانیلگے سکھی اُن‌اِکا ہے واچ - میں تو پنیاں بھرن نہیں جیہوں آج -

ٹھمری

تہارے گھونگر والے بال - اس بھونرا سے کالی کالی لٹ ناگن سی چال -
تہارے گھونگر والے بال
کدر پیا پریم کی پھانسی من موہنا کی جال
تہاری گھونگر......بال

کیوں بولتا یار بولیاں رے - میں حاجر بندیاں تریاں رے - کیوں بولتا اونچی اتریا چلدن کلوریاں - تاپر بیٹھیا چھل بلیا - کیوں بولتا یار بولیاں رے -

تھمر

موری کھبر نالیلی ایکوبار　　نہج کرے کوئی تمکا پیار
اتنا جائے کدر سے کہیو　　پھر بھی کروگے آنکھیاں چار
موری کھبر نالیلی ایکو بار

دیس

مورا اُن بن کیسے مانے جیا　　نین ملاوت ھی ناجانوں کا کیا
دن تڑپت موھے بیکت رین　　اب چھب دکھلاوت ناھیں
کدر پیا مورا اُن بن کیسے مانے جیا

دیس

کدر اُور ایری گوئیاں کیسے بھیجوں پاتی
کاھو کو جو ساتھی پاتی میں آپ ھی جاتی

ایک تو کالی رین پاپن سونی سیج جیسے ساپن - کیسو بالا جیارا مورا ھے ڈر سی جاتی -

چھون اور مورن کے شور کوئل کی کوک سن بھر بھر پھیٹے کی تھر نیند نہیں آتی -

کنجری

کیسو بجلی چمک چمک رہے -　　اُمند گھمند بادر برسن لاگے -
کدر کرت مورا جیا دھک دھک رھي ھے　　کیسو بجلی چمک چمک رہے -

تھمری

کدر پیا آئے نہ سجھا مور　　رہے　　کـوئی　　سـوتن　　کے　　اُور

کدر پیا سگری رین موھے   نوبت بھئی اتلی مهں هوگئی بهور
کدر پیا آئے نہ سجھیا مور

تھمری

مھں کدر پیا کیسے پاؤں - دوڑ جھپٹ سکھی گلے لگ جاؤں
رس کے رسیلے بانکے سنولیا ھو کونے بن ڈھونڈھن جاؤں

مھں کدر پیا کو کیسے پاؤں

تھمری بھیرویں

جوبنوا ری چار دنا دیہلو سات - جوبن رت جاتے هی سبھی مکھہ
موڑت کدر کرؤ نہ پونچھی بات -

جوبن‌وا ری چار دنا دیہلو سات

تھمري پیلو

ایسو تملے کدر پیا کن سے سهکها تهر لگانا -
بن چلے کی کمان پیارے   اور تھوڑے تھوڑے تهر تمهارے
مهں پردے مهں اور هالے   تا پر چوکت نهیں نشانا

ایسو تملے..............لگانا

پهیلي بسکت

کوٹ کوٹ کے زهر ملایا جان بوجهه کے سب نے کهایا
رهے پنچے اور هر کوئي کهائے چاتر هوے تو جان جاے

دوهرا

لگی بری بلاے ہے جو پیت کا رهے نا دهیان
ناؤ آئے سهس نواے کرج لگے ججمان

آنکھہ اور دل کی بات چیت

آنکھیں—نین کہت یہ من سے کہوں جی تمھیں اچھی رہے
سونچ میں بھلے تم تو برھا کے دوکھہ ہم نے سہے

دل—بھلا وہ جو خوش رہے یہاں یاد دیت ہے دکھہ
رین دنن ہم تڑپت ہیں چین کہاں اور سکھہ

آنکھیں—تمرے کارن بہت پڑی جو پھوٹ پھوٹ کے روئے
اپنی بلا کاج بھیکی انسون کے ہار پروئے

دل—بھوئیں تھئی تو بھاپ اوٹھتے تپ بن کے برسے میہہ
تمرے کارن ہم جلے اور روگی بھیا ہے دیہہ

آنکھیں—آپ جلے اور آپ ہی تڑپے ہم کو بھی رولوایا
کیا دھرا سب کرم تمہارا اولٹے ہم پر چھایا

دل—روئے دھوئے او جلے بھی تم ہم کو جگ سے کھویا
تمھیں بتاؤ نہلاں بھلے کس نے یہ بس بویا

آنکھیں—سبھی کچھہ ہم دیکھت ہیں کاہے دھرت ہو نام
چاہت تم سے ہے کون سا اوسمیں ہمرا کام

دل—آز میں ہم تو بھگے کس نے برا بھلا بتایا
تم نے پہلے چھانت لیا ہے جب تو ہم نے چاہا

آنکھیں—ہم ہیں اسی لئے اونچ نیچ دکھانے کو
بولو ذرا دھرم سے کس نے کہا تہا چاہنے کو

دل—تمرے کارن بہت بڑی جو بھئے پرائے بس
تم تو بھر کے الگ رہے ہمیں گئے ہیں پھنس

آنکھیں—راج تمہارا نگر تمہارا تمھیں ہو سردار
ہم دونوں پہرہ پر تمہارے ہیں کھینچے تلوار

دل — جب چاہو پھنسواؤ ہم کا جب چاہو بچواؤ
تمرے بھر میں چھپ کے بیٹھے اوس پر کھایا گھاؤ

آنکھیں — یوں بھی تم نے بہت کی اور سہلے میں جو چاہا
ہم تو دونوں بند بھلے کس نے وہاں پھنسایا

دل — اپنی اپنی بیتی باتیں ساری کتھا سناؤ
کدر پیا کے تہر چلو کہ اونسے ہوگا نباؤ

محسن کاکوری سنہ ۱۲۴۲ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے - اپنے جد امجد حضرت حسین علوی شہید کے سایۂ عاطفت میں ہوش سنبھالا اور زیور علم سے آراستہ ہو کر دنیا کی آنکھوں کا تارا بن گئے - مین‌پوری میں وکیل تھے - ان کی خوش بیانی ' نازک‌خیالی ' خوبی تحریر اور عالی دماغی کا شہرہ اکناف مین‌پوری اور لکھنؤ میں تھا - حکام اکثر بلا استمزاج کوشاں رہے کہ ان کو سرکاری ملازمت پر مامور کریں لیکن اُنھوں نے غلامانہ ذہنیت کو کبھی پسند نہیں کیا -

حضرت محسن بڑے عالم با عمل اور پاک باطن بزرگ تھے - نعت میں جو غیر معمولی مقبولیت ان کو حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے - ان کا کلام دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بزرگی اور علمیت ظاہری اور باطنی کے علاوہ ہندی کے بھی فرد کامل تھے - کئی کتابیں علم جفر پر ان کی تصنیف کہی جاتی ہیں - بیاض کہنہ کا ایک خستہ ورق ہمارے ہاتھہ آ گیا ہے جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے کسی زمانے میں کچھہ ہندی میں بھی کہا ہوگا جو زمانے کی نیرنگی سے تلف ہو گیا - اس ورق کہنہ پر ایک ٹھمری ان کی تصنیف

کردہ ہے لیکن امتداد وقت کے باعث جگہہ جگہہ سے حروف اُڑ گئے ہیں اور کاغذ کے بوسیدہ ہو جانیکی وجہ سے اس کا پڑھنا بہت دشوار ہو گیا ہے -

تاہم اُن کا شاہکار قصیدہ مدیح خیرالمرسلین کلیات نعت مولوی محمد محسن میں موجود ہے جس کے ہر شعر میں قریب قریب دو چار لفظ ہندی کے ایسی استادی سے کھپائے ہیں جن سے حضرت محسن کی ہندی میں مہارت مسلم ہو جاتی ہے - عرصہ ہوا بعض پڑھے لکھے لوگوں نے جناب محسن کے اسی قصیدے پر اعتراض بھی کئے اور یہ کہا کہ "یہ قصیدہ محسن کا نعت میں ہے یا متھرا ، گوکل ، کنھیاجی اور گوپیوں کی داستان الاپی ہے " -

چنانچہ مولانا قادری - بی اے (علیگ) نے اپنے رسالے اردو کے ہندو ادیب میں جناب محسن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے " ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک یہ اشتراک عمل ہر وقت نمایاں رہا ہے - چنانچہ گزشتہ دور کا ایک جلیل‌القدر شاعر اپنے مشہور نعتیہ قصیدے کی بسم‌اللہ یوں کرتا ہے -

ع :ـــــسمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

اُس باکمال سخنور نے عجم کے ذہنی خط غلامی کے خلاف علانیہ پرچم بغاوت بلند کیا - بلبلوں کی نغمہ سرائی اور طائف کی شب ماہ کی جگہہ برسات کے جگنو اور ہندوستان کے کالے بھونروں کی موسیقی سے کام لیا - کنھیا جی اور گوپیوں کی داستان عشق سے لیلیٰ مجنوں ، شیریں فرہاد کی فرسودہ تمثیلوں کو افسانہ پارینہ بنا دیا - اور جمنا کی طغیانی اور گنگا کے تموج سے جیحوں اور سیحوں کو بھولا ہوا خواب ثابت کر دیا -

گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اِک طول عمل
خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھہ کو ہوا پر بادل
اب کی میلہ تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھہ نہ بہل
ڈوبے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ تھا ذہنی انقلاب کہ ایک ٹھیٹ لکھنوی باکمال شاعر محسن نے ایک مذہبی قصیدے میں یہ انوکھی تشبیہ استعمال کرکے ہمیشہ کے لئے اِن بے نظیر تلمیحات سے مسلمانوں کے کانوں کو آشنا کردیا " -

اس میں کلام نہیں کہ جناب محسن نے ہندی کے آبدار جواہر پارے اس خوبصورتی سے خاتم شعر پر جڑے ہیں جو اُن کو ہندی کا مسلم الثبوت استاد بھی تسلیم کراتے ہیں - چند شعر ہدیۂ ناظرین ہیں :—

مطلع :— سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برج میں آج سری کشن ہے کالا بادل

انتہائی درجے کا

دھر کا ترسا بچہ ہے برق لئے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل
دیکھئے ہوگا سری کشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

راکھیاں لے کے سلونوں کي برهمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

قمریاں کہتی هیں طوبیٰ سے مزاج عالی
لالہ باغ سے هندوئے فلک کھیم و کسل

جوگیا بھیس کئے چوب لگائے ہے بھبوت
یا کہ بیراگی هے پربت پہ بچھائے کمل

حضرت محسن نے ۱۸ صفر سنہ ۱۳۲۴ هجري کو پردہ فرمایا -

سید غلام حسین قدر پسر خلف علي واسطی اور حسیلي بلگرامي کے صاحبزادے تھے - بارھویں صدي هجری بمقام بلگرام پیدا هوئے - کئي زبانوں کے مالک تھے - اور هندی علم بلکہ فن شاعري میں خاص کمال تھا - سنہ ۱۲۸۸ھ میں علم عروض پر ایک رسالہ لکھا جس کا نام قواعدالعروض رکھا - واقعہ یہ هے کہ عرب ' فارس اور هندوستان تینوں ملکوں کي سیر اس کے دیکھنے سے هوتي هے اور اگر وزن کسي شعر کا درکار هو تو بڑی آساني سے میزان نظر میں تولا جا سکتا هے -

اسي رسالہ قواعدالعروض میں جناب قدر نے پنگل (هندی شاعری کے عروض) لکھکر اس کا نام مارمہرہ رکھدیا - پنگل کے پڑھنے سے صاف معلوم هوتا هے کہ اُن کو هندی زبان کي واقفیت بہت اعلیٰ درجے کي تھي - افسوس هے کہ باوجود تلاش ان کا هندي کلام نہیں مل سکا -

ان کے سوا اور بہت سے بزرگ ایسے هوئے هیں جن کا تذکرہ مختلف کتابوں میں هے لیکن زمانے کی بےپروای اور بےحسی کی بدولت آج ان کی یادگار ایک شعر ' دوھا اور کبت بھی باقی نہیں هے - مثلاً -

بھیکہ صاحب نے ہندی شاعری میں بھی تصوف کی چاشنی دی -
چنانچہ پیارے صاحب نے سنہ ۱۷۲۳ـــ۱۶۶۸ع تک بہت کچھہ لکھا تھا -
بلا صاحب جو ان کے شاگرد رشید تھے ہندی میں بڑے نامور شاعر
گزرے ہیں -

بال علی ـــ سنہ ۱۶۹۲ع میں ہندی شاعری کا مانا ہوا شاعر گزرا
ہے - اس کی دو کتابیں ہنیر کاس سیتا رام دھیان ملنجری رام اور سیتا
کی مدح میں بے مثل نمونے کہے جاتے ہیں -

بختاور ـــ سنہ ۱۸۲۷ع میں ایک عالم ہوا ہے - رام بھگتی کا مبلغ
تھا - اُس نے ستنار نامی کتاب لکھی جو اب ناپید ہے -

عالم ـــ سنہ ۱۷۰۳ع میں ایک برہمن تھا - کسی کلمہ گو رنگریزن
سے محبت ہوگئی غرض اس نے ملسمان ہوکر رنگریزن سے نکاح کر لیا -
شیخ رنگریزن بھی عمدہ شاعرہ تھیں ان کی شاعری میں لطافت اور
نفاست خیال کا عنصر غالب تھا کلام ناپید ہے -

نور محمد ـــ سنہ ۱۷۴۳ع کا مشہور ہندی شاعر تھا - اس نے
ملک محمد جائسی کی مثنوی پدماوت سے متاثر ہو کے اندرونی ایک
کتاب لکھی جو اپنے زمانے میں مقبول خاص و عام ہوئی -

عام خیال یہ ہے کہ مسلمان ہندی زبان سے متنفر ہیں لیکن
خلاصہ مضمون متذکرۂ بالا کا یہ ہے کہ مسلمان ہندی زبان کو اپنی زبان
سمجھتے تھے - یہی وجہ ہے کہ اُن میں ایسی جلیل‌القدر ہستیاں گزریں
جنہوں نے ہندی کو غیر زبان سمجھہ کر نہیں سیکھا بلکہ اس میں وہ
مہارت تامہ حاصل کی کہ آج وہ زبان اُن کی اپنی معلوم ہوتی ہے -

اس میں شک نہیں کہ زبان اردو اب دور انحطاط سے گزر کر منزل
ارتقا پر پہونچ گئی ہے لیکن کسی وقت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اردو

زبان هندی زبان سے بےنیاز ہوسکتی ہے - آج کل اختلاف کی گرم بازاری ہے اور یہ سودا ایسا سستا ہے کہ ہر جگہہ مل سکتا ہے - لیکن وہ لوگ جنہوں نے پرانی آنکھیں دیکھی ہیں اور زمانے کی روش سے آگاہ ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ زمانہ کہاں سے کہاں جارہا ہے -

عرصہ ہوا میں نے اختلاف پر ایک نظم لکھی تھی اس کو یہاں نقل کرکے مضمون کو ختم کرتا ہوں :—

نظم

ساقی پلادے جام مئے خوشگوار کا
وہ پیش خیمہ آگیا فصل بہار کا
قابو میں دل کہاں ہے کسی بادہ خوار کا
جو اعتبار کیجئے قول و قرار کا
زاہد کی ہمتو ایک نہ مانیں ہزار میں
توبہ کسی نے کی بھی ہے فصل بہار میں
موسم بدلگیا وہ طبیعت نہیں رہی
باتوں میں غور و فکر کی عادت نہیں رہی
اب دیکھنے کو چشم مروت نہیں رہی
باغ سخن میں پہلی سی رنگت نہیں رہی
پروا نہیں سخن میں جو لاف و گزاف ہے
اس پر ہے اتفاق کہ بس اختلاف ہے
صورت میں اختلاف ہے، سیرت میں اختلاف
رنگت میں اختلاف، طبیعت میں اختلاف
ہوتا رہا ہے مذہب و ملت میں اختلاف
لیکن نہیں مقاصد فطرت میں اختلاف

دونوں میں اتفاق ہے قالب میں اتفاق
اعضا کے جوڑ دیکھئے ہے سب میں اتفاق
گر ڈالئے محاسن اخلاق پر نظر
دیکھے ہیں میل جول کی سب بیش و کم خبر
یکساں برے بھلے کا ہے معیار سر بسر
صرف ایک ہی کسوٹی پہ جنچتے ہیں خیر و شر
سو طرح سے پکارئے معبود ایک ہے
راہیں جدا ہیں منزل مقصود ایک ہے
ہو رفع اختلاف جو نیت بخیر ہو
نفسانیت مٹے تو نہ آپسمیں بیر ہو
ملجائیں دل تو کسی کا نہ غیر ہو
گھر بیٹھے نقد وقت دو عالم کی سیر ہو
نورالحسن نیا تری باتوں کا ڈھنگ ہے
در پردۂ شاعری میں نصیحت کا رنگ ہے

اس مضمون کی تکمیل کے وقت مندرجۂ ذیل کتابیں پیش نظر تھیں :—

۱—تزک جہانگیری -
۲—تذکرۂ سرو آزاد -
۳—تذکرۂ بزم سخن -
۴—سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان -
۵—تذکرۂ ہفت اقلیم -
۶—ید بیضا -

۷—فی العروض -

۸—تذکرۂ مشاہیر -

۹—تذکرۂ معرکہ سخن -

۱۰—تذکرۂ امیر خسرو -

۱۱—نغمات‌الاسرار معروف بہ سانت‌رس (ہندی کلیات شاہ کاظم) -

۱۲—دیوان اردو (شاہ تراب علی قلندر) -

۱۳—آب حیات -

۱۴—قلمی بیاض (حضرت شاہ حسن علوی) -

۱۵—کلیات قلمی (میاں وجہن) -

۱۶—کلیات قلمی (مرزا والا قدر معروف بہ قدر پیا) -

۱۷—اردوے معلیٰ غالب -

۱۸—کلیات نعت مولوی محمد محسن -

۱۹—اردو کے ہندو ادیب مولانا قادری (علیگ) -

۲۰—مثنوی نہ سپہر -

۲۱— اعجاز خسروی -

۲۲—تذکرۂ مجمع الفصحا -

۲۳—تذکرۂ شعراء -

علامہ شبلی

بحیثیت شاعر

(اُردو شاعری)

(از قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی)

تمہید | علامہ شبلی مرحوم جہاں ایک بلند پایہ مورخ ' ایک جید ماہر فلسفہ و کلام ' ایک فاضل انشا پرداز '

ایک زبر دست عالم دینیات تھے ' وہاں وہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے - ان کا مذاق سخن بہت اعلیٰ ' پاکیزہ اور بلند تھا - سخن فہمی اور سخن سنجی کی دولت ان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی اور وہ فارسی اور اُردو کے ایک ایسے زبردست شاعر تھے جن کی نظیر ہندوستان میں ملنی دشوار ہے - علامۂ مرحوم کو وفات پائے بیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا - اس اثناء میں ان کی تعزیت کے سلسلہ میں چند مختصر مضامین ' قدرشناس مہدی مرحوم کے چند مقالات ' " اور عناصر خمسہ " کی انشا پردازی پر انعامی مقابلہ کے مقالات میں ضمنی تنقیدات کے سوا ایسی جامع کمالات ہستی کے کم و بیش نصف صدی کے علمی کارناموں پر اب تک مفصل طور پر کچھہ بھی نہیں لکھا گیا - اگر سر سید مرحوم کی حیات جاوید کو حالی سا تذکرہ‌نگار مل سکتا ہے ' اگر حیات‌النذیر کے لئے علامہ نذیر احمد کا شاگرد میسر آسکتا ہے ' تو کون کہہ سکتا ہے کہ " حیات شبلی " کے لئے سید سلیمان اور عبدالسلام ایسے لائق اور قابل فخر شاگرد موجود نہیں ہیں - لیکن یہ بات نہیں ہے - ہمیں بوثوق معلوم ہوا ہے کہ حیات شبلی دس بارہ سال سے

لکھ کر تیار کرلی گئی ہے ' لیکن ہم اب تک اس مصلحت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جس کی بنا پر اس کی اشاعت اب تک ملتوی رکھی گئی ہے - ہماری قوم کے لیے یہ امر باعث فخر و مسرت ہے کہ جس طرح نیک نامی اور بلند آہنگی کے ساتھ علامہ مرحوم کے نام کو ان کے ارشد تلامذہ نے زندہ رکھا ہے اور ان کے مآثر علمی کے احیاء کا بیڑا اُٹھایا ہے ' اسی طرح ان کی علمی زندگی کے سوانح شائع نہ کرنا ایک ایسی کمی ہے جس کی تلافی حتی الامکان جلد از جلد ہونی چاہئے - دارالمصنفین کے ارباب حل و عقد سے بڑھکر اس ضرورت کا احساس اور کس کو ہوسکتا ہے ' لیکن تاخیر کے معنی یہ نہ ہونا چاہئیں کہ " فردائے قیامت " بھی اس کے لئے کافی نہ ہو - بہر حال یہ ایک جملۂ معترضہ تھا جو اس علمی ضرورت کے متعلق عرض کیا گیا - ہم اس مضمون میں علامہ شبلی کو بحیثیت شاعر دکھانا چاہتے ہیں ' اور چونکہ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے بےمثل شاعر تھے اس لئے ہم اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں - چنانچہ مولانا کی اُردو شاعری کے متعلق یہ پہلی قسط ہے جس کو ہم قدر شناسان شبلی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں - اگر ہم مولانا کی اس ادبی حیثیت کو تمام و کمال نہ دکھا سکیں تو یہ ہماری فہم و استعداد کا قصور ہوگا - علامہ کے کمال شاعری میں اس سے کوئی فرق نہیں آسکتا - بقول معری :—

وَالنَّجْمُ تَسْتَصْغِرُ الْاَبْصَارُ رُوْيَتَهُ   فَالذَّنْبُ لِلطَّرْفِ لَا لِلنَّجْمِ فِی الصِّغَرِ

شاعری کی ابتدا اور اسباب

علامہ شبلی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں ' اور پرورش پائی وہ تمامتر علمی اور ادبی تھا - اسی فضا میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور اسی میں ان کا ادبی شوق اور مذاق

سخن پروان چڑھا - ان اساتذہ کا فیض صحبت نصیب ہوا جس کی بدولت ان کی ادبی اور شعری استعداد کے جوہر کھلے ' اور رفتہ رفتہ مذاق سخن نے ان کی طبیعت میں گھر کرلیا - اگر اُستادی اور شاگردی کے متعارف اور مصطلح معنی نہ لیے جائیں تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مولانا نے کسی شاعر کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا - اگرچہ اس فن میں انہوں نے اپنے بعض اساتذہ سے استفادہ ضرور کیا تھا - مولانا فیض الحسن سہارنپوری ہندوستان میں عربی فن ادب کے امام اور اپنے زمانہ کے ابوتمام اور اصمعی سمجھے جاتے تھے - ہندوستان کے عربی گو شعرا میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کے بعد یہ دوسرے بزرگ ہیں جو عربی ادب اور شاعری کے علاوہ فارسی شعر و ادب میں یدطولیٰ رکھتے تھے - چنانچہ خود مولانا ان کے مرثیہ میں فرماتے ہیں :—

" نگویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید
عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستان بودن
بہنجار دری بـرجـادۂ پیشینیاں رفـتن
بآہـنگ حجازی یـاد گار پـاستاں بـودن "

اسی طرح مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت علامہ تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے اسلامی عہد زوال کے بعد اسلامی علوم و فنون کو زندہ رکھا - ان دونوں جلیل القدر اور سلف کے نام لیوا بزرگوں کے فیض صحبت نے مولانا کے ذوق شعری کو جو بالکل فطری اور وہبی تھا ' اچھی طرح اُبھار دیا - خود مولانا کا بیان ہے کہ فارسی کا مذاق بھی انہیں کا فیض ہے' اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے [۱] - بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شاعری

---

[۱]—الندوہ بابت اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ ء -

میں خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی [۱] کے شاگرد تھے چنانچہ ایک مرتبہ اڈیٹر الناظر نے اپنے رسالہ میں اس کا ذکر کیا تھا جس کی بنا پر مولانا نے اپنے ایک خط مکتوبۂ ۳ اگست سنہ ۱۹۰۹ع میں ان کو تحریر فرماتے ہیں :—

" آپ نے اپنے پرچہ میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیزالدین صاحب کا شاگرد ہوں - خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں ' لیکن میں ان کا شاگرد نہیں - میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے - یہ جو کبھی کبھی موزوں کرلیتا ہوں یہ شاعری نہیں تفریح طبع ہے " [۲] -

غرضکہ علامہ شبلی جب تک گھر پر رہے علمی مطالعہ کے ساتھہ ساتھہ شعر و سخن کی مشق بھی کرتے رہے - ابتدا میں ملک کے عام رواج کے مطابق اُردو غزلیں لکھہ کر مشاعروں میں شریک ہونے لگے - چنانچہ انہوں نے اپنے خطوط میں ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے ' اور انہوں نے جو غزلیں اُردو میں لکھیں ان میں سے بعض نقل بھی کی ہیں [۳] - مولانا کے قیام اعظم گڑھ کے زمانہ میں لکھنؤ اور دیگر اطراف کے بعض معززین وہاں مقیم تھے - اُن میں مشاعرے ہوتے تھے ' طرحیں دی جاتی تھیں ' غزلیں پڑھی جاتی تھیں ' مولانا میر مشاعرہ بنتے تھے [۴] - اس زمانہ کی بعض غزلیں

---

[۱]—مصنف قیصر نامہ سابق پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ فارسی کے مشہور استاد تھے - مولانا کو ان کی خدمت میں عزیزانہ نیاز حاصل تھا - فارسی مذاق کی یکجہتی دونوں میں رشتۂ اتحاد تھا - اکثر مولانا ان کے یہاں جایا کرتے تھے - کبھی کبھی انہیں کے گھر پر قیام فرماتے (مکاتیب شبلی جلد ۱ صفحہ ۲۲۱ ' کا نوٹ) -

[۲]—مکاتیب شبلی جلد ۱ صفحہ ۲۲۱ -

[۳]—مکاتیب شبلی جلد ۱ صفحہ ۲—۱۶—۹۰ -

[۴]—سیرالمصنفین جلد ۲ صفحہ ۲۰۸—۲۰۷ -

اور اشعار ان کے مکاتیب میں ملتے ہیں - اس زمانہ میں لکھنؤ میں اودھ پنچ اور پیام یار کا دور دورہ تھا جن میں ملک کے نامی گرامی ادباء اور شعرا کے مضامین کلام شایع ہوتے تھے - مولانا ان کے نمبر شوق سے پڑھتے تھے بلکہ اودھ پنچ کی بعض طویل نظمیں آخر عمر تک یاد تھیں [۱] -

سنہ ۱۸۸۲ع میں جب کہ مولانا اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم کے سلسلہ میں علیگڈھ تشریف لیگئے اور سر سید سے ملاقات ہوئی تو ان کی مردم شناس نگاہ نے مولانا کو اپنے کالج کی فارسی اور عربی پروفیسری کے لیے انتخاب کیا ' اور مولانا کالج کے پروفیسر بنائے گئے - لیکن کالج جانے کے بعد بھی ان کا مذاق شعر و سخن برابر قائم رہا - علیگڈھ میں سر سید ' مولانا حالی ' جسٹس محمود اور دیگر اهل علم کی صحبت میں مولانا کو کھل کر داد سخن دینے کا موقعہ مل گیا اور ملکۂ انشاپردازی اور شاعری کا جوہر جو ان کی طبیعت میں مضمر تھا ' بروئے کار آیا - چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے فرائض کے انجام دینے کے ساتھہ ساتھہ طبع آزمائی بھی کرتے رہے - جیسا کہ ان کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے - اس مشق سخن کا حال اپنے ایک دوست کولکھتے ہیں :—

" آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں ' مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھہ موزوں کر لیتا ہوں - رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھہ ڈالی دو تین شعر مزے کے ہیں - تمہیں بھیجتا ہوں [۲] -

علیگڑہ کی علمی فضا میں رہ کر مولانا کی شاعری نے تدریجاً ترقی کی - اس میں اس همت افزائی کو بھی دخل تھا جو کالج کے

---

[۱]—سیرالمصنفین جلد ۲ صفحہ ۲۰۸—۲۰۷ -

[۲]—مکاتیب شبلی جلد ۱ صفحہ ۵۸ -

ارباب حل و عقد خاص خاص تقریبوں پر مولانا کی نظموں کو سن کر کیا کرتے - کبھی کسی جلیل القدر مہمان کی آمد پر اور کبھی ولایت میں کامیاب ہونے والے طلبہ کے خیر مقدم پر نظمیں لکھنے کی فرمائش کی جاتی تھی [۱] - علیگڑھ میں بیٹھے بیٹھے اردو شعراء کا کلام اور ان کی معرکہ آرائیوں کا حال اخباروں میں مزے لیکر پڑھتے تنقید کرتے اور داد دیتے تھے اور اس سے خود ان کی طبع رسا کو تحریک ہوتی تھی - چنانچہ اپنے خط میں لکھتے ہیں :—

" ان دنوں اردو کی ایک غزل لکھی تھی اور حمید کو بھیجدی ......آج کل داغ اور حالی کی دلی میں خوب معرکہ آرائیاں ہیں ، دو تین غزلیں اخباروں میں چھپی ہیں - داغ کا دوسرا دیوان چھپ کر آگیا اور تیسرا چھپ رہا ہے مثنوی نہایت خراب لکھی ہے - میری مثنوی ساتھ آویگی - عموماً اہل سخن نے نہایت پسند کیا [۲] " -

اس تحریر سے جہاں مولانا کے ذوق شوق اور نقد سخن کا پتہ چلتا ہے ، وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا اردو شاعروں میں داغ کے کلام کو پسند کرتے تھے -

شاعرانہ طبیعت اور شدت احساس

شاعری کا مقصد اولین جذبات کی نیرنگیوں کا اظہار کرنا ہے ، انسانی محسوسات کا بعینہ چربہ اتارنا شاعری کا کمال سمجھا جاتا ہے ، لیکن اس کے لئے شعر کہنے والے کی طبیعت کا شاعرانہ ہونا لازمی ہے - یعنی جذبات سے متاثر ہونے کا قوی احساس - جب تک شاعری میں قوت اور شدت احساس نہ ہو ، وہ انسانی جذبات کو علی وجہ الکمال اشعار میں دکھا نہیں سکتا -

---

[۱]—مکاتیب شبلی جلد ۱ صفحہ ۶۸—۷۹ -

[۲]—مکاتیب شبلی جلد ۱ صفحہ ۹۶ -

اس لحاظ سے جب ہم مولانا کی طبیعت پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہم کو بے حد حساس اور اثر پذیر نظر آتی ہے - رنج و غم اور شادی و مسرت دنیا میں ہر شخص کو پیش آتے رہتے ہیں ' لیکن شاعر کی دنیا الگ ہوتی ہے جہاں ایک معمولی سا واقعہ ایک بلائے عظیم اور ایک چھوٹا سا حادثہ آفت ناگہانی بن جاتا ہے - یہ شدت احساس ہی کا نتیجہ تھا کہ فارسی کے مشہور شاعر انوری کو کہنا پڑا :—

" ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگراں قضا باشد

بر زمیں نا رسیدہ می پرسد خانۂ انوری کجا باشد "

شاعر کی زندگی کا ہر پہلو شاعرانہ دلچسپی کا سامان بن جاتا ہے - یہ بھی کچھ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا کی زندگی میں جو جو واقعات و حوادث پیش آتے رہے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی شاعرانہ اظہار خیال کا ذریعہ بن گیا - گرمیاں بسر کرنے کے لئے کشمیر تشریف لیجاتے ہیں لیکن وہاں بخار شروع ہوجاتا ہے اور آخر " قصیدہ کشمیریہ ' کا باعث بنتا ہے - شعرالعجم کی تالیف ہو رہی ہے ' شاہنامہ کے ان شعروں پر تنقید کرتے ہوئے لکھ رہے ہیں :—

" بروز نبرد آں یل ارجمند بہ تیغ و بہ تیر و بگرز و کمند

برید و درید و شکست و ببست یلاں را سر و سینہ و پا و دست"

اسی اثناء میں زنانہ میں تخت پر آ کر بیٹھتے ہیں ' اتفاقیہ بہو کے ہاتھ سے بندوق سر ہوجاتی ہے - مولانا کا پاؤں نشانہ بنتا ہے یہ حادثہ بھی بہت سے ادبی نکات و لطائف کا باعث بن گیا - اردو فارسی کی متعدد نظمیں اس کے متعلق کہی گئیں - پہلے چھوٹے بھائی مہدی نے سفر آخرت اختیار کیا ' مولانا کے دل پر چوٹ لگی اس کا نتیجہ ایک اردو مرثیہ کی صورت میں رونما ہوا - آخر عمر میں ایک

اور هونہار چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق (وکیل هائیکورٹ) داغ مفارقت دے گئے - اس جان لیوا حادثہ پر ایک دردناک مرثیہ لکھا گیا جس کا ایک ایک بند دل ہلا دینے والا ہے -

مولانا کے شدت احساس کے متعلق ان کے ایک دیرینہ رفیق مولانا شروانی کا بھی بیان سننے کے قابل ہے :—

" احساس بہت شدید تھا اس لئے رنج و الم سے بہت متاثر ہوتے تھے - سنہ ۱۹۰۲ع میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے - ایک روز نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہو گئی - اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے - یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا - ذوق میں شدت چاہتے تھے - نمک کھانے میں تیز ہو - دستر خوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے - شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی - یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے - باتیں کرتے جاتے ہیں ' قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں - وہ قند سے اور سامع ان کے کلام سے شیریں کام ہے - سخن ہائے شیریں بہ از قند ہست - ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃالعلماء کے سلسلہ میں بریلی میں ان کا میرا ساتھ ہوا ' اس زمانہ میں تندرست تھے - قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی - محض شیرینی ہونا کافی تھا - اس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی - پانی تیز سرد پیتے تھے - جاڑوں میں بھی یہی ہوتا - اس کے ساتھ سردی گرمی بہت محسوس کرتے - ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں ' تسلی نہ ہوئی - دوسرے روز خاص اهتمام سے لحاف خوب روئی بھرواکر تیار کیا گیا - گرمیوں میں هندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے

جاتے تھے - اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر سخن کے لئے یادگار رہیں گے - جاتے سادہ اور کڑی پھٹے تھے" [۱] -

اردو شاعری

ابتدا میں مولانا فارسی میں مشق سخن کیا کرتے تھے، لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اردو شاعری نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا، اور جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا وہ مشاعروں میں شریک ہونے اور اپنی اردو غزلیں پڑھنے لگے تھے - اُن کے ابتدائی زمانہ کا اردو کلام چند غزلیات کے سوا ہمارے پاس موجود نہیں، یا وہ چند اشعار جو ان کے مکاتیب میں خود انہوں نے نقل کئے ہیں - ممکن ہے کہ اسکے سوا اور بھی کلام ہو مگر وہ ہم تک نہیں پہونچا - مولانا کی غزلیات میں کوئی خاص بات ہمکو نہیں نظر آتی، خصوصاً ان کے معاصر شعراء کے کلام کے مقابلہ میں ان کی یہ غزلیں کچھ زیادہ قابل وقعت نہیں سمجھی جاسکتیں - اگرچہ خود انکا یہ دعویٰ ہے کہ -

یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش، سخنوری ہے فسونگری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

یہ دعویٰ فارسی میں تو ہر ایک کو مسلم ہے، لیکن اردو میں قابل تسلیم نہیں ہوسکتا - ہاں بقول ان کے صرف اسقدر کہا جاسکتا ہے کہ :

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں آکے شبلی بھی غزلخواں رہگیا !

لیکن انہوں نے شاعری کو بطور پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا، بلکہ اپنے جذبات سے مجبور ہوکر وہ شعر کہتے تھے - ابتدا میں انہوں نے غزل کے کوچہ میں قدم رکھا، مگر اس زمانہ میں امیر و داغ اس فن کے ماہر اور اقلیم سخن کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے اس لئے اس سرزمین میں پھلنا پھولنا معلوم - علاوہ ازیں شعرائے قدیم کا طرز سخن اسقدر فرسودہ اور پامال ہو چلا تھا کہ

۲۱۱ـــ رسالۂ تذکرۃالشعراء مرتبۂ حسرت موہانی بابت اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۱۵ء -

اب اس پر اضافہ کی گنجائش باقی نہ رہی تھی - بلکہ نام نہاد سخن سراؤں کی تکرار و اعادۂ مضامین سے قدماء کی زمینوں میں قصائد و غزلیات کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہوچکا تھا - پھر اسی زمانہ میں مولانا کا تعلق علیگڑہ کالج سے ہوگیا جہاں تعلیمی اور قومی اصلاح کا صور پھونکا جارہا تھا - چنانچہ حالی مرحوم نے مسدس لکھکر اس سمت میں پہل کی تھی اور اردو شاعری کی اصلاح کے لئے قدم بڑھایا تھا - مولانا بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے - چنانچہ انہوں نے بھی ایک مثنوی " صبح امید " کے نام سے تصنیف کی جو انکی پختہ مشقی اور شاعرانہ قابلیت کا نمونہ ہے - اس کے بعد ایک مسدس " تماشائے عبرت " کے نام سے لکھا جو علیگڑہ کے قومی تھیٹر میں انہوں نے اپنے خاص انداز میں پڑھا - بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک خاص انداز ترنم سے نظمیں پڑھنے کا طریقہ مولانا ہی نے ایجاد کیا - لیکن اس طرح کی قومی شاعری کو وہ دوسروں کی ملک سمجھتے تھے - مولانا شبلی کی بلند ظرفی اور عالی حوصلگی کا یہ اقتضا تھا کہ انہوں نے اپنے لئے کبھی دوم درجہ کی چیز پسند نہیں کی - یہ اهتمام ان کا قریب قریب ہر علمی شعبہ میں رہا - سر سید کی وفات کے بعد ان کی انشا پردازی پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کالج کی طرف سے کی گئی ' چنانچہ مولانا نےعلیگڑہ کالج مگزین کے لئے ایک مضمون لکھا - اس کے آخیر میں فرماتے ہیں :

" یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے ' وہ لکھینگے اور خوب لکھینگے ' بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا - میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا اس وقت جبکہ تمام ملک میں سر سید کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے۔ کا

شایق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہئے - میں نے اسی کی تعمیل کی ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا :

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل

اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو [۱] "

چنانچہ اردو شاعری میں بھی انہوں نے پامال راستوں کو اختیار نہیں کیا جن پر دوسرے گامزن ہوکر شہرت حاصل کرچکے تھے - پھر یہ بات بھی ہے کہ مولانا نے اپنے ابتدائی اردو کلام کو کبھی وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا - اس کا دراصل یہی سبب تھا - مولانا کو علمی دنیا میں جو شہرت عام حاصل تھی اس لحاظ سے وہ اپنی اس کم رتبہ اردو شاعری کی بدولت اپنے درجہ سے نیچے اُترنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے - یہی سبب ہے کہ ان کے ابتدائی اُردو کلام میں سے مثنوی صبح امید اور چند قومی نظموں کے سوا کچھ شایع نہیں ہونے پایا بلکہ اپنے قدیم اردو کلام کو وہ زمانۂ جاہلیت کے کلام سے تعبیر کرتے تھے [۲] - مولانا کے علم و فضل اور طبقۂ علما میں ان کی عظمت و وقار کے لحاظ سے اردو شاعری سے ان کے دستکش رہنے میں وہی مصلحت ہوسکتی ہے جسکا اظہار امام شافعی فرما چکے ہیں :—

ولولاالشعرُبالعلماءِیزری لکُنتُ الیومَ اشعرُمِن لَبِیدِ

یعنی اگر شعر کہنا علما کی شان کے منافی نہوتا تو میں مشہور مخضرمی شاعر لبید بن ربیعہ سے بڑھکر شاعر ہوتا - اسی کے ساتھ مولانا کے قومی اور تعلیمی اشغال اور تصنیف و تالیف کی اہم مصروفیات بھی

---

[۱]—مقالات شبلی جلد ۲ صفحہ ۹۶ -

[۲]—مکاتیب جلد ۱ صفحہ ۱۲۱ -

کم شعر کہنے کا موجب ہوسکتے ہیں - چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :—

" ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں لیکن بہرحال چارہ بھی نہیں ' ندوہ فرض مذہبی اور شاعری فرض طبعی ' کس کو چھوڑوں ' پھر انھیں پر موقوف نہیں ' یک دل و ہزار سودا " [۱]

بااین ہمہ یہ فرض طبعی برابر اپنا کام لیتا رہا ' اور آخر کار مولانا کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت نے اس " فریضۂ طبعی " کی ادایگی کے لئے ایک میدان نیا تلاش کرلیا ' اور انہوں نے ایک نئی صنف سخن میں طبع آزمائی شروع کردی - اس طرح ان کی شاعری کے وہ جوہر کھلے جو ایک فطری اور حقیقی شاعر کی طبیعت میں مضمر ہوا کرتے ہیں - قصیدہ و غزل کی قدیم اور پامال روش وقف اظہار تھی ' قومی شاعری میں حالی اپنا سکہ جماچکے تھے ' اس لئے انہوں نے واقعاتی شاعری کو انتخاب کیا اور قومی اور سیاسی معاملات پر قطعات لکھنے شروع کئے - قطعات نویسی میں مولانا نے جس طرح اپنا زور سخن دکھایا ہے جس آن بان سے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے اور جس لطیف اور دلکش پیرایہ میں سخن سرائی کی ہے وہ بہت مستحق ستائش اور اُردو کی جدید شاعری کے لئے سرمایۂ نازش ہے - لیکن چونکہ آخر عمر میں اس جدید شاعری کی ابتدا ہوئی اس لئے مولانا اس کو " بڑھاپے کا زور " سے تعبیر کرتے ہیں [۲] - سنہ ۱۹۱۰ع میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :—

---

[۱]—خطوط شبلی ص ۱۰۲ -

[۲]—مکاتیب ج ۱ ص ۱۱۰—۱۰۹ -

" عمر ۵۵ تک پہونچ گئی ' قویٰ میں انحطاط آگیا ' لہذا صرف ایک چھائی رهگئی -

صریر خامۂ شبلی کی آتش انشانی

یہ مان لیجیے کہ ہے بھی پر اسمیں دم کیا ہے [۱] "

جیسا کہ علامہ شبلی نے خود تصریح فرمائی ہے کہ " جو چیز مدرکات انسانی میں ہمارے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے اور ایک خاص طرح کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی کی جامع ہے - آج اسی پر شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے [۲] " اس نقطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں تأمل نہیں ہو سکتا کہ مولانا کی جدید اردو شاعری اس کا صحیح مصداق ہے - اور ہم اس میں " ایک خاص طرح کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی " بھی پاتے ہیں جو جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرتی ہے - علامہ کی جدید نظموں کے موضوعات کا دائرہ صرف قومیات ' تاریخیات یا سیاسیات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی واقعاتی شاعری ہر واقعہ کو شاعرانہ رنگینیوں اور لطافتوں کے ساتھ صحیح ' بامحاورہ اور شگفتہ زبان میں بیان کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اور جس کی ان کے معاصر شعراء میں بہت بڑی کمی نظر آتی ہے - واقعاتی شاعری چیزوں کو ضرور بیان کرتی ہے ' مگر محض اس لحاظ سے کہ وہ ظاہری حواس کے ذریعہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں - نہ اس اعتبار سے کہ وہ حقیقتاً کیا ہیں - کسی چیز کی تصویر اس کے اصلی اور فطرتی خط و خال کے ساتھ نہیں کھنچ سکتی بلکہ اس میں تخئیل کے ذریعہ رنگ آمیزی کرنی ضروری ہے - ان اصول پر شبلی کی جدید شاعری کو پرکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعرانہ تخئیل

---

[۱]—مکاتیب ج ۱ ص ۳۲۳ -

[۲]—[illegible]

کی تصویریں تمام‌تر انہیں اصول کے ماتحت تیار ہوئی ہیں -

مولانا کی جدید اردو شاعری مجموعہ ہے اُن نظموں کا جو مختلف اوقات میں مختلف عنوانات پر لکھی گئی ہیں - یہ نظمیں عنوانات ذیل کے ماتحت تقسیم کی جاسکتی ہیں :—

(۱) مذہبی-

(۲) قومی-

(۳) سیاسی -

(۴) وقتیہ -

تاریخی و مذہبی نظمیں

اس قسم میں وہ تمام نظمیں ہیں جو اسلامی تاریخ کے "خیرالقرون" کی "مقدس روایات" سے ماخوذ ہیں - اسلامی روایات کو صرف تاریخی حیثیت سے بیان کردینا شاعر کا مقصد نہیں ہے ' بلکہ ان نتائج سے بھی متاثر کرنا ہے جو ان روایات سے مرتب ہوتے ہیں ' اور جن کو وہ خود شدت کے ساتھ محسوس کرچکا ہے - تعمیر مسجد نبوی ' ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی ' اہل بیت کی زندگی ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر ' مساوات اسلام ' خلافت فاروقی کا ایک واقعہ عدل فاروقی ' اظہار و قبول حق ' جرأت صداقت ' ایسی نظمیں ہیں جو ایک سچے مسلمان کے دل میں اسلامی غیرت و حمیت ' اسلامی خود داری ' اسلامی انصاف پسندی ' جرأت و صداقت اور حریت ضمیر و فکر کے لطیف جذبات کو اٹھا کر اس کو اُن انسانی فرائض کی طرف متوجہ کردیتی ہیں جن کو وہ اپنی غفلت کی وجہ سے بھلا بیٹھا ہے - بلاشبہہ یہ اسلام کی مذہبی تاریخ کے "اسباق‌الشہاد" ہیں ' اور جہاں وہ ایک مسلمان کو شرافت انسانی کے اصلی نکات سکھاتے ' اور انسانی آفرینش کے مقصد کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں وہاں وہ ایک غیر مسلم

گو اسلامی اخلاق اور اسلامی رواداری ' حق گوئی ' اور معدلت پسندی سے آگاہ کرتے ہیں - ان میں بعض نظمیں اس قدر رقت انگیز ہیں کہ ممکن نہیں جو ایک مخلص اور سچے اسلامی جذبات رکھنے والے کو اشکبار نہ کردیں -

قومی نظمیں

سرسید مرحوم کی تعلیمی اور اصلاحی کوششوں میں ان کے جو سرگرم اور پرجوش معاون پیدا ہوگئے تھے ان میں وہ جلیل‌القدر اور سربرآوردہ افراد تھے جو اپنی علمی اور مذہبی تحریروں سے اپنی درماندہ قوم کی مذہبی ' تعلیمی ' تمدنی اور اخلاقی حالت کو اٹھانے میں کوشاں تھے - مثلاً نواب محسن‌الملک ' جسٹس محمود ' نواب وقارالملک ' مولوی چراغ علی وغیرہ - سرسید کے انھیں رفقاء میں حالی اور شبلی ایسی زبردست ہستیاں بھی شامل تھیں جو اپنی سحر بیانیوں سے قوم کے مردہ جسم میں روح پھونک رہی تھیں - اصلاح قوم کی جو آواز اس درد مند دل سے بلند ہوئی تھی وہ سر سید کے ان دو نقیبوں کی زبان و قلم سے صور اسرافیل بن کر نیند کے ماتے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے میں کارگر ثابت ہوئی - حالی مرحوم نے جو علوم مشرقیہ کے عالم اور اردو کے اچھے انشاپرداز و شاعر بھی تھے ' سر سید کے ایماء سے مسدس لکھا - علامہ شبلی ایسے جامع‌العلوم اور شاعری کا صحیح مذاق رکھنے والے بزرگ کب خاموش بیٹھ سکتے تھے - حالی نے مسلمانوں کا جو مرثیہ پڑھا تھا شبلی بھی اس سوزخوانی میں ان کے شریک و دمساز رہے ' گو ان دونوں کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کے اسباب جداگانہ تھے ' مگر دونوں کا مطمح نظر ایک تھا - چنانچہ مولانا نے بھی ایک مثنوی " صبح امید " کے نام سے تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی - مولانا کا یہ پہلا اردو ادبی کارنامہ ہے - اس کے بعد ایک

مسدس قومی " تماشائے عبرت " کے نام سے انہوں نے تصنیف کیا جو علیگڈہ کے قومی تھیٹر میں پڑھا گیا - اس میں شک نہیں کہ مسدس حالی کا سا قبول عام مثنوی صبح امید کو نصیب نہیں ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفس شاعری اور فن کے لحاظ سے مثنوی کا درجہ بلند ہے - اس میں جو آمد، زور سخن ، اور جوش بیان پایا جاتا ہے وہ مسدس میں نہیں ہے - خصوصاً مسدس میں جو یاس انگیز حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ جادۂ عمل پر گامزن ہونے کی تحریک نہیں پیدا کرتا - برخلاف اس کے مثنوی کا ایک ایک شعر قوم کے شاندار ماضی سے ایک امید افزا مستقبل کی طرف رہنمائی کرتا اور مردہ دلوں میں تازہ روح پھونکتا ہے - ملاحظہ ہوں اشعار ذیل :—

امید کی بڑھ گئی تگ و تاز　　اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے　　ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پابگل تھے　　آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا　　مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے　　اخبار کہیں ، کہیں رسالے
تعلیم کے جا بجا وہ جلسے　　گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بیتاب ہر ایک جزو کل تھا　　ہر بار " بڑھے چلو " کا غل تھا

خاص کر اشعار ذیل میں شاعر نے جو رجز خوانی کی ہے وہ بہت ہمت افزا ہے :—

اے مدعیان حب اسلام !　　حجروں میں تو اب کرو نہ آرام !
دعوے میں تو کچھ ہنر دکھاؤ !　　ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ !
دیکھو ! وہ جستجو بھی ہے !　　میدان بھی ہے ! گو بھی ہے
انداز عرب اگر ہے خو میں !　　باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں

موقع ہے ابھی ہنر دکھاؤ ! جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ !
کر دو جو گذشتہ کی تلافی ! ثابت ہو زمانہ پر کہ اب بھی
گو دور فلک ہوا دگر گوں پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی اس راکھہ میں کچھہ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے دن ڈھل بھی گیا طپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی ! اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں ' طرز و خو وہی ہے مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کے بعد سے مولانا نے قومیات کے سلسلہ میں کوئی نظم نہیں لکھی ' سوائے اس قصیدۂ اُردو کے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدۂ سنہ ۱۸۹۳ع میں پڑھا گیا - بلکہ اس طول طویل عرصہ میں مولانا اپنے جذبات لطیفہ کا اظہار فارسی کے ذریعہ کرتے رہے - لیکن آخیر عہد میں چند محرکات قوی نے ان کو دوبارہ قومی نظمیں لکھنے پر آمادہ کیا چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ع سے انہوں نے پھر اس کوچہ میں قدم رکھا - لیکن اب کی مرتبہ وہ بالکل انوکھی وضع اور ایک خاص طرز کلام کے ساتھہ اس میدان میں آئے - اور اس شان سے آئے کہ " اپنی شاعری کے لباس اور اس کے ساتھہ اپنی مولویت کی وضع قدیم کو اس آستانہ پر نذر کر دیا " [۱] -

سنہ ۱۹۱۲ع میں کانپور کی مسجد کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے ' شاعر جو جذبات کا ایک مخزن ہے انسانی ظلم و تعدی کے اس خونخوار منظر کی تاب نہ لاکر اس پر اس طرح خون کے آنسو بہاتا ہے :—

---

[۱]- رسالۂ جامعہ ' جولائی ' اگست سنہ ۱۹۲۴ع " اردو زبان کی قومی شاعری " از قاضی عبدالغفار صاحب -

اگرچہ آنکھہ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھہ حق ہے

شہداء کانپور کی نسبت یوں نوحہ خوانی کرتا ہے :—

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنجہائے گرانمایہ دفن ہیں
کچھہ بلقان کی خاک میں کچھہ کانپور میں

پابہ زنجیرانِ کانپور کے متعلق ایک خاص پیرایہ میں اپنے پانوں کے نہ ہونے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے مولانا نے جو درد انگیز انداز بیان اختیار کیا ہے وہ ان کے نازک اور لطیف حسیات کا ترجمان ہے - فرماتے ہیں :—

ہمقدم آپکا ہونا تو بہت ہے دشوار
ان کا کیاذکر جواس درد میں شامل ہی نہیں
پانوں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ
یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

کانپور کے واقعہ نے مولانا کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ انہوں نے پے در پے مختلف عنوانات سے اس پر متعدد نظمیں لکھی ہیں جو اُس وقت مختلف اخبارات میں شایع ہوچکی ہیں -

قومیات کے سلسلہ میں مولانا کی اور بھی نظمیں ہیں جو زیادہ تر ندوۃالعلماء کے ذاتی جھگڑوں ' مسلم یونیورسٹی کا وفد اور اس کے الحاق سے متعلق لکھی گئی ہیں - ان میں جس جرأت اور آزادی کے ساتھہ

نکته چینیاں کی گئی هیں وہ مولانا کے جذبۂ اظہار صداقت اور بلند معیار ترقی کو ظاهر کرتی هیں -

سیاسی نظمیں

سنه ۱۹۱۱ع میں تقسیم بنگاله کی منسوخی کے اعلان نے جب مسلمانوں میں ایک غیر معمولی هلچل پیدا کردی تو مولانا جیسے ایک حجرہ نشین عالم میں اپنے گوشۂ امن و عافیت سے باهر نکل آئے اور اس عالم اضطراب میں شریک هو گئے - اسی دوران میں جنگ بلقان چھڑ گئی اور شاعر کے دل میں " ماوراءالوطنی حب قومی " کی آگ بھڑک اُٹھی ' چنانچه " شہر آشوب اسلام " نام کی ایک پر اثر نظم انھوں نے لکھی - ریاستہائے بلقان نے ملکر ' ایک ساتھ ترکی پر حمله کیا تھا اور اس سے ترکی کو جو نقصان عظیم اُٹھانا پڑا اس پر تمام دنیائے اسلام نے خون کے آنسو بہائے تھے - انھیں اشک افشانیوں میں شاعر نے بھی اشکہائے خونیں کے چند قطرے شامل کردئے - اسلامی سلطنتوں کے زوال کی جو حسرتناک مرثیه خوانی شاعر نے کی ھے اور " مسلمانوں کی مظلومیت " کی جو درد ناک تصویر دکھائی ھے وہ نہایت پر سوز اور دلگداز ھے - فرماتے هیں :—

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اُٹھیگا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے
فضائے آسمانی کی اُڑینگی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا ' فارس گیا ' اب دیکھنا یه ھے
که جیتاھے یه ٹرکی کا مریض سخت‌جاں کب تک
یه سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ھے
اسے روکیگا مظلوموں کی آھوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائیگا شہید نیم جاں کب تک

شاعر کی مایوسی کا کیا ٹھکانا ہے جب وہ مجبور ہوکر کہتا ہے :—

جو ہجرت کرکے جائیں بھی تو شملی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

جنگِ بلقان کے سلسلہ میں وزرائے برطانیہ کے دعوائے اسلام دوستی کی تردید فرماتے ہوئے کس رقت انگیز پیرایہ میں التجا کرتے ہیں :—

پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرائے یثرب میں
کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے
کوئی جاکر یہ کہدے ہم گنہگاروں کی جانب سے
کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطاف نہاں تک ہے

مولانا کی دنیائے سیاسیات میں یہ اہم بات ہے کہ وہ احرار اور وطن پرستوں سے بھی دو قدم آگے نظر آتے ہیں ، خصوصاً ایسے زمانہ میں کہ ہنوز سیاسی ترقیات کا ظہور نہیں ہوا تھا - ان خیالات کا اظہار اُن نظموں کے ذریعہ ہوتا رہا جو انہوں نے مسلم لیگ کے متعلق لکھی ہیں - یہ نظمیں تعداد میں بارہ ہیں - اس موقعہ پر مولانا نے چند سیاسی مضامین بھی لکھے تھے جو اخبارات میں شایع ہوئے - اس روش پر ان کے بعض قدیم دوستوں نے اعتراض کیا تھا - چنانچہ " کفرانِ نعمت " کے عنوان کے تحت میں اس کا جواب یوں ارشاد ہوتا ہے :—

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم
جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئین کہن

میں نے کیوں لکھے مضامین سیاست پے بہ پے
کیوں نہ کی تقلید طرز رہنمایان زمن
کانگرس سے مجھکو اظہار براءت کیوں نہیں
کیوں حقوق ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

خیر میں تو شامت اعمال سے جو ہوں سو ہوں
آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن
آپ نے شملہ میں جاکر کی تھی جو کچھ گفتگو
ما حصل اس کا فقط یہ تھا پس از تمہید فن
سعئی بازو سےملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق
اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی" بھر پنچین"
یعنی جاکر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار
لومڑی پہونچے کہ کچھ مجھکو بھی اے سرکار من !

لیگ نے کانگریس کے " سلف گورنمنٹ " کے مقابلے میں " سوشیل گورنمنٹ " کا جو افسون حریت پھونکا تھا اس پر مولانا نے خوب خوب لطیف طنزیں کی ہیں خصوصاً احرار قوم کی بےاعتدالی اور خیرہ سری پر جس لطیف انداز میں طنزیہ نظمیں لکھی ہیں وہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں - لیگ اور کانگریس کے گلے مل جانے کی جو پیشین گوئی مولانا نے کی تھی کہ :—

کامیابی میں بس اک آدہ برس باقی ہے
لیگ سے سلسلۂ کانگریس باقی ہے

وہ آخر کو صحیح ثابت ہوئی - چنانچہ سب جانتے ہیں ک

سنہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں اس اتحاد کا جلوہ بصدارت مولانا مظہرالحق مرحوم نظر آیا تھا -

فی الحقیقت سیاسیات ایسے خشک موضوع پر مولانا کی نظموں میں جو لطیف جذبات و اشارات پائے جاتے ہیں اور دوسروں کے خیالات کے جو دلکش نقوش کھینچے گئے ہیں وہ اُردو ادبیات میں اپنی نظیر آپ ہیں ' اور بقول مولانا حسرت '' اس قابل ہیں کہ قومی ترانوں کی حیثیت سے خاص و عام کے زبان زد ہوجائیں '' [۱] -

اردو میں اس قسم کی طنزیہ نظموں کو رواج دینے کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے - ان نظموں میں سے اکثر '' کشاف '' اور '' وصاف '' کے فرضی ناموں سے اخبارات میں شایع ہوچکی ہیں - ان کے علاوہ وہ سیاسی '' شذرات نظم '' بھی بہت قابل قدر ہیں جو انہوں نے لیگ اور دیگر موضوعات سیاسی پر تحریر فرمائے ہیں -

تاریخی نظمیں

اگرچہ خالص تاریخی موضوع پر مولانا نے کوئی نظم نہیں لکھی ' لیکن بعض نظموں میں شاعر نے ابنائے ملک کی تاریخی غلط فہمیوں کا احساس کرتے ہوئے اُن کو دور کرنے کے لئے اپنی شاعرانہ قوتوں سے کام لیا ہے - '' نظام حکومت اسلام '' '' ہمارا طرز حکومت '' اور ''عدل جہانگیری'' اس کا بہترین نمونہ ہیں - خصوصاً آخرالذکر نظم میں انسانیت اور شعریت کا جو رنگ بھرا گیا ہے اور جس موزونی الفاظ ' حسن بیان ' بے تکلفی اور روانی کے ساتھ یہ نظم لکھی گئی ہے وہ مولانا کے شاعرانہ کمال کی دلیل ہے اور ان کو فطری شاعر مان لینے پر مجبور کرتی ہے - '' ہمارا طرز حکومت '' والی نظم میں اس امر کے ثبوت میں کہ :—

[۱]—تذکرۃالشعرا ' جولائی ' اگست سنہ ۱۹۱۵ء -

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

مولانا نے جو واقعہ بیان کیا ہے ' اور اس سے جو اہم نتیجہ نکالا ہے اس کو ایک شاعر ہی کا قلم ادا کرسکتا ہے ' اس کے آخر میں اپنے ملک سے شاعر مخاطب ہوکر کہتا ہے :—

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

وقتیہ نظمیں

یہ وہ متفرق نظمیں اور قطعات ہیں جن میں مولانا نے کوئی نہ کوئی واقعہ اپنے خاص شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے - اس میں ایک مرثیہ بھی ہے جس میں مولانا نے اپنے برادر عزیز مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جوانا مرگی کا ماتم کیا ہے ' جو بڑھاپے میں ان کو داغ مفارقت دیگئے - یہ مرثیہ گو بالکل سادہ اور شاعرانہ صنعتوں سے معریٰ ہے ' لیکن جذبات صادقہ ' اسلوب بیان ' اور اظہار درد و غم کے لحاظ سے ایک غیر معمولی چیز ہے ' چند رقت انگیز بند ملاحظہ ہوں :—

یہ بھی اے جان برادر کوئی جانیکا ہے طور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور
کیا ہوا تجھکو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے
آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھکو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز

میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں گئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اس کے علاوہ مختلف واقعات پر مولانا کے چھوٹے چھوٹے قطعات نہایت پر لطف اور دلچسپ ہیں - ان قطعات میں اگرچہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہوتا ہے لیکن وہ اس قدر موزوں الفاظ اور شاعرانہ انداز میں لکھا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے - ذیل کے قطعات میں اگرچہ کسی طرح کی شاعرانہ نمود و نمائش منظور نہیں ہے ' صرف امر واقعہ کا بیان مقصود ہے لیکن اُن میں بھی ایک خاص دلکشی ہے اور اُن سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو کسی اچھے شعر کو سن کر ہوا کرتا ہے -

آخر عمر میں جب سیرۃالنبی لکھنے بیٹھے تو اس کو " عمر بھر کا حاصل اور وسیلۂ نجات " سمجھ کر اپنی پچھلے علمی کارناموں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی خاتمہ بالخیر ہونے کی نسبت یوں فخر کرتے ہیں :—

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکار عالیۂ بھوپال کی طرف سے سیرۃ پاک کی کتابت و طباعت کے مصارف عطا ہونے پر اپنا اور فرمانروائے موصوفہ کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :—

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایتہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر موادل ہے میری جاں ہے
غرض اس کام کی تکمیل میں دو ہاتھ شامل ہیں
کہ جن میں اک گدائے بینوا ہے ایک سلطاں ہے

اس قطعہ میں لفظ " سلطان " کا استعمال خاص طور پر داد طلب ہے کہ اس میں بیگم صاحبہ مرحومہ کے اسم گرامی " سلطان جہاں " کی طرف اشارہ ہے -

سیرۃ پاک کو کماحقہ لکھنے کی اہمیت اور اس کے عدم امکان کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے :—

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حال سرور عالم
دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی
کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

سنہ ۱۹۱۱ع میں جزیرہ کا سفر کرتے ہیں، وہاں پہنچ کر آب و ہوا کی لطافت سے متاثر ہوتے ہیں اور ارتجالاً ایک غزل لکھتے ہیں جس کے دو شعر یہ ہیں :—

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر مئے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ اطف یہ سبزہ یہ منظر یہ بہارستاں
عطیہ تمکو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

ان دلچسپ قطعات میں بعض وہ قطعے بھی ہیں جن پر " مطائبات " کا اطلاق ہوتا ہے - مولانا کی شاعری کا ایک نہایت دلچسپ جزو ان کے لطیف اشارات و طنزیات ہوتے ہیں جن کو سمجھنے والے سمجھکر لطف اٹھاتے ہیں - اُردو کے ایک نکتہ شناس ادیب کی رائے ہے کہ :—

" اردو میں اُن (شبلی) کے مطائبات نظم کو جو جدید پیداوار ہیں ' ان کے سلسلۂ کمالات سے علیحدہ کرکے دیکھئے ' جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں - یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے ' شوخی کے ساتھ سلجھیدگی ' یہ معلوم ہوتا ہے ' دور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے " [۱] " مطائبات " کی چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں :—

(۱) نواب محسن‌الملک کی وفات کے بعد علیگدہ کالج کی نظامت کے لئے جب کہ نواب وقارالملک کا نام پیش کیا جا رہا تھا ' اس وقت ترسٹیوں میں سے ایک اور صاحب بھی کوشاں تھے جو قوم فروشی میں مشہور ہو چکے تھے - اس پر مولانا نے قطعۂ ذیل کہا :—

وقارالملک اگر ہوں جانشین مہدی اعظم
تو اس تجویز کا منکر تو کوئی ہو نہیں سکتا
تعجب ہے کہ اک دجال بھی ہے اس کی کوشش میں
مگر ظاہر ہے یہ دجال مہدی ہو نہیں سکتا

(۲) مولانا کے قیام الہ‌آباد کے اثناء میں حضرت اکبر الہ‌آبادی مرحوم ان کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہوئے اشعار ذیل بطور رقعۂ دعوت بھیجتے ہیں :—

---

[۱]—افادات مہدی صفحہ ۲۱۳ -

" آنا نہیں مجھکو تھلہ تبلی بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اتھاؤ آج کی رات کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا سمجھو اس کو پلاؤ قلیا "

اس کے جواب میں مولانا دعوت میں شریک نہ ہو سکنے کا عذر پیش کرتے ہوئے قطعۂ ذیل لکھ بھیجتے ہیں :—

" آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں
حلقۂ درگوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے " تیمور " ہوں میں

ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں " امید ہے کہ میرا یہ عذر " عذر لنگ نہ سمجھا جائےگا " !

(۴) بمبئی کی مشہور مسلمان ذي علم خاتون عطیہ بیگم ایک نو مسلم یہودی مصور سے شادی کرتی ہیں - اس تقریب میں " تحفۂ شادي " کے طور پر مولانا ان کو اشعار ذیل بھیجتے ہیں :—

" بتان ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے !

عطیہ کی زبانی فرماتے ہیں :—

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھکو کوئی اپنی طرف
اس لئے ننگ قرابت سے مجھے دوری تھی
آرتست آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ مجھکو جو کھینچا تو یہ مجبوری تھی

اس میں شک نہیں ہے کہ جدید اردو شاعری میں اس قسم کی نظموں لکھکر مولانا نے اظہار خیال کے لئے ایک نیا باب کھول دیا ' اور اسی کا اثر تھا کہ دوسرے شعرا نے بھی اس طرف توجہ کی - چنانچہ سیاسیات پر اس قسم کے مطائبات لکھنے والوں میں اکبر ' اقبال اور ظفر علی خاں کامیاب مترجم کہے جاسکتے ہیں - لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود مولانا اپنی ان نظموں کی نسبت کوئی زیادہ بلند رائے نہیں رکھتے تھے ' چنانچہ " چمن زار بمبئی " سے مسٹر ایم مہدی حسن کو لکھتے ہیں :—

" کشاف کی ہزلیات جو کچھ ہوں اسی طرف رکھئے - حسن ظن کو اتنا کیوں بڑھاتے ہیں - اور بڑھانا ہی تھا تو " مطایبات " کا لقب زیادہ موزوں تھا........الہلال میں میری خاص نظمیں اب چھپینگی جن میں اخلاق عرب کے واقعات ہیں ان کو دیکھئے گا - محض تاریخی واقعات ہیں ' انشا طرازی نہیں " [۱] -

قطعات شبلی کے متعلق ایک بات عجیب ہے کہ ان کی ظاہری ابتداء غالباً اخبار الہلال کے ساتھ ہوئی اور خاتمہ بھی اسی کے ساتھ ہوگیا - آپکا آخری قطعہ زیر عنوان " مسجد نبوی " ۱۳ ذوالحجہ سنہ ۱۳۳۲ھ کے الہلال میں شایع ہوا جس کے بعد صرف ایک پرچہ اور نکلا جس میں علامہ مرحوم کے انتقال کی خبر درج تھی -

بقول مولانا حسرت " پختگی کلام ' برجستگی مضمون ' آزادی خیال ' ندرت بیان ' اور نوی طرز غرض کہ ہر حیثیت سے یہ قطعے اپنا آپ جواب ہیں ' اور کچھ عجب نہیں کہ غالب کے اردو کلام کے

---

[۱]—مکاتیب جلد ۱ ' صفحہ ۲۲۳ -

مانند رفتہ رفتہ شبلی کی اردو شاعری ان کی فارسی شاعری پر غالب آجاتی [۱] -

اردو تصانیف شعری

مولانا کی اردو تصانیف شعری میں مثنوی صبح امید ' مسدس موسوم بہ تماشائے عبرت ' اور ان کے متفرق کلام کے مختلف مجموعے نالۂ شبلی ' کلام شبلی وغیرہ کے نام سے شایع ہوچکے ہیں جو بہت غلط سلط چھپے ہیں - خود مولانا کو اس کا علم تھا ' اور اس لئے وہ خود چاہتے تھے کہ ان کی مرضی کے مطابق ان کا کلام شایع ہو - چنانچہ مولوی محمد امین زبیری کو اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :—

" نالۂ شبلی دیکھا ' اشعار غلط چھپے ہیں - میں نے اُن کو لکھا کہ پروف بھیج دیجئے ' میں تصحیح کروں گا ' لیکن انہوں نے جواب تک نہ دیا - بہر حال آپ اگر سیاسی نظمیں بھی چھاپنا چاہتے ہیں تو ضرور ہے کہ میرے تینوں آرٹکل " پولیٹکل کروٹ " والے بھی شامل کیجئے - اس نظم کی وہ نثر شرح ہے - کچھہ دیباچہ بھی ہونا چاہئے وہ میں لکھ دوں گا " [۲] -

لیکن شاید اس مجموعہ کی چھپنے کی نوبت نہیں آئی - اپنی نظموں کو بالترتیب چھپوانے کا بھی مولانا کو خیال تھا - چنانچہ انہیں زبیری صاحب کو لکھتے ہیں :—

" نظموں کے دو حصے ہونے چاہئیں - اخلاقیات و سیاسیات ' کشاف و صاف کے نام کی نظمیں سیاسیات کے عنوان میں رہیں - دونوں حصے اس طرح چھاپے جائیں کہ مجموعہ بھی اور الگ الگ بھی

[۱]—تذکرۃالشعراء ' جولائی و اگست سنہ ۱۹۱۵ع صفحہ ۲۲—۲۳ -

[۲]—مکاتیب جلد ۱ ' صفحہ ۲۴۳ -

فروخت ہوسکیں - بہت سے موقع ہوں گے جہاں صرف اخلاقیات کی اشاعت ہوسکے گی ، سیاسیات اگر غیر ممکن ہوں گے تو مجموعہ رک جائے گا - اردو نظمیں جس قدر الہلال میں ہیں سب لکھوا کر میرے پاس بھجوا دیجئے تو یاد آئے کہ اور کیا کیا باقی ہے - میرے پاس کچھ موجود نہیں - لیکن دماغ پر زور ڈال کر پکڑ لا لوں گا " [۱] -

غالباً یہ مجموعہ بھی " روشنی طبع " سے محروم رہا -

آخر میں مولانا کی وفات کے بعد دارالمصنفین نے " کلیات اردو " کا ایک صحیح اور جامع اڈیشن شایع کیا لیکن اس میں سے مولانا کے زمانۂ جاہلیت کا کلام نکال دیا گیا ہے - بلکہ بعض قطعات اس میں بھی نہیں ملتے - مثلاً نواب وقارالملک والا قطعہ - تاہم یہ مجموعہ صحت اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے بسا غنیمت ہے -

حالی اور شبلی

"بعض ادبی حلقوں میں حالی اور شبلی کا مقابلہ کیا جاتا ہے - میرے خیال میں دو شاعروں کا مقابلہ کرنا ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ہرایک کے بس کی بات نہیں ہے - شاعری اور ادب کی دنیا میں ذوقیات کا سوال نہایت اہم سمجھا جاتا ہے - اس میں تمام‌تر اصول فن پر دارومدار نہیں رکھا جاسکتا - اور اس بنا پر ایک شاعر کو دوسرے پر فضیلت اور ترجیح دینا بہت مشکل ہوجاتا ہے - پھر حالی اور شبلی میں گو امر مشترک صرف " قومیات " کا موضوع ہے ، لیکن نفس شاعری اس کے علاوہ ایک " چیزے دیگر " کی حیثیت رکھتی ہے - اس لئے مقابلہ کا سرے سے سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا - اگر یہ مقابلہ ہو تو اسی قسم کا ہوگا

---

[۱]ــــمکاتیب جلد ۱ ، صفحہ ۲۳۸ -

جیسا کہ فردوسی اور نظامی کا جس میں اول الذکر کو " پیغمبر سخن " ماننے کے بعد بھی آخرالذکر کو " خدائے سخن " تسلیم کیا گیا ہے - یہاں ہم شبلی کے ساتھ حالی اور دیگر معاصرین کا موازنہ کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ بلحاظ فن شعر شبلی کا مرتبہ کس قدر اپنے معاصرین سے بڑھا ہوا ہے -

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو کے اساطین ادب میں جن کو خود مولانا شبلی نے " عناصر اربعہ " کا لقب دیا اور جس میں بعد کو وہ بھی بحیثیت " عنصر خامس " شامل کر دئے گئے ' باستثنائے سرسید مرحوم سب کے سب سخن سنج اورسخن فہم تھے - لیکن ان میں صحیح معنوں میں " شاعر " کون تھا ؟ یہ ایک مشکل سوال ہے جس کے مختلف جوابات ملیں گے - میری ناقص رائے میں تو شبلی آزاد اور نذیر احمد سے بہتر اور حالی سے کسی طرح کم رتبہ نہیں تھے بلکہ اپنی آخری دور کی اردو شاعری کے اعتبار سے وہ ان سے بڑہ کر تھے - سب سے پہلے آزاد کو لیجئے ان کی شاعری برائے نام اور زبردستی کی شاعری ہے - اس لئے کہ وہ اپنی شاعرانہ قوت کو نثر میں کھپا چکے تھے - تاریخ ادب اردو کے مؤرخ کا بیان ہے کہ " آزاد مثل حالی شاعری کے دلدادہ نہ تھے ان کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک و صاف نہیں ...... ان کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جس قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہوسکا " [۱] ذوق دہلوی کے شاگرد ہونے اور محکمۂ سرشتہ تعلیم کے ایماد سے جدید طرز کی نظمیں لکھنے کے باوجود وہ اردو شاعری میں کوئی خاص درجہ نہیں پیدا کرسکے ' خصوصاً مولانا حالی کے ہوتے ہوئے

---

[۱]—تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ترجمۂ اردو صفحہ ۳۹۶—۳۹۷ •

ان کی جدید شاعری کسی خاص وقعت کی مستحق نہ تھی - اسی طرح نذیر احمد " آقائے اردو " تسلیم کئے جائیں ' لیکن ان کو شاعر کہنا گویا شاعری کا منہ چڑھانا ہے - انہوں نے نہ خود کو کبھی شاعر مانا ' نہ دوسروں نے ان کو - گو ان کے خلف الرشید مولوی بشیرالدین صاحب کہا کریں کہ " زمانۂ حال کی نئی روشنی کے شعرا میں حالی و شبلی اور میرے والد نے دے کے یہ تین ہی شخص ایسے تھے کہ جو " ٹرپل الیلس " (اتحاد ثلثہ) کہلائے جا سکتے ہیں " [۱] لیکن ان کی قومی نظمیں محض آورد اور وقتی اُپج سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں جن میں حسن شعر کی بجائے " حسن ادا " کو زیادہ دخل ہوتا تھا - لیکن پڑھنے والوں کے مذاق سخن یا بزرگانہ ادب کی داد دیجئے کہ ان کو " ان نظموں میں بھی وہی مزہ ملتا ہے جو حالی اور شبلی کی نظموں میں " [۲] -

جدید اردو شاعری کی ایجاد کا سہرا اگرچہ آزاد کے سر ہے ' لیکن صحیح طور پر یہ شرف حالی کو پہونچتا ہے ' جنہوں نے ایک سچے پیغام کو شاعر کی طرح اپنی شاعری کی بدولت اپنی متنزل اور گری ہوئی قوم کی تمدن و معاشرت ' اور اخلاق حتیٰ کہ ادبیات تک کی اصلاح کا زبردست کام انجام دیا - لیکن ان کی دور قدیم کی شاعری کے مقابلے میں ان کی جدید شاعری پر نقادان سخن " شاعری " کا اطلاق صحیح نہیں سمجھتے - مسدس حالی کی احمقانہ تردیدوں اور اس کے خلاف اوباشانہ پھبتیوں اور رندانہ آوازوں سے قطع نظر کر کے ' نیز زبان و محاورات

---

[۱]—مجموعۂ نظم بے نظیر دیباچہ صفحہ ۳ -

[۲]—مجموعۂ نظم بےنظیر دیباچہ صفحہ ۳ -

اور روزمرہ و متروکات کی بحث کو چھوڑ کر اہل علم کے طبقہ میں ' سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھنے والوں میں جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے ' مولانا حالی کا جدید طرز سخن مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا - میری ناقص رائے میں تو جس طرح مولانا حالی کی نثر موزونیت الفاظ ' ندرت و قوت بیان ' اعلیٰ سلیقۂ اظہار خیال کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نثر کے مقابلہ میں بلند نہیں ہے ' اسی طرح ان کی جدید شاعری بھی زور بیان ' علو جذبات اور کیفیات شعری کے لحاظ سے مولانا شبلی کی شاعری کے مقابلہ میں پھیکی اور کم رتبہ ہے - اس لئے یہ کہنا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کی شاعری میں جس بات کی کمی رہ گئی تھی شبلی نے اس کی تلافی کردی - اس معاملہ میں ایک کہنہ مشق ادیب اور سخن فہم بزرگ کی رائے ہے کہ حالی کی شاعری سوائے ان کے محدود حلقۂ احباب کے عام طور پر قبول نہیں ہوئی [۱] - ادیب شہیر مہدی حسن جو حالی اور شبلی دونوں کے مرتبہ داں تھے اپنے ایک مضمون کے دوران میں فرماتے ہیں :—

" اگر اشعار کی لطافت اور خوبی ایک وجدانی چیز ہے اور اس کا سمجھنا ذوق صحیح پر منحصر ہے اور ان خوبیوں کو دکھانا بڑے اہل کمال کا کام ہے تو میں خوش ہوں کہ شبلی حضرت حالی کے حریف مقابل نہ سہی تاہم وہ شاعری کے ملکۂ راسخہ اور ادنیٰ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اتنی اونچی سطح پر ہیں کہ بڑے بڑے مستشرقین یورپ بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے " [۲] -

---

[۱]—Zutshi, Gleanings, P. 260

[۲]—افادات مہدی صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴ -

یہ خیال بہت بڑی حد تک صحیح ہے کہ اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اُردو شاعری اور صرف شاعری کے لئے وقف ہوجاتے تو وہ حالی سے بہت آگے نکل جاتے - ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں - اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے [۱] یہاں ہم کو ان لوگوں کے خیالات سے بحث نہیں ہے جو اُن بچوں کی طرح جو ہر خوبصورت کھلونے پر مچل جایا کرتے ہیں ' ہر پسندیدہ مجموعۂ اشعار کو " الہامی کتاب " کہدینے میں تأمل نہیں کرتے ' بلکہ جن لوگوں نے سنجیدگی سے ادب اور شعر کے مفہوم کو سمجھکر اس کا بغور و تفحص مطالعہ کیا ہے اُن کی رائے اس معاملہ میں بہت کچھ قابل وقعت و اعتنا ہوسکتی ہے - " جدید اُردو شاعری " کے مصنف نے بالکل سچ کہا ہے کہ بعض نقاد حالی کی شاعری کو محض " منظوم خیال " سمجھتے ہوں [۲] حالی کی جدید شاعری کو صحیح معنوں میں " شاعری " تسلیم نہ کریں ' اور شبلی کی شاعری کو اس کے مقابلہ میں ترجیح دینے کے وجوہات پر اُردو کے ایک جید مگر کم مشہور نقاد ادب کی رائے خاص طور سے قابل ذکر ہے - لکھتے ہیں :—

" صحیح شاعری تو وہ ہے جو حقائق کو رنگینیوں سے اس طرح لبریز کردے کہ ہر شعر اپنے علم کی لطافت میں قرآن کی ایک آیت اور اپنے عمل کی وسعتوں میں حدیث کا ایک ٹکڑا بن جائے - حقیقتیں مذہب و ملت کی پابند نہیں رہتیں ایک حقیقی شاعر کا یہ فرض نہیں کہ کسی مذہب یا کسی نظام اخلاق کے ایک ایک جزو کو

---

[۱]—مجموعۂ نظم شبلی کا دیباچہ از مولوی ظفرالملک -

[۲]—جدید اردو شاعری از مسٹر عبدالقادر سروری ایم - اے ' صفحہ ۱۳۸ -

صراحتاً بیان کرے - اس کے لئے " راہ نجات " اور " بہشتی زیور " کافی ہیں - صحیح مذہب وہ ہے جو نا قابل برداشت نہ ہو ' اور صحیح اخلاق وہ جو حقائق کی مشکلات کو تخیل کی رنگینیوں اور تصور کی لطافتوں سے آسان کر دے - اس کا یہ منصب نہیں کہ یتیم خانوں اور حاجیوں کی آمد پر اپنی صلاحیتوں کو قربان کر دے - ایسی شاعری سے خاموشی بہتر ہے - اگر اس مسئلہ کو آپ مثال سے واضح کرنا چاہتے ہیں ' مولانا شبلی پر نظر کیجئے - ان کی اُردو شاعری زیادہ تر روز مرہ کے واقعات سے متعلق ہے لیکن ان کا شعر حقیقتاً شعر ہوتا ہے - ناقابل برداشت نثر نہیں ہو جاتا - اگر وہ کبھی اخلاق کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں ' اس لطیف انداز سے کہتے ہیں کہ وہ ناصح کی بےمزہ اور تکلیف دہ مصیبت نہیں بن جاتی ' جو بجائے اصلاح کرنے کے انسان کو اور مشتعل کردے - حالی اپنی سعی اصلاح میں خشک ہو کر رہگئے ' ورنہ حالی وہ بھی تھے جنھوں نے یہ شعر کہا تھا :—

تعزیر جرم عشق ہے بےصرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حقیقت یوں بھی ادا کی جاسکتی ہے " -

مجھے حالی کی شخصیت سے کوئی کاوش نہیں - اُردو شاعری میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے - لیکن اس اعتراف کا یہ تقاضا نہیں کہ میں ان کی شاعری کے ہر دور کو تسلیم کرلوں - میرا خیال تو یہ ہے کہ وعظ و تلقین کے سلسلے میں انہوں نے جس قدر شاعری کی وہ سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں - انہیں مسائل کو وہ نثر میں ادا کرسکتے تھے اور کامیابی کے ساتھ - نظم کی زحمت انہوں نے ناحق گوارا کی - میں استخواں پرستی کا قائل نہیں نہ ہر اُس پیغمبر سخن کو شاعر

سمجھیں جسکے ہر لفظ کو جہلا وحی و الہام سمجھتے ہیں - ...... میں تو اس حالی کا قائل ہوں جس نے " مقدمہ " کے قبل شاعری کی اور شاعری کے بعد مقدمہ لکھا - وہ شاعری جو اصلاح کرنا چاہتی ہے اخلاقی حیثیت سے ممکن ہے خوب ہو ' مگر شاعری نہیں " [۱] -

اسی خیال کا جو سطور بالا میں بیان ہوا ' اعادہ کرتے ہوئے ہمارا شیوا بیان انشا پرداز مہدی لکھتا ہے :—

" حالی کو میں اُن لوگوں کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو ان کو ایک اچھا شاعر سمجھتے ہیں ' مگر اس استثناء کے ساتھ کہ غزل داغ کا حصہ ہے ' بےشک ان کی نیچرل شاعری مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی نہایت اعلی درجہ کی ہے ' خاصکر مسدس کی بلحاظ جن امور پر رکھی گئی اور جو مٹیریل استعمال کیا گیا ہے صرف حالی کا حصہ ہے - لیکن اپنا اپنا خیال ہے - میرے ذہن میں حالی کی عظمت " دیوان حالی " کے اس حصہ سے ہے جو مقدمہ شاعری کی حیثیت سے لکھا گیا " -

تذکرہ نویسوں کی بےاعتنائی

آخر میں اس امر کی شکایت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ کے بعض تذکرہ نویسوں اور مورخین ادب نے علامہ شبلی کی شاعری کو قابل اعتنا نہ سمجھ کر ان کا ذکر ہی نہیں کیا - یا اگر کیا ہے تو نہایت معمولی حیثیت سے - اگر اُردو میں مولانا کو ایک بلند پایہ نامور شاعر کا درجہ نہ دیا جائے محض اس وجہ سے کہ وہ " صاحب دیوان " نہیں ہیں ' یا انہوں نے اعلی درجہ کی غزلیات نہیں لکھیں ' تو اُن گمنام اور غیر معروف شعراء کو ان تذکروں میں کس لئے جگہ دی گئی ہے جنہوں نے تک بندیوں کا

---

[۱]—مختصر خیال از سجاد علی انصاری مرحوم ' صفحات ۷۳—۷۲ -

ایک دفتر بےپایاں تیار کر دیا ہے اور جو " غرق مئے ناب اولیٰ " کا صحیح طور پر مصداق ہے - شاید یہ خیال بھی ہو کہ مولانا کے دیگر کمالات علمیہ ان کے شاعرانہ کمال پر غالب آگئے ہوں ' اس لئے شاعری اُن کے چہرے پر نہیں کھلتی - پھر یہ بھی ہو کہ ایک عالم دین ہونے اور جماعت علماء سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کو مصلحتاً شعراء کی صف میں بٹھانا پسند نہ کیا گیا ہو ' لیکن ایک باکمال ہستی کے تمام اوصاف جب معرض بیان میں آئیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر وصف اور کمال پر نظر ڈالی جائے اور اس کے ایک ایک وصف کو نمایاں کر کے دکھایا جائے - مولانا کے لائق شاگرد نے اُردو شاعری کے قدیم دور سے لیکر عہد حاضر تک از ولی تا جوش ملیح آبادی تمام شعراء کا مستقل حیثیت سے ذکر کیا ہے [۲] مگر یہ دیکھ کر تعجب اور اس کے ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے مولانا کو مستقل شعراء کی صف میں کوئی درجہ و امتیاز نہیں بخشا ' شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ انہوں نے اپنے بزرگ استاد مرحوم کو جو ایک بلند پایہ مذہبی عالم ' ایک مستند مورخ اور نامور ادیب و انشاء پرداز کی حیثیت سے اپنے تمام معاصرین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے ' شعرا کی صف میں بٹھانا پسند نہ کیا ہو - لیکن شبلی کی شاعرانہ حیثیت مستقل اور تنہا اظہار خیال چاہتی تھی اور میرے خیال میں شعر و سخن کی دنیا میں مولانا کی یہ حق تلفی ہے جو ان کے ایک شاگرد رشید سے ہو سکتی تھی - اردو شاعری پر مولانا کا جو حق اور احسان ہے اور اس میں انہوں نے اپنا جو غیر فانی حصہ پیش کیا ہے

---

[۲]---شعرالہند از مولوی عبدالسلام ندوی -

وہ اس سے کہیں زاید قدر و ستایش کا مستحق ہے کہ محض سرسری طور پر ان کا ذکر کیا جائے -

اس طرح گل رعنا کے مصنف نے بھی جن سے بڑہ کر مولانا کی اردو شاعری کے قدر شناس اور کم ہو سکتے ہیں ' اپنے تذکرہ میں مولانا کا نام تک نہیں لیا - مزید تعجب تو اس بات پر ہے کہ تاریخ ادب اردو میں شاعری کے ضمن میں نہایت معمولی طور سے مولانا کی شاعری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (جو اگرچہ اصل انگریزی متن میں موجود ہے مگر نہ معلوم کیوں ترجمہ ہونے سے رہ گیا) چنانچہ کتاب مذکور پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا احسان احمد صاحب احسان بالکل صحیح طور پر رقم طراز ہیں :—

" تعجب ہے کہ اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے علامہ شبلی کی جدید تاریخی سیاسی اور اخلاقی نظموں کو نظرانداز کردیا - اگرچہ لائق مصنف نے علامہ مرحوم کے حالات میں اس کی طرف معمولی طور پر اشارہ کردیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظمیں خاص اہمیت کی مستحق ہیں ' حالی آزاد وغیرہ نے اردو شاعری کے دائرۂ خیال کو جس حد تک وسیع رکھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے ' لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں کو غالباً سب سے پہلے مولانا ہی نے رواج دیا - علاوہ اس کے " طنز لطیف " کی آمیزش بھی مولاناہی کا کارنامۂ فخر ہے - یہ نظمیں در اصل اردو شاعری کے سرمایۂ سخن میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں جس کو اردو لٹریچر کا کوئی مورخ آسانی کے ساتھ نظرانداز نہیں کر سکتا " [ا] -

---

[ا]—رسالۂ هندوستانی جلد ۱ ' حصہ ۲ ' صفحہ ۲۸۳—۲۸۲ -

خمخانۂ جاوید میں بھی مولانا کی نسبت صرف چند سطروں پر اکتفا کیا گیا ہے ، گو مؤلف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ " واقعات نویسی میں جو کمال اور سحر بیان آپ کو حاصل تھا اس کی مثال پیش کرنی آسان نہیں " [۱] - اس طرح مؤلف نے صرف چند سطروں پر ٹالا ہے -

صاحب سیرالمصنفین جو خود بھی ایک سخن فہم اور سخن سنج ادیب ہیں مولانا کو " فطری شاعر " اور " فارسی اردو کا ایک مقبول عام اور دقیقہ رس شاعر " مان لینے کے با وجود ان کو " شاعر " نہیں تسلیم کرتے - فرماتے ہیں :—

" مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ وہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے ، بلکہ علم کے عالم میں ان کی شان ایک شاعر کے درجہ سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی " [۲] -

اگرچہ یہ " اجتماع ضدین " ہماری سمجھ میں نہیں آیا - لیکن جو شخص ایک شاعر و عالم کے مابین موازنہ و تفریق کر سکتا ہو وہ بہرحال ایسی رائے رکھنے کے لئے ایک حد تک معذور سمجھا جاسکتا ہے -

بمبئی ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

---

[۱]—خمخانۂ جاوید جلد ۲ ، صفحہ ۲۷۵—۲۷۳ -

[۲]—سیرالمصنفین جلد دوم صفحہ ۲۰۷—۲۲۶ -

صوبہ اودھ کے سکے

(از رائے بہادر جناب پریاگ دیال صاحب)

صوبہ اودھ کے سکوں کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر اس کے تواریخی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالنا لازمی ہے تاکہ صاف طور پر یہ ظاہر ہو جائے کہ کس کس موقعہ پر اور کن کن وجوہات سے اس صوبہ میں سکے جاری ہوئے -

سنہ ۱۷۲۰ع میں محمد شاہ بادشاہ دھلی نے اپنے وزیر سلطنت سعادت خاں کو صوبہ‌دار اودہ مقرر فرمایا - سعادت خاں کا اصلی نام محمد امین تھا جو کہ خراسان میں نیشاپور کے سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا - اس عہدے پر مامور ہوتے ہی اس نے اپنا لقب برہان‌الملک اختیار کیا اور دھلی چھوڑ کر اپنے صوبہ میں چلا آیا اور لکھنؤ و اجودھیا کو اپنا خاص قیام گاہ بنایا -

یہ پہلا نواب تھا جسنے مچھلی کی شکل کو اپنا خاص نشان قرار دیا - اس کے بارہ میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز برہان‌الملک جمنا کے کنارے ھاتھ اٹھائے نماز پڑھ رہا تھا جبکہ ایک مچھلی پانی سے اچھل کر اس کے ھاتھوں میں آگئی - اس واقعہ کے تھوڑی ھی دیر بعد اس کو اودھ کی صوبیداری مل گئی - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس واقعہ کی اصلیت کس حد تک صحیح ہے مگر یہ ضرور ہے کہ مچھلی کا نشان اودہ میں بہت ہی مبارک سمجھا جاتا ہے اور بالعموم پرانے مکانوں کے صدر دروازوں پر موجود ہے اور ایک شگون سمجھا جاتا ہے - برہان‌الملک نے لکھنؤ کے قلعہ لکھنا کا نام اسی وجہ سے مچھی

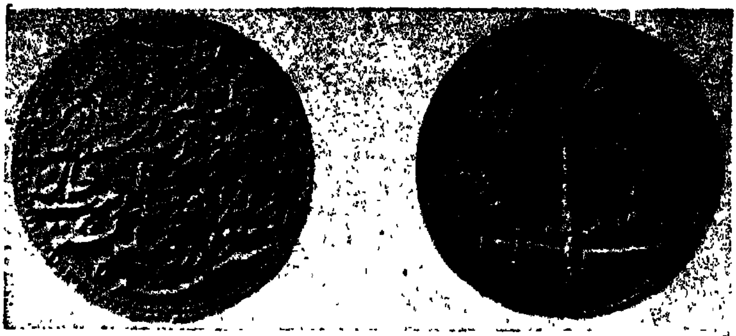
بھیج رکھا تھا - سنہ ۱۷۳۹ع میں سعادت خاں کا انتقال ہوا - اس کی جگہ اُس کا داماد منصور علی خاں صفدر جنگ اودہ کا صوبیدار ہوا اور سنہ ۱۷۴۷ع میں دھلی سلطنت کا وزیر بھی مقرر کیا گیا - اس وقت سے وہ اور اُس کے جانشین نواب وزیر کہلانے لگے - یعنی نواب صوبہ اودہ اور وزیر سلطنت مغلیہ دھلی - صفدر جنگ نے شہر فیض‌آباد کی بنیاد از سر نو ڈالی اور زیادہ تر وھیں سکونت پذیر رھا - سنہ ۱۷۵۳ع میں اس کا انتقال ہوا اور شجاع‌الدولہ اس کی جگہ اودہ کی گدی پر رونق افروز ہوا -

سنہ ۱۷۵۴ع عالمگیر ثاني بادشاہ دھلی کے عہد میں بنارس کی ٹکسال کا انتظام اس کے سپرد ہوا اور سنہ ۱۷۷۵ع یعنی شجاع‌الدولہ کی وفات تک یہ ٹکسال اُسي کے زیر اھتمام رھی اور اسمیں سکے بادشاہ شاہ عالم ثانی کے نام سے ڈھلتے رہے -

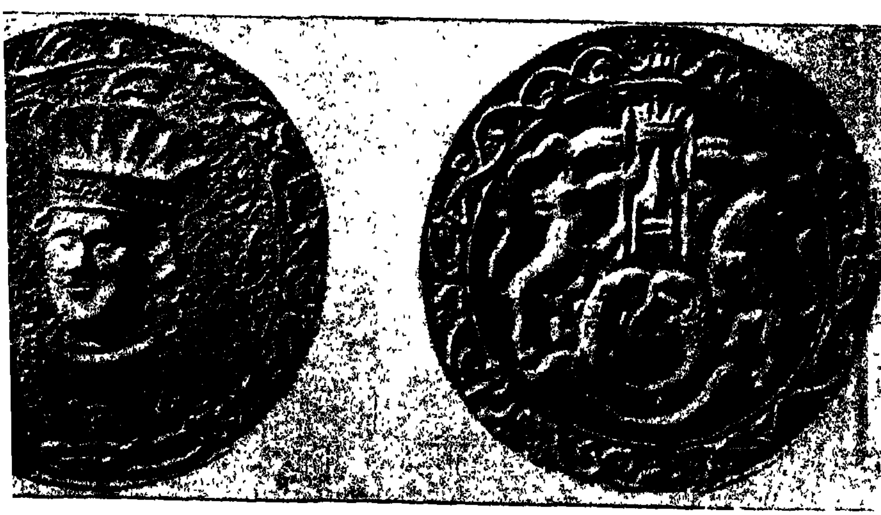
سنہ ۱۷۷۵ع میں اضلاع بنارس و جونپور زیر تحت ایسٹ انڈیا کمپنی ہوے مگر اسکے کچھہ عرصہ قبل بریلی کی ٹکسال بھی جاری ہو چکی تھی - نواب شجاع‌الدولہ بہادر اور انگریزی فوج کے سپہ سالار جنرل چیمپین صاحب (Champion) نے ملکر روھیلوں کو جن کا کہ سپہ سالار حافظ رحمت خاں تھا بمقام میران کٹرہ جو کہ ضلع شاھجہاں‌پور میں واقع ہے سنہ ۱۷۷۴ع سنہ ۱۱۸۸ھ میں شکست دی اور اس فتحیابی کی خوشی میں ایک تمغہ نقرئی ٹکسال بریلی سے جاری کیا - یہ تمغہ (پلیٹ ا - نمبر ا) بہت ھی کمیاب ہے اور صرف دو تین نمونے اب تک مل سکے ھیں - خوش قسمتی سے یہ تمغہ لکھنؤ عجایب خانہ میں موجود ہے - اس کا وزن ۵۸۸.۵ گرین ہے اور قطر پونے دو انچ ہے - اس کے پہلی جانب یہ کتبہ ہے :—

هندستانی"

پلیت ۱ - نمبر ۱

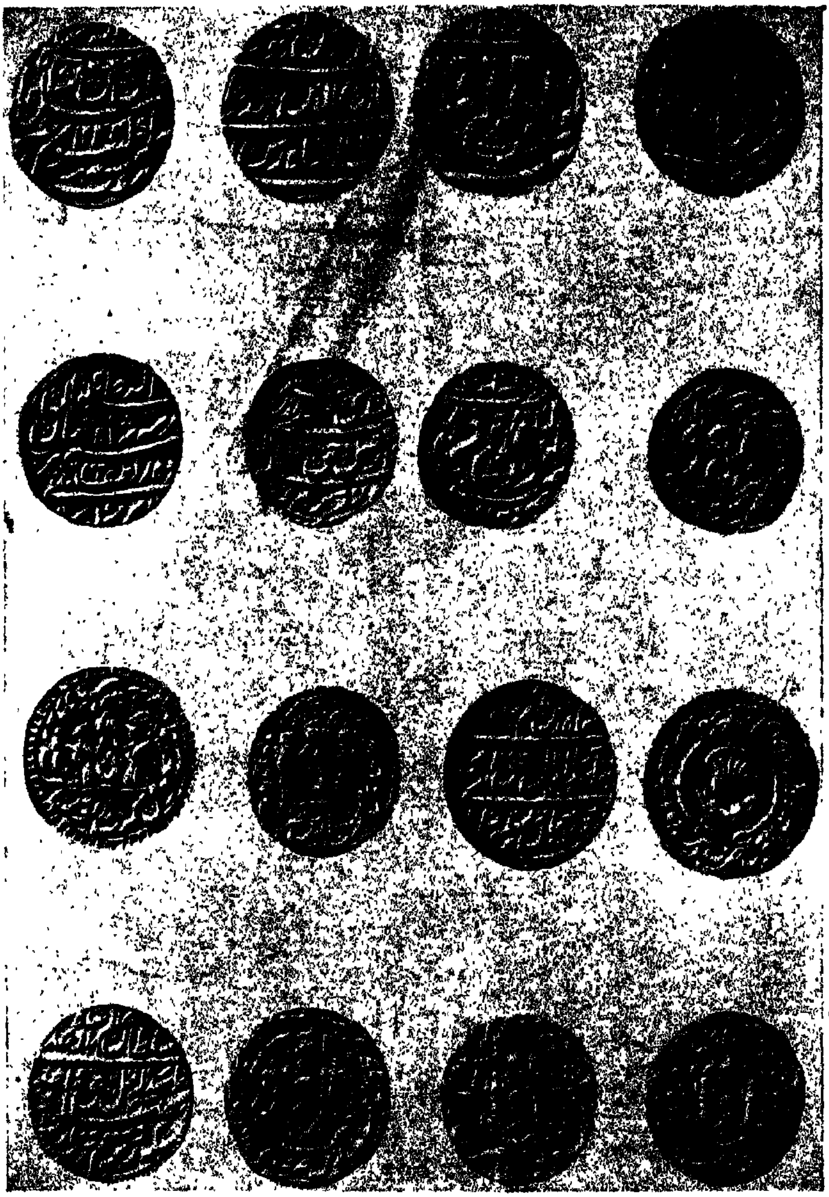


پلیت ۱ - نمبر ۲



پلیت ۲

۲



۳

۶

۹

۱۰ ۱۱ ۱۲

نواب

شجاع‌الله وزیر اعظم صد

یازدهم صفر روز شنبه سنه ۱۱۸۸ھ در الہی کہیرۃ

روہیلہ ہارا زدہ و حافظ رحمت خاں

سردار روہیلہ کشتہ شدہ

اور دوسری جانب ایک نقطہ دار دائرہ کے اندر ایک دو ملبہی تلوار سبد ہی کہڑی ہے اور اس کے قبضہ پر گذرتے ہوے اور زاویہ قائمہ بناتے ہوئے ایک دوسری معمولی تلوار ہے - تمغہ کی گولائی میں یہ کتبہ لکھا ہے :—

انا فتحناہ فتحاً مبینا

یفرحون بہندا سکان‌الہند

نواب شجاع‌الدولہ نے ۲۹ جنوری سنہ ۱۷۷۵ع کو وفات پائي - اس کا مقبرہ گلاب باڑي فیض‌آباد کی خاص عمارتوں میں اب تک موجود ہے -

نواب آصف‌الدولہ اپنے والد ماجد نواب شجاع‌الدولہ کی جگہ پر رونق پذیر ہوے اور بجاے فیض‌آباد کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور اسکو کافی زینت دی - عالیشان عمارتیں مثلاً دولت خانہ ' رومی دروازہ ' کوٹھی بیبیاپور ' چلہنت ہاوس اور بڑا امام‌باڑہ تعمیر کرائیں - خود دولت خانہ کے اندر آصفی کوٹھی میں بود و باش اختیار کی - یہ دریادلی ' یہ خوش نیتی اور سخاوت کا ایک رکن تھا - ذیل کی کہاوت مشہور ہے " جسکو نہ دے مولا اس کو دے آصف‌الدولہ " -

یہ کلمہ خیر اس کے انتقال کے بہت دنوں بعد تک دوکاندار اپنی دوکان صبح کہولتے وقت کہتے تھے - اس نے جارج سویم بادشاہ انگلینڈ کے شفا پانے پر پچیس ہزار روپیہ ڈاکٹر کی نذر کیا اور پچیس ہزار اس کے

نام سے غریبوں اور محتاجوں کو تقسیم کردیا - اس کے عہد میں مچھلی دار روپیے جن پر سنہ جلوس ۲۶ موجود ہے بادشاہ شاہ عالم کے نام سے بنتے رہے - اس نے ۲۱ ستمبر سنہ ۱۷۹۷ع کو لاولد انتقال کیا اور مچھی بھون کے امام‌باڑہ میں دفن کیا گیا - اس کے بعد وزیر علی اور سعادت علی خاں تخت نشین ہوے مگر انکے عہد میں کوئی خاص سکہ یا تمغہ جاری نہیں ہوا -

غازی‌الدین حیدر جو صوبہ اودہ کا آخری نواب وزیر تھا - ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۱۴ع کو اس عہدہ پر سرفراز ہوا - اس کے عہد کا خاص واقعہ یہ ہے کہ لارڈ هیسٹنگز مارچ سنہ ۱۸۱۸ع میں لکھنؤ تشریف لائے اور اس کو یہ ترغیب دی کہ تم سلطنت دهلی سے اپنا قطع تعلق کرکے خود مختار ہو جاؤ اور بحیثیت بادشاہ اودہ سکہ جاری کرو - بالآخر سنہ ۱۸۱۹ع میں خطاب بادشاہ اودہ عطا ہوا اور اس وقت سے دهلی کی حکومت سے کوئی سروکار نہ رہا -

غازی‌الدین حیدر کی تاجپوشی بہت ہی جوش و خروش سے عمارت موسومہ لال بارہ دری میں جس میں کہ اس وقت لکھنؤ کا عجائب خانہ ہے ہوئی - تاجپوشی کے دن تیس ہزار روپیہ کے جواهرات لٹائے گئے اور چاندی کے تمغے و خلعت اراکین و امرا و روساء کو تقسیم ہوے - تمغہ کا وزن ۱۲۶۰ گرین ہے اور قطر ڈھائی انچ ہے - یہ تمغہ (پلیٹ ۱ - نمبر ۲) اعلیٰ درجہ کی کاریگری اور دستکاری کا نمونہ ہے - اس کے پہلے طرف ایک دائرے میں تاج و ہار سے مزین بادشاہ کی شبیہ ہے اور بقیہ جگہ میں پھول و بیل بنی ہے - حاشیہ پر گولائی میں ذیل کا کتبہ جس کا آغاز بادشاہ کے بائیں ہاتھ کے نیچے سے ہے موجود ہے :—

سکه زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن
غازی‌الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن سنه احد

دوسرے طرف مارکه هے - اسمیں دو شیر هاتھوں میں جھنڈا لئے هیں - ان جھنڈوں پر مچھلی بنی هے - دونوں جھنڈوں کے درمیان ایک کٹار هے - کٹار کے اوپر تاج اور نیچے دو مچھلیاں هیں جنکی گولی سے ایک دائرہ بن جاتا هے - سب سے نیچے ایک لہردار باریک جھنڈا هے - داهنے گوشه پر حرف " ح " هے اور کنارے حاشیه کی گولی میں یه دعائیه شعر هے :—

تا هزار سال شاها بقاے عمر تو بادا
هزار سال باشی تو در زمان خدا

اس تمغه پر حیرت هے که خلاف دستور بادشاہ کی شبیه موجود هے - سوال یه پیدا هوتا هے که دفعتاً عرصه قریب دو سو سال بعد شبیه کا خیال کیسے گزرا - کیونکه مغل بادشاهوں میں صرف آزاد خیال جهانگیر بادشاہ نے اپنی شبیه خلاف شریعت بنوانا پسند فرمایا تها - اس قسم کا سب سے آخری سکه هجری سنه ۱۰۲۳ میں اجمیر سے جاری هوا تها اور اس پر یه شعر هے :—

قضا بر سکهٔ زر کرد تصویر
شبیهٔ حضرت شاہ جهانگیر

جهانگیر کے بعد کسی مغل بادشاہ نے اپنی شبیه کو نہیں بنوایا یه خیال اب تک صحیح تها - مگر حسن اتفاق سے ابهی حال میں ایک تمغه بادشاہ شاہ عالم ثانی کا دستیاب هوا جس پر که شاہ عالم کی شبیه موجود هے - یه تمغه بهی به یادگار پهدائش مسند نشینی - و بحالی سلطنت جاری هوا تها اور اس کے ایک طرف یه کتبه هے :—

ولادت در سنه ۱۱۴۰ جلوس در سنه ۱۱۷۳ بحال شد سلطنت ۱۲-

دوسرے جانب معمولی شعر ہے :—

سکہ زد در ہفت کشور سایۂ فضل اللہ

حامی دین محمد شاہ عالم پادشاہ

پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ غازی الدین حیدر نے جس طرح یہ شعر شروع میں اپنے سکوں پر لکھا غالباً اُسی طرح اپنی تاج پوشی کے یادگار میں بھی تمغہ پر اپنی شبیہہ بنائی -

غازی الدین حیدر نے کئی قسم کے سکے جاری کئے -

طرز (الف) یہ سکہ سنہ ۱۲۳۴ھ میں شاہ عالم کے نام سے جاری کیا (پلیٹ ۲ - نمبر ۱) - اس پر پہلی طرف یہ شعر کندہ ہے :—

سکہ زد در ہفت کشور سایۂ فضل اللہ

حامی دین محمد شاہ عالم بادشاہ

دوسری طرف اودہ کا مارکہ ہے جس میں دو مچھلیوں کے درمیان اس کا سنہ جلوس ۲۶ لکھا ہے اور ضرب " صوبہ اودہ دارالامارہ لکھنؤ " ہے - مچھلیوں کے اوپر کٹار اور تاج ہے اور ان کے دائیں بائیں جھنڈا لئے ہوئے شیر ہیں -

طرز (ب) یہ سکہ بھی سنہ ۱۲۳۴ھ میں اپنے نام سے جاری کیا مگر اس پر سنہ جلوس ۵ اس وجہ سے لکھا ہے کہ وہ اصلیت میں پانچ سال قبل یعنی سنہ ۱۲۲۹ھ میں اپنے والد ماجد کی جگہ پر نواب وزیر مقرر ہو چکا تھا -

طرز (ج) یہ سکہ بھی سنہ ۱۲۳۴ھ میں اپنے ہی نام سے جاری کیا مگر اس میں سنہ جلوس ۵ کے بجائے سنہ احد ہے کیونکہ اس کی

بادشاہت کا یہ پہلا سال تھا اور اسی سال اس کی تاج پوشی بھی باضابطہ ہوئی تھی - ان (پلیٹ ۲ - نمبر ۲) سکوں پر ایک طرف یہ شعر کندہ ہے :-

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن
غازی‌الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

اور دوسری طرف مثل (الف) و (ب) کے وہی عبارت و نشانات ہیں -

طرز (د) سنہ ۱۲۳۶ھ میں لکھنؤ کا لقب ' دارالامارہ ' سے ' دارالسلطنت ' ہو گیا اور ان سکوں پر " ضرب صوبہ اودہ دارالسلطنت لکھنؤ " تحریر ہے - (پلیٹ ۲ - نمبر ۳) -

غازی‌الدین حیدر نے سنہ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی اور نصیرالدین حیدر بادشاہ دویم ہوئے - ان کے عہد کے پہلے دو سال کے سکوں (پلیٹ ۲ - نمبر ۴) پر ان کا نام سلیمان جاہ ہے اور ذیل کا شعر ہے :—

بر ہر سکہ شاہی زدہ ز لطف‌الہ
سپہر مرتبہ شاہ جہاں سلیمان جاہ

تیسرے سال یہ شعر بدلا اور سکوں پر بادشاہ کا نام نصیرالدین حیدر ہوا (پلیٹ ۲ - نمبر ۵) :—

سکہ زد بر سیم و زر از فضل حق ظل‌الہ
نائب مہدی نصیرالدین حیدر بادشاہ

حکومت کے ساتویں سال سکہ کی دوسری طرف خفیف تبدیلی ہوئی (پلیٹ ۲ - نمبر ۹) - نشان و عبارت وہی رہی صرف عبارت بجائے اوپر نیچے اور کنارے کے گولائی میں ایک ہی سطر میں لکھی گئی - اور تاریخ جلوس سکہ کے مرکز سے ہٹا کر اسی سطر میں رکھی گئی -

نصیرالدین حیدر کی وفات پر ان کے چچا محمد علی شاہ تخت شاہی پر سنہ ۱۲۵۳ھ میں جلوہ افروز ہوئے - انہوں نے سونے اور چاندی کے سکوں پر ایک نئے قسم کا مارکہ ایجاد کیا - اس میں بجائے شیر کے دو عورتیں ہیں جو کہ ان کے جلوس کے پہلے اور دوسرے سال میں ننگے سر ہیں اور بعد ازاں نوکیلی چھجے‌دار پگڑی پہنے ہیں- (پلیٹ ۲ - نمبر ۷ و ۸-) اور سکوں پر یہ شعر پایا جاتا ہے :—

بجود و کرم سکہ زد در جہاں

محمد علی بادشاہ زماں

محمد علی شاہ کے اول تین سال کے سکوں کے دوسرے جانب ضرب '' صوبہ اودھ بیت‌السلطنت لکھنؤ '' ہے مگر سنہ ۱۲۵۶ھ سے ' ملک اودھ ' بجائے ' صوبہ اودھ ' کے تحریر ہے -

سنہ ۱۲۵۸ھ میں محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی تخت نشین ہوئے - ان کے عہد کے سکوں (پلیٹ ۲ - نمبر ۹) پر یہ شعر کندہ ہے :—

در جہاں زد سکہ شاہی بتائیدالہ

ظل حق امجد علی شاہ زمن عالم پناہ

اور دوسری طرف یہ مارکہ ہے - یعنی ایک گھومی ہوئی مچھلی کے اوپر تاج اور چھتر ہے اور ان کے دائیں اور بائیں کسی قدر گولائی میں دو تلواریں ہیں اور یہ کتبہ ہے - '' ضرب ملک اودھ بیت‌السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس '' اس کے سکوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی - کچھ خفیف تبدیلی مثلاً تاج کے اوپر نقطہ یا محراب یا لکیریں ملتی ہیں -

سنہ ۱۲۶۳ھ میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوا - اس کے سکہ (پلیٹ ۲ - نمبر ۱۰) کی پہلی طرف یہ شعر ہے :—

سکہ زد برسیم و زر از فضل تائیداِلہ
ظل حق واجد علی سلطان عالم بادشاہ

اور دوسری طرف مارکہ یا نشان شاہی ہے جس پر پھر تبدیلی ہوئی اور بجائے عورتوں کے مچھلی دار پریاں بنائی گئیں اور پورا نشان یہ ہوا :—

دائیں اور بائیں دو مچھلی دار پریاں جن کے ایک ہاتھ میں جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں مکدّر اور درمیان میں تھال ہے - اس کے اوپر تاج اور تاج کے اوپر چھتر اور چھتر کے اوپر طوطا ہے - یہ طوطا صاف نظر نہیں آتا مگر واجد علی شاہ کے فرمان پر جو شاہی مہر ہے اُس میں بالکل صاف ظاہر ہوتا ہے - اور نیچے کی جانب دو تلوار اور دو ترچھے مگدر ہیں - سب سے نیچے لہردار جھنڈا یا لکیر ہے - کتبہ یہ ہے :—
" ضرب ملک اودہ بیت‌السلطنت لکھنؤ سنہ جلوس میمنت مانوس "

سنہ ۱۲۶۷ھ میں واجد علی شاہ نے اپنے سکے کی دوسری طرف بجائے ضرب " ملک اودہ بیت‌السلطنت لکھنؤ " کے " ملک اودہ اختر نگر " رکھا کیونکہ بادشاہ خود شاعر تھا اور اُس کا تخلص اختر تھا - اُس طرز کے سکے بہت ہی کمیاب ہیں غالباً اس وجہ سے کہ اسی سال ضرب کے نام میں پھر تبدیلی واقع ہوئی اور بجائے "ملک اودہ اختر نگر" کے "بیت‌السلطنت لکھنؤ ملک اودہ اختر نگر" ہوا (پلیٹ ۲- نمبر ۱۱ و ۱۲) -

واجد علی شاہ کے سکے بہت نفیس ساخت کے ہیں علاوہ روپیہ کے چاندی کی اٹھنی ' چونی ' دونّی اور اکنی پائی جاتی ہیں - اشرفی نصف اشرفی بھی موجود ہے - ایسے سکے اور دیگر بادشاہوں کے بھی جن کا تذکرہ میں پیشتر کرچکا ہوں دستیاب ہوئے ہیں -

اشرفی کا وزن قریب ۱۶۵—۱۶۴ گرین ہے اور روپیہ کا وزن ۱۷۲—۱۷۰ گرین ہے - پیسہ کا وزن ۲۰۰—۱۸۰ گرین تک ہے - گو واجد علی شاہ نے ایک پیسہ ۴۵۱ گرین وزن کا بھی جاری کیا تھا اس کا ایک نمونہ مسٹر براون کے ذخیرہ میں موجود ہے ' ادھلے بھی محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے دستیاب ہوئے ہیں اور عالیجناب بامفورڈ صاحب کے ذخیرہ میں موجود ہیں مگر یہ بہت کمیاب ہیں - اودھ کے سکوں پر غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سکے مغل بادشاہوں کے سکے کے اندازہ پر بنائے گئے ہیں - طرز و وزن و عبارت ملتی جلتی ہے - ان سکوں پر بادشاہوں کے عظیم‌الشان لقب بھی پائے جاتے ہیں مثلاً غازی‌الدین حیدر نے اپنا لقب شاہ زماں رکھا - امجد علی نے عالم پناہ اور واجد علی نے سلطان عالم رکھا - اور اسی طرح لکھنؤ کو بھی اعزاز دیا اور القاب مثلاً دارالامارۃ ' دارالسلطنت ' بیت‌السلطنت اور اختر نگر عطا فرمایا -

بہر حال لکھنؤ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی عزت افزائی بادشاہ وقت عرصہ سے کرتے آئے ہیں اور موجودہ سرکار کی بہت توجہ خاص اس پر ہے -

ڈاکٹر تارا چند سے دو دو باتیں ٹھیٹ اردو میں

مہاراج - نمسکار - میرے ایک ساتھی نے " ہندستانی " میں آپ کا لکھا ہوا وہ ٹکڑا مجھے دکھایا جس میں آپ نے اپنی اکیڈمی کی جمی ہوئی سبھا کے لکھنے والوں کا گن مانا اور انہیں نئے ڈھنگ سے سراہا ہے - اسے دیکھ کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کیا ایسی لکھت اُردو کہی جا سکتی ہے - میں یہ مانتا ہوں ہند مندر ہے - اُردو اس کی دیوی - ہم آپ سب کے سب اس کے پجاری - آئے دن اردو دیوی پر ہند ماتا کے چھوٹے بڑے سپوت جو چڑھاوے چڑھا رہے ہیں یہ سب چڑھاوے جیسے پہلے ایک سے تھے اب بھی ویسے ہی ہوتے تو کیا اچھا ہوتا - پر ایسا نہیں - ان میں سے اب کچھ ایسے ہو چلے ہیں جو پجاریوں کی بھیڑ بھاڑ میں بھی ان نئے چڑھاووں پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں -

اردو کو پچ میل مٹھائی سمجھئے - کئی مٹھائیوں میں سے ایک مٹھائی چن کے الگ کر لینے سے مٹھاس بڑھے گی کیا گھٹ جائے گی - ایک چنی ہوئی مٹھائی میں اور کئی مٹھائیوں کی مٹھاس نہیں آ سکتی - کسی ہرے بھرے پودے کی جڑ کھود کے کسی سوکھے ہوئے پیڑ کے لئے جگہ نکالنے سے یہ ٹھنٹھ تو بھلا کیا پھلے پھولے گا وہ ہرا بھرا پودا مرجھا جائے گا - جیتی جاگتی بھاشا میں مٹی ہوئی بولی کے ٹھونسنے سے مری ہوئی بولی تو جی اٹھنے سے رہی جیتی جاگتی بھاشا اس کے ملنے سے ادھ موئی ہو جائے گی -

راج ہٹ ، بالک ہٹ ، تریا ہٹ یہی تین ہٹیں آج تک سنی تھیں - آپ نے تین تیرہ بارہ باٹ کو اچھا نہ سمجھ کے ان تینوں ہٹوں

میں ایک کایستھ ھت بڑھا کے ھتوں کی پوری چوکھلتی بنا دی - جس سُبھ گھڑی میں اردو کی نیو ڈالی جا رہی تھی جبھی سے اس کا دھیان رہتا تو آج تت سم شبدوں ' تت بھو شبد سوبھاؤ ' انوکتا ' کالمل ' رکچھا ' سمبندھ ' دشا ' ایسے ھی اور بہت سے بول کے بول مل جل کے بولنے اور لکھنے میں کب کے آ چکے ہوتے - پر - اب کیا ہوتا ھے - اب تو ھاتھی کے دانت باھر نکل چکے - ایک چلتا کیا بھاڑ پھوڑے گا - ایک آدھ کے چاھنے سے برسوں میں سیکڑوں ھاتھوں کی سمیٹی ہوئی پونجی کیسے پھیلکی جا سکتی ھے - جیسے میرے آپ کے چاھنے سے کوئی بولی ورلی نہیں بلتی ایسے ھی اس میں کتر بیونت بھی ایک آدھ کے چاھنے سے نہیں ھوسکتی -

سنسکرت باھر والوں کے جوڑ توڑ سے مٹتی اور ان کے ھاتھوں اس کی یہ گت بنتی تو نہ جانے ان پر کتنی لے دے ہوتی ' انھیں کیا کیا برا بھلا کہا جاتا اور ان کی کیسی کیسی دھجیاں اُڑائی جاتیں - پر - اسے کیا کہئے راج پاٹ کی باگیں اپنے ھاتھ میں رکھنے کی دھن میں اپنے دھرم کی بھاشا پر گھر والوں ھی نے جگہ جگہ پہرے بٹھائے ' باھر والوں سے ملنے جلنے کی پوری پوری روک تھام کی - اسے رات دن گھونٹ گھونٹ کے رکھا اس لئے لے بڑھ کر پھر یہ ڈھنڈھورا پیٹا - جو کوئی " شودر " اس کے کچھ بول بھی سن لے تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے - آئے دن کی اس روک ٹوک سے جو ہونا چاھئے تھا وھی ہوا - اسے گھن لگ گیا - ہوتے ہوتے وہ ادھ موئی ہوئی اور پھر مٹ کے رہ گئی - جب وہ مٹ چکی تو اب آنکھیں کھلیں اور اس کے جلانے کے لئے اب تک سیکڑوں جتن کئے جا چکے اور کئے جا رہے ھیں -

اردو کی نیو ڈالنے والوں میں کوئی ایک آدھ جتھا تو نہ تھا دیس والے سبھی تھے - سب نے مل کے جیسی اس کی نیو ڈالی ویسا ھی

اس کا آشرم بن گیا - اب آپ کیا پورے آشرم کو ڈھا کے پھر اس کی نئی نیو رکھنا چاھتے ھیں - نئی نیو کوئی پودا تو نہیں جو آج لگایا کل پھل لے آیا - برسوں کی دوڑ دھوپ سے اب کہیں جاکے اردو ایسی نکھر چلی ھے جیسے آج ھم آپ ھی نہیں اونچے اونچے گھرانے ٹکٹکی باندھے دیکھ رھے ھیں - اور جب اس کا یہ نکھار ھی نہ رھا تو پھر رھا ھی کیا - نیا کنواں کھود کے پانی پینا ایک دن دو دن کی تو بات نہیں پھر جب تک کیا کھچلی کا - کیا چپ چاپ ھاتھ پر ھاتھ دھرے بیٹھے رھنے کی ٹھانی ھے - اردو اب تک جس سانچے میں ڈھل چکی ھے اسے یوں ھی رھنے دیجئے - اب رھیں اس کی اور بناؤ سنگار کی باتیں تو وہ گھاتیں کچھ کٹھن نہیں اسے بے ٹھیس لگے وہ سب کی سب ھو سکتی ھیں - اردو کا پیارا ' پریم جو چاھے کہئے وہ اب بھی ھے -

پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے والی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجئے - اس میں آپس کے میل جول ' ساتھ رھنے سہنے ' راج کا دباؤ اور ایسے ھی اور اور سہاروں سے پہلے پہل ایک بھاشا کے بول دوسری میں کچھ کچھ آتے ھیں - باھر والی اور یہاں کی بھاشا میں لوچ اور لچک ھوئی ' ملنے جلنے میں کوئی رکاوٹ نہ دکھائی دی اور نئی بھاشا کے بول یہاں کی بات چیت میں پھیلنے لگے تو پھر ان کا تانتا بندھ جاتا ھے اور ان کی کھپت پر کھپت ھوتی چلی جاتی ھے - پر کہیں کی بولی راج واج کا دباؤ وباؤ کچھ مانتی ھی نہیں - جیسے تاتاریوں اور ترکوں کی راجدھانی برسوں ایران رھا پر فارسی نے راج واج کی بھاشا کو منھ بھی نہ لگایا - ھلاکو سے سلطان حسین مرزا تک برسوں راج کے ساتھ ساتھ رھنے پر بھی ترکی بول فارسی میں آگے بڑھ کے جگہ نہ لے سکے - انھیں گنا جائے تو سیکڑے میں بہت سے بہت دس بول نکلیں تو نکلیں - اسی

ایران میں کبھی عربوں کا بھی راج تھا جو بہت نہ رہا پر جب تک بھی رہا کچہریوں کی لکھت پڑھت فارسی ہی میں رہی - اس پر بھی دیکھتے دیکھتے عربی ایسی پھیلی جیسے بن میں آگ لگے - اس کا کر بھی ہے ترکی بھاشا کی بناوٹ فارسی سے میل نہیں کھا سکتی تھی اس لئے ملنے پر بھی یہ دونوں رکی رکی رہیں - عربی کا لوچ اور فارسی کی لچک ان دونوں کے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اس لئے عربی فارسی دونوں کی دونوں آپس میں مل جل گئیں -

کوئی باہر والا کسی کے یہاں آکے ٹھہرے - گھر والوں کی آؤ بھگت آنکھیں بچھانے سے وہ اس گھر میں رہ پڑے - آپس کے میل ملاپ کے بڑھنے سے وہ اور گھر والے مل ملا کے ایک ہوجائیں تو پھر وہ باہر والا نہیں رہتا گھر ہی کا کہلاتا ہے - پر جب اس کھوج لگانے کی دھن ہو یہ کہاں کا تھا ' یہاں کب آیا تو گھڑی بھر کے لئے اس کے باہر والا ہونے کا دھیان آئے تو آئے نہیں تو پھر کبھی نہیں آتا -

عربی ' فارسی کو بھی ایسا ہی سمجھئے - ان دونوں کے بولوں کی اردو میں کیسی ریل پیل ہے جسے دیکھئے بے سوچے سمجھے انہیں بولتا ہے - تو اب یہ کہنا ہی ٹھیک نہیں :— یہ عربی کے بول ہیں اور یہ فارسی کے - عربی ' فارسی اب کہاں رہے - اب تو اردو میں یہ ایسے سماگئے ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے - وہ اور یہ دونوں کے دونوں ایک ہوکے رہ گئے ہیں - جب دونوں ایک ہوگئے تو پھر انہیں عربی ' فارسی آپ کیوں کہتے ہیں - انہیں اردو کے گھر کی پونجی کہئے نا اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے - چاہئے تو یہ تھا ایسے جتن کئے جاتے جن سے پرائے بھی اپنے بن سکتے پر یہاں تو اپنوں کو بھی پرایا بنانے کا ڈول ڈالا جا رہا ہے -

کسی بھاشا کی کہانی میں دھرم کی کتھا کو نہ ملانا چاہئے - آپ کی یہ بات جی کو بھلی لگی - پر اسے کیا کہیں جو دوسری بزلیوں کے وہ بول جو آج گھل مل کے اردو سمجھے جا رہے ہیں انہیں ادبدا کے چھوڑ کر اپنی دھن میں مٹی ہوئی بھاشا کے بول کے بول ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے اپنی لکھت میں آپ لکھتے چلے گئے ہیں - اسے جو دیکھے گا کہہ اٹھے گا - دھرم کا پریم لکھنے والے پر ایسا چھایا ہوا ہے جو وہ بولی ٹھولی کو بھی اس سے الگ نہیں دیکھ سکتا اور بھاشا کا پودا دھرم کے مندر کی چھاؤں میں لگانا چاہتا ہے -

جی چاہتا تھا پنڈت دیا شنکر ' پنڈت نوبت رائے ' پنڈت رتن ناتھ ' پنڈت بشن نرائن ' پنڈت برج نرائن چکبست ان سب پر کچھ نہ کچھ لکھوں پر یہ دھیان آیا آپ کہیں یہ نہ کہہ اٹھیں رات گئی بات گئی ' وہ سماں اب کہاں ' پرانی باتیں چھیڑنا کوئی اچھی بات نہیں - اچھا نہ سہی - انہیں جانے دیجئے اور اِدھر اُدھر کہیں جائے اپنے " ہندستانی " سبھا ہی کو دیکھ لیجئے - اس میں سر تیج بہادر سپرو ' مسٹر سچدانند ' پنڈت گنگا ناتھ جھا ' جو بولی بول رہے ہیں وہ وہی ہے جو آج گھر گھر پھیلی ہوئی ہے سب کے سب پڑھے لکھے اسے ہی بولتے ہیں اور جو بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں - اس ڈگر سے کترا کے نہ جانے آپ کدھر جانا چاہتے ہیں - ایک بات پوچھتا ہوں سچ سچ بتائیے کا اپنے ساتھیوں سے اور گھر میں آپ کی بات چیت کا کیا یہی نرالا ڈھنگ رہتا ہے -

اچھا آپ نے یہ بھی دیکھا جس پگڈنڈی پر آپ چلنا چاہتے تھے اس پر نہ چل سکے اور پاؤں ڈگمگانے لگے - جی بھر کے مٹی ہوئی بھاشا کے بولوں کی آپ نے بھرمار تو کی پر عربی ' فارسی سے نہ بچ سکے - کھلنے تو اس

بھرمار پر بھی عربی ، فارسی کے کتنے بول آپ لکھ گئے - اُردو کو پہلے پرتالئے تو اس میں ملونی کتنی ہے اور لگے ہاتھوں اسے بھی جانچ لیجئے کون کون سے اور کہاں کہاں کے بول بات چیت میں بیدھڑک چلے آتے ہیں جن کا تانتا بندھا ہوا دیکھئے سمجھ لیجئے یہ ہلتے ہوئے دانت نہیں جنھیں جب چاہا ایک جھٹکے میں اُکھیڑ کے پھینک دیا - اپنی اپنی جگہ یہ سب ایسے جمے ہوئے ہیں جن میں سے کسی کا ہلانا ہنسی کھیل نہیں ہے اور یہ ہلائے جانے سے ہل نہیں سکتے -

فرض ، ادبی ، عادت ، وقت ، زندگی ، اُمید ، قوت ، تعلیم ، تعلق ، ہزار ، فائدہ ، ترقی ، مشق ، ذریعہ ، مضمون ، حفاظت ، شور غل ، قاعدہ ، طلوع ہونا ، طرز حکومت ، ایسے ہی اور اور بہت سے بول ہیں جنھیں ان پڑھ سے ان پڑھ بھی بےکھٹکے بولتے چالتے ہیں نہ جانے ان میں آپ نے کیا دیکھا جو ان کی جگہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے یہ بھولے بسرے بول کے بول آپ لکھ گئے -

کرتویہ ، ساھتیہ ، سوبھاؤ ، سمئے ، جیون ، آشا ، شکتی ، شکشا ، سمبندھ ، انیکتا ، ہتوں ، دردھی ، ابھیاس ، دوروا ، وشے ، رکچھا ، نیشچلے ، کلاھل ، ویاکرن ، اودئے ، راج نیتی ، جب آپ نئے نئے بولوں کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہوں تو انھیں بے نکالے چین - کیسے آئے - وہی ہوا کہ ڈھونڈ ڈھانڈ کے نئے نئے کڈھب سے کڈھب بول آپ نے نکال ہی لیے -

دیکھئے عربی ، فارسی کے چھوڑنے کا بیڑہ آپ نے اُٹھانا چاہا نہ اُٹھا سکے - ان کے بولوں کو دودھ کی مکھی بنانا چاہا نہ بنا سکے - جلوری کے " ہندستانی " میں اپنا لکھا ہوا وہ ٹکڑا جس میں اکیڈمی کے لکھنے والوں کو سراہا گیا ہے اسے اُٹھا کے پڑھئے تو ان بولوں کی بھیڑ کی کہاں تک لگی ہوئی ہے - بڑی توڑ دھوپ سے جو نئے بول آپ نکال سکے

ھیں ان سبھوں کو گنئے تو سہی یہ سب کے سب بہت سے بہت ایک سیکڑے کے لگ بھگ نکلیں گے اور عربی ' فارسی جلمیں آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے اس نہ دیکھ سکنے پر بھی ' سو پچاس نہیں عربی اور فارسی کے دو سو اٹھاسی بولوں کا ٹڈی دل آپ کی بوئی ہوئی نئی کھیتی پر چھایا ہوا ھے -

بنی بنائی بھاشا کو مٹانے اور مٹی مٹائی بولی کو جلانے کے جتن کرنا کس لئے - اس نے کیا دکھ دیا اور اس سے کیا سکھ ملا - وہ کیوں بری اور یہ کس لئے اچھی - لاکھ لاکھ سوچا پر یہ بھید نہ کھل سکا - آپ کہیں گے یہ دھرم کی بھاشا ھے اور اس کا بچاؤ سب کیا کرتے ھیں تو سننے والا جھٹ سے بول اٹھے گا - کیا اپنی کہی ہوئی باتیں آپ بھول جاتے ھیں - سوچئے - آپ کو تو دھرم اور بھاشا کا کہال میل اچھا نہیں لگتا - دیکھئے آپ ھی تو یہ لکھ چکے ھیں :—

" زبان کے متعلق بہت سی بہکی باتیں ہو رہی ھیں کچھ نے تو وچار کر لیا ھے کہ زبان کے ساتھ مذھب ایسا بندھا ہوا ھے کہ اگر زبان پر کوئی وار ہوا جس سے اس میں کمزوری آئی تو مذھب بھی چل بسے گا - یہ بڑی بھول ھے " -

مہاراج سنئے - بن مانس بھلا مانس جو بھی ہو وہ کسی نہ کسی جتھے کے ساتھ رہتا سہتا چلا آیا ھے اور سب سے الگ تھلگ ہو کے اکیلا نہیں رہ سکتا - بولیوں کا بھی یہی ڈھنگ ھے جو بھاشا بھی ہو وہ دو گھڑی بھی نری کوری نہیں رہ سکتی اور کچھ رھی بھی تو اپنے یہاں کے گنتی کے کچھ پھسپھسے بولوں کے سہارے سے بھلا وہ کیا پنپے گی اور کیا آگے بڑھ سکے گی - یہ ہو نہیں سکتا جو کوئی آگے بڑھنے والی بھاشا اوروں کو ٹھکرا کے برا بھلا جو بھی ہو اپنے ھی یہاں کا کاٹھ کباڑ برتے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے -

انگریزی آج کل کے راج کی بولی ہے - پھر کیا یہ ملواں نہیں - اسے آپ کیا ایسی اچھوتی بھاشا کہہ سکتے ہیں جس میں اور کسی کی ملونی نہ ہو - یوں تو یہ ایک ہی دکھائی دیتی ہے پر سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھئے پر اس کا بھرم کھلتا ہے - نہ جانے کہاں کہاں کے بول اس میں آ آ کے اکھٹے ہوگئے ہیں اور نہ جانے کتنی بولیوں کے دودھ نے پال پوس کے اسے اتنا بڑا کیا ہے - نہ مانیں تو آپ لکھ کے دیکھ لیجئے نری انگریزی دو بولوں سے آگے آپ لکھ نہیں سکتے -

جل تھل بھرنے والے بادلوں ' چڑھی ہوئی ندیوں ' پھبکتے ہوئے پودوں ' مہکتے ہوئے پھولوں کا سا روپ رکھنے والی بھاشا جبھی بن سکتی ہے جب اس کے پاس اپنے یہاں سے بڑھ کر اوروں کے یہاں کی بھی پونجی ہو - یہ بات مانی ہوئی ہے تو عربی ' فارسی کے بولوں پر ناک بھوں چڑھا کے جان بوجھ کر انہیں چھوڑنا اور ان کی جگہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے بھولے بسرے بولوں کی بھرمار کرنا کیوں اور کس لئے - عربی ' فارسی نے کیا بگاڑا ہے - ان سے یہ بیر کیسا - کسی بھاشا کا دھرم کی کسوٹی پر کسنا تو آپ کو بھی اچھا نہیں لگتا اور جب اچھا نہیں لگتا تو پھر دونوں کو گڈمڈ کیوں کیا جا رہا ہے - آپ کے کہنے اور کرنے میں اتنا بل کیوں ہے کیا آپ یہ بتا سکیں گے-

کہنے کو تو یہ باتیں کہدیں پر رہ رہ کے یہی دھیان آتا ہے کہیں ان باتوں سے اور کچھ اور نہ سمجھ لیں اس لئے جتانا پڑا - میں یہ نہیں کہتا عربی ' فارسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیجئے اور ہے اس کے ٹکڑا نہ توڑئیے - میرا کہنا یہی ہے - عربی ' فارسی اُردو میں جتنی سما چکی ہے اسے ہاتھ نہ لگائیے اور یونہی رہنے دیجئے - وہ بے پڑھے لکھے جو یہ بھی نہیں جانتے بھاشا کسے کہتے ہیں اور اس کے بول کیسے ہوتے ہیں - اپنے اپنے

گھروں اور سالھیوں کے جھگڑوں میں بیٹھے انھیں دن رات بیدھڑک بولتے چالتے ھیں - انھیں بھی چھوڑئیے - گاؤں والے جلتھیں آئے دن بولے چوتلے کے کٹھن دھندے سے گھڑی بھر بھی چھٹکارا نہیں ملتا - بھلا وہ بھاشا واشا کیا جانیں پر ان کی بول چال ' بات چیت کو سنئے تو عربی ' فارسی کے بگڑے ہوئے سیکڑوں بول سنائی دیں گے جو وہ اٹھتے بیٹھتے بے جھجک بولتے ھیں -

کھس (خوش) کھسی (خوشی) گم (غم) وکھت (وقت) پھکر (فکر) کھدا (خدا) کھبر (خبر) ماپھک (موافق) ارج (عرض) ارجی (عرضی) ھجور (حضور) گریب (غریب) موتاج (محتاج) گلام (غلام) پگام (پیغام) ھجرت (حضرت) پھرمان (فرمان) نماج (نماز) روجہ (روزہ) پھکیر (فقیر) سریپھ (شریف) اجت (عزت) کہاں تک لکھوں اور بہت سے ایسے بول ھیں جو ان کی بول چال سے الگ نہیں ھوسکتے اس سے یہ بھید کھل گیا عربی ' فارسی اُردو میں ایسی سما گئی ہے کہ ان‌پڑھ گاؤں اور گنواروں تک کی بول چال میں ان کے بولوں کا تانتا لگا رھتا ہے - جب یہ اور ایسے ایسے اور بول اپنی اپنی جگہہ جمے ھوئے ھیں تو ان کو اُکھیڑ پھینکنے کے جتن کرنا آپ ہی کہئے کہاں تک ٹھیک کہے جا سکتے ھیں -

عربی ' فارسی تو عربی ' فارسی اُردو کے دھارے میں اور جتنے چھوٹے بڑے دھارے آ آ کے ملے ھیں انھیں بھی یونہی چھوڑنا پڑے گا - اس ندی کا پاٹ انھیں سب دھاروں سے مل کے اتنا چوڑا دکھائی دے رھا ہے اور دھاروں کے کاٹ کر الگ کردینے سے بہتا ہوا پانی پھر بہے گا کیا ٹھہر جائے گا اور جب ٹھہر گیا تو اس میں بہتے ہوئے پانی کی سی بات کہاں آسکتی ہے - آپنے دیکھا ہوگا جب بہتے ہوئے پانی کا دھارا کاٹ کے ادھر اُدھر کر دیا اور وہ بہتے بہتے رکا تو پھر ٹھہرے ہوئے پانی میں بساند آجاتی ہے -

دیکھئے پورے دیس کی وہی اکیلی بھاشا سمجھی جا سکتی ہے جسے بے سوچے سمجھے سب کے سب تھوڑی بہت بولتے اور سمجھتے ہیں - اپنے دیس کے بیچوں بیچ کھڑے ہوکے پکارے تو یہی بولی سنائی دے گی جو آج گھر گھر پھیلی ہوئی ہے - یوں دیکھئے تو ہند کے چپے چپے کی بولی کچھ نہ کچھ الگ ہوتی اور ایسی چھوٹی موٹی تو بہت سی نکلیں گی جیسے لمباڑوں ' گونڈوں ' بھیلوں ' ماڑواڑیوں کی بولیاں - پر یہ کچھ بڑی نہیں - تلنگی ' کنڑی ' تامل اوڑیا ' کنکن ' سنہالی یہ چھے دراوڑی بولیاں سنسکرت سے بھی پہلے کی ہیں اور جن کی بانچھوں میں سنسکرت کا دودھ بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ بنگلہ ' مرہٹی ' پنجابی ' سندھی ' کشمیری ' گجراتی ' پشتو یہی سات ہیں - ان سب میں سے ایک بولی بھی ایسی نہیں جسے یہاں کے رہنے سہنے والے سب کے سب سمجھ سکیں - دیس کے جن جن ٹکڑوں میں وہ بولی جاتی ہیں وہیں ان کے بولنے اور سمجھنے والے بھی ہیں - ان سے باہر کسی کے سامنے ان بولیوں میں سے کوئی سی بولی بولئے تو سننے والا منہ تکنے لگے گا -

اُردو ہی ان سب میں ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے نہ آپ کی بنائی ہوئی یہ انوکھی بولی :— ابھیاس ' نیشچے ' انبھو ' سنسکھا اودئے ' کرتویہ ' کسی سے اس میں بات چیت کرکے دیکھئے تو وہ کہتا کیا ہے - کہے گا کیا - آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے آپ کا منہ دیکھے گا اور ایک بول بھی نہ سمجھ سکے گا -

اُردو تو اُردو گجراتی ' مرہٹی تک میں عربی ' فارسی بولوں کی وہ ریل پیل ہے جو آپ گنا چاہیں تو ان کے بولوں کو گنتے گنتے تھک جائیں گے - اس نئی اپج کو کیا کہا جائے جو بھاشا سارے دیس میں

پھیل چکی ہو - چھوٹے بڑے سب کے سب اسے بولتے ہوں ' جگہہ جگہہ اس کے بولنے اور سمجھنے والے مل سکتے ہوں - اسے چھوڑ کر آدرش ' ویاکرن ' سبھیتی ' ہتوں وشے ' آدھار ' ایسے ایسے کڈھب بولوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کے ان سے ایک نئی بولی بنانے اور اس کے پرچار کرنے پر آپ اڑے ہوئے ہیں -

کیا اس نئے ڈھنگ کے پرچار میں کھیڑیں اُٹھانے سے آگے بڑھ کے آپ یہ کہنا چاہتے ہیں :—ہم الگ ' ہماری بولی الگ ' ہم بہت ' اور ہمارے ساتھ رہنے والے بہت تھوڑے - اس لئے راج ہمارا ہے اور یہ ہمیں ہی ملنا چاہئے تو ایسی بات منھہ سے نکالنے سے پہلے پھر سوچ سمجھہ لیجئے - پہلے تو یوں مانگنے والے سے یہ نہیں ملا کرتا - راج کوئی بھیک تو نہیں ہے جو کچھہ بھکاریوں کے للیانے گڑگڑانے پر ترس کھا کے ان کی جھولیوں میں ڈالدیا جائے - راج لینے کے لئے بڑی بڑی کٹھن باتیں کرنا ہیں - ان سب میں سے پہلی بات کا پہلا گر یہ ہے :—آئے دن گھر والوں میں ملاپ کے پیلنگ بڑھیں ' دکھہ ' سکھہ میں ایک دوسرے کا ہاتھہ بٹائے - جو ایک کہے سب اسی کی سی کہیں - ایک کے پھانس لگے تو سب ادھر ہی جھک پڑیں - کسی کے دکھہ کو دوسرا اپنا ہی دکھہ سمجھے - ساتھہ رہنے سہنے والوں کے دھرم کتنے ہی الگ الگ کیوں نہ ہوں ان کے لئے آپس میں کوئی جھگڑا تلتا نہ اُٹھنے پائے دھرم ہے کیا - اسے سوچ کی آنکھوں سے دیکھنا چاہئے - دھرم والے سب کے سب ایک ہی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں - سب ایک ہی کے منگتا اور ایک ہی چوکھٹ کے بھکاری ہیں - اپنے اپنے سے جتن کرکے اُسی ایک کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور اُسی سے سب کی لو لگی ہوئی ہے - خدا ' پرمیشر ' پرماتما ' بھگوان یہ سب بول اُسی ایک کے لئے بولے جاتے ہیں - جس کے نہ

مٹنے والے راج کے اُجالے سے چھوٹے بڑے ان گنت سنسار جگمگا رہے ہیں - دھرموں کا الگ الگ ہونا اس کے ڈھونڈنے کے الگ الگ رستے ہیں - ڈھونڈنے کا ڈھب الگ الگ سہی دیکھنے کی یہ بات ہے جب سب کے سب ایک ہی کے پریم کی مالا جپ رہے ہیں اور اُسی کو سب پوج رہے ہیں تو اس پوجنے کے الگ الگ ڈھب پر آنکھیں نکالنا ' ناک بھوں چڑھانا اس سنسار میں ڈھائی دن کا ساتھ ہوجانے پر لڑنا جھگڑنا کیسا یہ چاہئے ایک دوسرے دھرم کی کتھاؤں اور تہواروں میں بے روک ٹوک آنے جانے اُٹھے بیٹھے - آپس میں بھائیوں بھائیوں کا سا برتاؤ - جی میں جو ہو وہی منھ پر ہو - کبھی آپس میں ان بن ہو بھی جائے تو گھر کا جھگڑا گھر ہی میں چکا لیا جائے - گھر میں کیا ہوا باہر والے ٹوہ لگانے پر بھی نہ جان سکیں -

کل کی بات ہے لارڈ اروِن نے گاندھی جی کو بہلا پھسلا کے لندن بھیجا - مہاتما جی وہاں پہنچے - اپنے دیس والوں سے جو کچھ کہہ چکے تھے نہ جانے وہاں پہنچکر کیا بجوگ پڑا جو اسے پورا نہ کرسکے - بات آگے بڑھی اور گھر کا جھگڑا چکانے کے لئے باہر والے بلائے گئے جو جھگڑا گھر ہی میں نہ چک سکا وہ باہر والوں سے بھلا کیا چکتا - آپس کی تو تو ' میں میں پر اپنے پرائے سب کے سب ہنس پڑے دونوں کے ہنسنے میں بل یہی تھا - اپنوں کی ہنسی تو کھسیانے پن کی تھی اور دوسروں کی ایسی جیسے برسات کی پھسلن میں کسی کا پاؤں پھسلے اور پھسلتے ہی اس کے دھم سے گرنے کے دھماکے پر دیکھنے والے کھل کھلا کے ہنس پڑیں -

جب گھر کا گھر سارا روٹھن بن گیا ہو - آپس میں پھوٹ پڑی ہو - جو بات ایک کہے ادبدا کے دوسرا اسے جھٹلائے - ایک کو ایک کھائے جاتا

ہو - چھوٹی سی چھوٹی بات میں اُلجھکر بات کا بتنگڑ بنانے کی دھن ہو - بات بات میں ناک بھوں چڑھائی جاتی ہو - آئے دن آپس میں چھری کٹاری اور جلی کٹی رہتی ہو - کسی کو چین سے بیٹھنے کا دھیان تک نہ ہو - مار دھاڑ چیخ پکار سے جی بہلتا ہو - گھر ہی میں لڑ جھگڑ کے اپنا گھملا توڑا جارہا ہو - جس گھر میں ایسا اودھم مچا ہوا ہو تو پھرگھر والوں کا پنپنا ، آگے بڑھنا اور راج چلانا کیسا - اس کی تو وہی ہانی ہے - جیسے کوئی دوھری تہری بیڑیاں ہتھکڑیاں پہنے پر بھی یہی سمجھتا رہے یہ کوئی روک‌ٹوک نہیں - جب جی چاہے میں اِدھر اُدھر آجا سکتا ہوں -

جھاڑو کی سینکیں آپ کو توڑنے کے لئے دیدی جائیں تو ایک ایک دو دو کر کے چٹکی بجاتے میں توڑ توڑ کے آپ سب کا ڈھیر لگا دیں گے اور جو انہیں کا ایک بڑا گٹھا توڑنے کے لئے سامنے ڈال دیا جائے تو پھر آپ کتنا ہی اسے توڑنا چاہیں وہ گٹھا ٹس سے مس بھی نہ ہو سکے گا گھاس پھوس ایک جگہ ہونے سے نہ ٹوٹ سکے اور بھلے مانسوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں جتھے کے جتھے الگ الگ ہونے سے آئے دن ٹوٹتے رہیں - دیکھئے ہمارے آپ کے جتھے گھاس پھوس سے بھی کیسے بودے نکلے وہ ہلائے سے بھی نہیں ہلتا اور یہ دن رات ٹوٹتے چلے جارہے ہیں - اس آپا دھاپی میں یہ سمجھ کسے جو یہ بات سوچ سکے - اب تک ہمارا الگ تھلگ رہنا ہی نیچا دکھاتا - اور ہمیں توڑ مروڑ کے روندتا رہا - ہم سب کے سب ایک ہی جگہ کے رہنے سہنے والے گھاس پھوس کے گٹھے کا سا ایکا کیوں نہ کرلیں - جو ہمیں کوئی نہ توڑ سکے کسی نے یہ سچ کہا ہے جب برے دن آتے ہیں تو مت الٹی ہو جاتی ہے -

یہیں تک لکھنے پایا تھا جو کانوں میں کچھ اور بھنک پڑی اور ساتھ ہی وہ سب کچھ سنا اور لکھا ہوا دیکھا جو " بھارتیہ ساھتیہ پریشد "

میں ہو چکا - مولوی عبدالحق صاحب (آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو) نے ساہتیہ پریشد کی کھلم کھلا بات چیت میں گاندھی جی سے جو کہنا چاہا ہوں ہاں کر کے گاندھی جی نے اُسے ٹال دیا اور مولوی صاحب کھل کر اس پر کچھ نہ کہہ سکے ' ایسے ہی پروفیسر محمد مجیب صاحب (جامعہ ملیہ) نے مہاتما جی کو جو کچھ لکھ بھیجا تھا اس کا پورا سن لینا بھی گاندھی جی کو دوبھر ہو گیا - یہاں کی بھاشا کے لئے " ہندی ہندوستانی " کے یہ نئے بول گاندھی جی نے جو چھانٹ چھونٹ کے نکالے تھے ان پر پوچھا گچھی جب آگے بڑھنے لگی تو مہاتما جی ست پٹائے اور کوئی بات بن نہ آئی تو اپنے اُن پنڈتوں کو دیکھنے لگے جو پہلے ہی سے یہ جھگڑا چکانے کے لئے اِدھر اُدھر بٹھائے گئے تھے - پہلے سے سکھا پڑھا دیا گیا تھا ' کہی بدی ہو چکی تھی - مہاتما جی کے پوچھتے ہی سبھوں نے اسی کی حامی بھری جو وہ چاہتے تھے - یہ ملی بھگت دیکھ کے کتنا کتنا لوگ کہتے رہے ان سب کی حامی بھرنا ٹھیک نہیں - کسی بھاشا کی گتھیاں سلجھانا ہنسی کھیل نہیں ہے - اس کے لئے گلے چلے ہوئے انہیں لوگوں سے بات چیت کی جائے جو ایسے ہتھکنڈے جانتے ہوں - پر گاندھی جی نے اپنی بات کے آگے کسی کی کچھ نہ چلنے دی اور وہی کیا جو وہ کہہ چکے تھے - اسی ساہتیہ پریشد " میں گاندھی جی کے منہ سے ایسی باتیں بھی نکل گئیں جنہیں سن کے کچھ تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور کچھ ہکا بکا ہو کے مہاتما جی کے اس کہنے پہ اُن کا منہ تکنے لگے -

" اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے - قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا - مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں " -

یہ سب باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں اس لئے پھر کبھی ان باتوں پر جی بھر کے لکھوں گا اور مہاتما جی سے کچھ کہہ سکوں گا -

گاندھی جی نے دیس کے لئے سب کچھ تج دیا اور جبھی جی مہاتما کہلائے - پر اسے کیا کہیں جب مہاتما ہوکر بھی دیس والوں میں سے سب کے سب کو وہ ایک آنکھ سے نہ دیکھ سکیں تو اوروں سے پھر کیا کہا جا سکتا ہے -

سچ ہے جب کوئی کسی اونچی جگہ تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے ' دوڑ دھوپ کرتا ہے ' دن رات کا سکھ اس کے لئے کھو بیٹھتا ہے اور دکھ پہ دکھ سہتا چلا جاتا ہے - اس پہ بھی بیچ میں کوئی ایسی بھاری روک آجائے جو لاکھ جتن کرنے پہ بھی وہ روک اُس جگہ تک نہ پہنچنے دے تو پھر بات بات میں اس کا چڑ چڑا پن سوچ بچار کے دکھ سے چھڑا کے اسے ہٹ کرنا سکھا دیتا ہے - چاہے کیسی ہی ہو وہ اپنی بات پر اڑا رہے اور دوسرا کیسی ہی اچھی سے اچھی بات کیوں نہ کہے اپنی بات کی پیچ اُسے نہ سننے دے اور سنے بھی تو سنی کو اَن سنی بنادے -

کہیں ایسا ہی تو نہیں مہاتما جی اب تک جتنی چالیں چلے سب میں انہیں ہار کا بھیانک منھ دیکھنا پڑا (سوراج مانگا نہ مل سکا - چھوت چھات کے بندھنوں کو توڑنا چاہا نہ توڑ سکے ' اچھوتوں کے لئے مندر کھلوانے چاہے نہ کھل سکے - یہ تو جو ہونا تھا وہ ہوا - منجھے ہوئے کھلاڑی ہار جیت سے بھی بڑھ کے چالوں کو دیکھا کرتے ہیں - مہاتما جی کی اب تک کی سب چالیں تھیں تو پکے کھلاڑیوں کی سی - آپس میں پھوٹ نہ پڑی ہوتی اور ایکا ہو جاتا تو پھر پوبارہ تھے - مہاتما جی یہ جانتے ہیں کہ ان کی اب تک ہار یہ ہار آپس ہی کی پھوٹ سے ہوئی اور

ہو رہی ہے ' اس لئے اب سوچ بچار کے بکھیڑے سے الگ تھلگ ہوکے " بھارتیہ ساہتیہ پریشد " کے پرچار کی دھن میں وہ کھوئے ہوئے ہیں - کوئی کتنا ہی گلا پھاڑ پھاڑ کے انہیں پکارے وہ کسی کی کچھ سنتے ہی نہیں اور یہ ایک اور پھوٹ کا بیج کب بویا جا رہا ہے جب دیس کو میل ملاپ کی دیوی کی پوجا کرنے کے ساتھ ساتھ جو گتھیاں پہلے سے بھی بڑھ کے الجھتی چلی جا رہی ہیں انہیں سلجھانا چاہئے -

لنکا میں سے جو نکلا وہ باون ہاتھ کا یہ کہاوت نہیں ٹھیک اُترتی ہے- جسے دیکھو وہ اونچی تو بڑا پڑا پھرتا ہے پر جو بھرپور وار کیا جاتا ہے وہ اپنے ہی اوپر - جو بات نکلتی ہے وہ اپنے ہی دکھ کی - اونچ نیچ نہ دیکھنے سے ٹھوکروں پہ ٹھوکریں کھانے پہ بھی آنکھ نہیں کھلتی ہے پلے کی بنکار پھونے والوں کی اچھل کود سے بھی کہیں بڑھی ہوئی ہے - اپنے ہاتھ سے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے لئے آئے دن نت نئی چالیں سوچنے میں ہلدی کی چلدی نکالی جارہی ہے -

ایسی لبڑ دھوں دھوں دیکھ کے یہی کہا جا سکتا ہے اب تک دیس والے جیسے کانٹوں بھری جھاڑیوں میں مارے مارے پھرتے اور اُنجھ اُلجھ کے جگہ جگہ گرتے رہے - نہ جانے آپس کی پھوٹ ابھی انہیں کیسے کیسے سنسان ' ڈراونے بنوں ' اور جنگلوں میں لئے لئے پڑی پھرے گی - دیس والوں کے دکھ بھرے برے دن کٹ چکے ہوتے تو سکھ کے اچھے دن آنے کے لئے یہ رت جا کے دوسری رت کب کی آ چکی ہوتی اور سب سے پہلے آپس کی لاگ ڈانٹ ' آپا دھاپی ' ہٹ دھرمی کا بیج ایسا مارا جاتا جو ڈھونڈھے سے بھی کہیں نہ ملتا - یہ پنواڑا کہاں تک کھنچے اور یہ دکھڑا کب تک روئے - جو نہ ہونا چاہئے تھا وہی اب تک ہوا اور جو ہونا چاہئے تھا وہ کچھ بھی نہ ہوا - یہی دن رات رہے تو آگے اس سے

بھی بڑا کے ہوتا دکھائی دیتا ہے - اسے کیا کہیں دیس کا بھاگ ٹھیک نہیں - نہیں تو ایسا کبھی نہ ہوتا -

میرے لکھنے کا یہ ڈھنگ نہیں جو آپ نے دیکھا - آپ کی انوکھی لکھت دیکھ کے دھیان آیا ٹھیٹ اردو ہی میں آپ سے بات چیت کروں اور ہوسکے تو عربی ' فارسی ' کو ہاتھ نہ لگاؤں اور دکھاؤں کلاهل ' سمپتی ' ابھماس ' نیشچے ' جیسے بھولے بسرے کڈھب بولوں کو چھوڑ کے ٹھیٹ اردو یوں لکھی جا سکتی ہے - اس میں عربی ' فارسی کے بول جن سے آپ کو چڑ ہے اتنے بھی نہیں جتنا نون آٹے میں - عربی ' فارسی کے نہ چھونے سے دیکھئے ساری لکھت کیسی روکھی پھیکی ہو کے رہ گئی جس تھوڑی سی جگہ میں دب دبا کے اور سمٹ سمٹا کے بھی بیٹھنا دوبھر ہو وہاں پھیل کے بیٹھنے کی جگہ کہاں - گنتی کے کچھ بولوں کی اُلٹ پلٹ اور ہیر پھیر سے جو ہو سکتا تھا وہ کیا -

کوئی اَن پڑھ ' سمجھ کا ہیٹا ہی ایسا ہوگا جو ہندی کی گھلاوٹ اور مٹھاس کو نہ مانے - پر نری مٹھاس ہی مٹھاس کھائی بھی تو نہیں جاسکتی - اس کا جوڑ چٹپٹا پن ہے چٹپٹے پن کے ساتھ مٹھاس ہو تو کیا کہنا - سونے پہ سہاگا ہے - جیسے ہندی کی مٹھاس مانی ہوئی ہے ایسے ہی عربی ' فارسی کا چٹپٹا پن بھی - یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو پھر کیا پوچھنا - اسي لکھت میں کہیں کہیں بھی عربی ' فارسی کا جوڑ لگا دیا جاتا تو ان پھولوں کی مہک اور ان کا روپ دیکھنے کا ہوتا - پر یہ بھی سمجھ لیجئے یہ ڈھب ایسا نہیں ہے جو سب جگہ نبھ سکے -

سرکس کا گھوڑا تھوڑی سی جگہ میں لوٹ کے ' بیٹھ کے ' کھڑے ہوکے نت نئے کرتب دکھاتا ہے پر جب کوئی بھاری بوجھ لاد کے کسي لمبی چوڑي سڑک پہ اسے ڈالا جائے تو وہ گھڑي گھڑي اَڑتا اور رُکتا ہے - مارنے '

پھیلنے ' چمکانے کسی ڈھب سے بھی وہ نہیں سدھرتا اور گھڑی بھر بھی اس سڑک پہ نہیں چل سکتا - اس لکھت کا بھی یہی ڈھنگ ہے یوں تو کانا پھوسی اور کچھ کھلی ڈلی باتیں یہ بتلا سکتی ہے - پر جب کٹھن باتیں چھڑ جائیں اور ان کا کھرا پن جوں کا توں دکھانا ہو تو پھر یہ اپاہج بن جاتی ہے اور اپاہج بھی ایسی جیسے ان تلوں تیل ہی نہیں تھا کبھی اس کے اپاہج ہوجانے سے عربی ' فارسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اور یہ دونوں مل ملا کے کیسی ہی الجھی ہوئی گتھیاں کیوں نہ ہوں گھڑی بھر میں انہیں پورا سلجھا دیتی ہیں اور پھر کوئی الجھاؤ ہی نہیں رہتا کٹھن سے کٹھن بھید کھل کھل کے ایسے دکھائی دینے لگتے ہیں جیسے ہاتھوں کی لکیریں -

یہ پلوارہ کئی مہینے اُدھر کا لکھا ہوا ہے بات یہ ہوئی اسے لکھ ہی رہا تھا جو باہر جانا پڑا - وہاں سے آکے کچھ دنوں تک ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں الجھا رہا - جب ان سے چھٹکارا ملا تو اس کا دھیان آیا - دھیان آتے ہی جگہ جگہ ڈھونڈا پر یہ ایسا تلپٹ ہوا جو کہیں بھی نہ ملا - کئی دن ہوئے جو یہ ایکا ایکی ہاتھ آگیا جسے آپ کے پاس بھیجتا ہوں -

---

مندرجۂ بالا مضمون سید ابوالقاسم صاحب نے "ہندستانی" میں بغرض اشاعت روانہ فرمایا تھا - اسکے مخاطب اصلی ڈاکٹر تاراچند صاحب ہیں ہم ڈاکٹر صاحب کا جواب حاصل کرکے ساتھہ کے ساتھہ شایع کئے دیتے ہیں ' جس سے غالباً مضمون کی اہمیت و دلچسپی میں کافی اضافہ ہوجائیگا—" مدیر"

مولوی سید ابوالقاسم نے جو چٹھی چھاپے کے لئے بھیجی ہے اس سے کیا مطلب ہے میں ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکا - ایک جگہہ تو آپ لکھتے ہیں کہ جیسی بولی میں چاہتا ہوں اب نہیں بن سکتی - اُردو بن سنور کر تیار ہو چکی اب اس میں مری ہوئی بولی کے بول ٹھونسنے

سے اسے ادھ موا بتلانا ہے - اس فقرہ میں دو باتیں دھیان دینے کے قابل ہیں - مری ہوئی بولی کے بول سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ کیا ہندی بھاشا مری ہوئی بولی ہے اور کیا اس کے شبدوں کے سمونے سے اردو ادھ موئی ہو جائے گی ؟ انیکتا ' کوتوہل ' رکشا ' سمبندھ اور دشا' ایسے جن لفظوں کا میں نے استعمال کیا ہے انہیں کون مرا ہوا کہہ سکتا ہے ؟ ہماری طرف تو آپ کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیں ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ چاہے ہندو ہو یا مسلمان انہیں سمجھ لے گا - تو ایسے شبد جنہیں سبھی سمجھ سکتے ہیں اردو میں ملنے سے اردو کے کلیور کو پساریںگے یا گھٹائیںگے - اس کے سمجھنے والوں کے پھیلنے سے اس کا جیون بڑھیگا یا کم ہو جائیگا ؟

ایک دوسری جگہ آپ دیس کی پھوٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " یہ پلواڑا کہاں تک کھنچے اور یہ دکھڑا کب تک روئیے - جو نہ ہونا چاہئے تھا وہی اب تک ہوا اور جو ہونا چاہئے تھا وہ کچھ بھی نہ ہوا - یہی دن رات رہے تو آگے اس سے بھی بڑھ کر دکھائی دیتا ہے " - میرا بھی یہی نویدن ہے - اور میری لکھت کا یہی مطلب ہے - جو ہو چکا سو ہو چکا - اب تو ہم ان جھگڑوں کو دور کریں تا کہ ہماری آنے والی نسلیں دکھ سے بچیں سکھ سے رہیں اور جئیں - پر آپ نے یہ نہ بتایا کہ بھاشا کے معاملے میں ہم کس ریت سے چلیں جو یہ جھگڑے دور ہو جائیں - ہو سکتا ہے کہ میں نے جس راستے کے بتلانے کی کوشش کی ہے بھول ہو - پر مجھے تو دوسرا راستہ نہیں دکھائی دیتا - میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ فارسی عربی کے وہ بول جو اب ہماری بولی میں گھل مل گئے ہیں نکال ڈالے جائیں - انہیں رکھئے اور ضرور رکھئے - مگر نئے بچاروں کے لئے نئے لفظ نہ لیجئے - میں تو کہتا ہوں کہ سنسکرت کے بھی تت سم

شبدوں سے پرہیز کرنا چاہیے - آج کل ہندی لکھنے والے سنسکرت کی ڈکشنری سامنے رکھہ کر مضمون اور کتابیں لکھتے ہیں - جہاں کوئی نیا بچار آیا اس ڈکشنری سے اس کا سنسکرت الٹھا ڈھونڈھا اور اپنی لکھت میں جڑ دیا - اسی طرح اردو لکھنے والے فارسی اور عربی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں - نتیجہ یہ ہے کہ دو بولیاں ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتی جا رہی ہیں ایسا کیوں ہو - ذرا دیکھئے اردو اور ہندی میں لفظوں کا کتنا بھاری خزانہ ہے - دکن کے شاعروں سے شروع کیجئے اور آج تک جو کچھہ اردو میں لکھا گیا اس کا پورا لیجئے - متروکات کے تنگ دائرے کو توڑ ڈالیے - اسی طرح ہندی کے ساہتیہ کی جانچ کیجئے - اگر ان دونوں سے ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ مل جائے تو کسی اور زبان کا منہ کیوں تکیں - یہ دونوں تو ہماری ہی بولیاں ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھہ لین دین کرنے سے کسی کو کیوں کھٹکا ہو -

یہ ٹھیک ہے کہ سمے کے بدلنے سے نئی ضرورتیں جنم لیتی ہیں نئے خیال پیدا ہوتے ہیں - ان کے لئے نئے شبد ڈھونڈھنے پڑتے ہیں یا گھڑنے پڑتے ہیں - ولایت کی زبانوں میں تو یہ قاعدہ ہے کہ جہاں تک بن پڑتا ہے پرانے بولوں کو ملا جلا کر یا کانٹ چھانٹ کر نئے لفظ بنا لیتے ہیں - اس طرح کام نہیں نکلتا تو یوروپ کی پرانی مری ہوئی بھاشاوں لاطینی اور یونانی سے مدد لے لیتے ہیں - کبھی کبھی جیتی بھاشاوں کے بول جوں کے توں یا کچھہ ہیر پھیر سے زبان میں مل جاتے ہیں - لیکن جو بول کسی بھی بھاشا سے لئے جاتے ہیں ان پر اصلی بھاشا کا ہی قانون لگتا ہے - ان کی شکلیں اصلی بھاشا کی ویاکرن کے قاعدوں کے مطابق بدلتی ہیں - یہ تو سب مانینگے کہ جس کا قانون ہوتا ہے اس ہی کا ملک کے رہنے والوں پر راج ہوتا ہے - اسی طرح زبان کا حال ہے -

لفظ تو رعایا کے سمان ہیں ویاکرن قانون ہے - ہماری زبانوں کا ویاکرن سب لفظوں پر ایک طور پر حاوی ہونا چاہیے - لفظ کہیں سے آئیں ان کی ویاکرنی (صرفی) صورتیں ہمارے ویاکرن کے اصولوں کے مطابق بدلنی چاہیں -

ہندی اور اردو کا ویاکرن بہت کچھ ایک ہے - جو کچھ تھوڑا سا آپس میں بھید ہے وہ آسانی سے دور ہو سکتا ہے اگر دونو کے لکھنے والے چاہیں تو - انتر صرف دو باتوں میں ہے - ایک تو پنگل یعنی عروض میں - یہاں بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندی کے کوی سنسکرت کے چھند چھوڑتے جاتے ہیں - اردو کے شاعر بھی نئی نئی بحروں کا استعمال کر رہے ہیں - دونو ایک دوسرے کے پاس آ رہے ہیں -

دوسرا انتر ہے لفظوں کے چلنے کا - اردو دل عربی کی طرف جھکا ہوا ہے - یہ عربی کے بولوں سے اپنی بھاشا کو چٹ پٹا بناتا ہے - اپنی بھاشا کو کہیں روکھا پھیکا سمجھ کر کہیں اپاہج جان کر عربی کا آسرا لیتا ہے - یہی نہیں اپنے قانوں کو بھی عربی کے ماتحت کر دینا چاہتا ہے - بھاشا میں بھی سوراج پسند نہیں کرتا - غرض ہندستانی ٹانگھن کو عربی گھوڑا بنانے کی انوکھی فکر میں مگن رہتا ہے - ہندی دل اس کے خلاف بھاشا میں سے چن چن کر ان سب شبدوں کو نکالنا چاہتا ہے جو ہمارے دیس میں لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوے ہیں - وہ بھی اپنی جیتی جاگتی بولی کو ایک مری ہوئی زبان کے بندھنوں میں جکڑنا چاہتا ہے - اپنے بولوں کو کڈھبے اور گنوارو بتا کر سنسکرت کے بولوں سے بدلنا چاہتا ہے -

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی سیدابوالقاسم کیا چاہتے ہیں - وہ کس بھاشا کو دیس بھاشا بنانا چاہتے ہیں - آپ لکھتے ہیں " اردو ہی ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سب

جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے نہ آپ کی یہ نرالی اور انوکھی بولی "۔
اردو کی جگہ ہندی کا شبد رکھہ دیجئے تو ہندی والوں کا بھی یہی کہنا
ہے - جس طرح مولوی صاحب ہندی کے لفظوں کو سن کر کان میں انگلی
ڈالتے ہیں اسی طرح پنڈت جی اردو کے چت پٹے شبد سن کر آپ کا
منہ تکتے ہیں - مولوی صاحب کو ہندی کے لفظ کڈھبے جان پڑتے ہیں
اور پنڈت جی کو عربی کے - وجہ یہ ہے مولوی صاحب بات کرتے ہیں تو
ان کے سننے والے وہی ہیں جو عربی فارسی کے عالم ہیں - پنڈت جی کیول
سنسکرت کے گیانیوں کی طرف جھکے ہوئے ہیں - میں یہ چاہتا ہوں کہ
مولوی صاحب اور پنڈت جی کبھی کبھی آپس میں بھی بات چیت کریں-
ایک دوسرے کے من کی سنیں اور سناویں - جب وہ مل کر بیٹھیں گے تو
ان کے کان میٹھے اور چت پٹے دونو طرح کے شبدوں سے آشنا ہونگے -
دونو کا رس آنے لگیگا تو انجانے لفظوں کو چھوڑ دینگے اور جانے پہچانے لفظوں
کو کڈھبا نہ کہینگے - اس آپس کی بول چال کی جو بولی ہے اس کا
آپ کیا نام رکھینگے - میں تو اسے اردو ہندی یا ہندستانی کسی بھی نام سے
پکار نے کو تیار ہوں - یہی وہ بولی ہے جس کا چوکھا رنگ مولوی
سید ابوالقاسم نے اپنی چٹھی میں دکھایا ہے -

اردو اور ہندی کے مشہور فسانہ نگار اور ہماری اکیڈیمی کے معزز ممبر منشی پریم چند کی موت ہمارے ادب کے لئے ایک صدمۂ جانکاہ ہے، ہم دلی تاسف کے ساتھ ان کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں -

(مدیر)